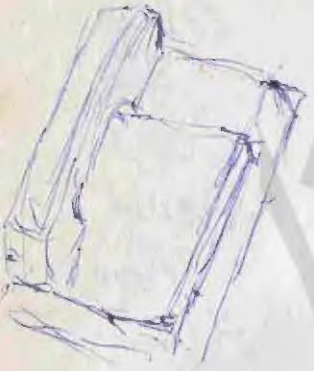


ممتاز مفتی شاہکار افسانے

۹۹۵۱

ترتیب
محمد منشی یاد
امجد طفیل



فہرس

فہرس

9	ممتاز مفتی کی یادیں
19	جھکی جھکی آنکھیں
34	بیگانی
43	آپا
54	نفرت
64	نبی
79	چپ
92	پل

328

آدھے چہرے

342

سبزیتا

354

ممتاز کی افسانہ نگاری (امجد طفیل)

103

دور اہا

117

میاں کی مرضی

129

الصدق

139

راں ٹیاں

167

گھور اندھیرا

179

دودھیا سویرا

196

سندر تاکارا کش

208

پاجوؤں کی ڈھونڈھ

214

کھل بندھنا

226

روغنی پتلے

240

ایلمنٹیز

250

وقار محل کاسایہ

264

سے کابندھن

274

چکٹ گاڑی ہو نکلتا موٹر اور موم بتی

282

یعنی اور عفریت

292

دو مونی

304

کہانی کی تلاش

310

دیکھن دیکھن

318

چوہا

324

بھول سے

ممتاز مفتی کی یادیں

ممتاز مفتی صاحب کی یادوں اور باتوں کا سلسلہ نہایت طویل ہے۔ اور میرا سرمایہ حیات۔ میں انہیں ایک بہت بڑا اویس مانتا، ان کی تکریم کرتا اور ان کی ذات سے محبت کرتا اور وہ بھی مجھے بہت عزیز جانتے بلکہ اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ بعض اوقات علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں اور گھروالوں نے کہیں آنے جانے پر پابندی لگا رکھی ہوتی مگر وہ مجھے ٹیلی فون پر کہہ دیتے کہ تم فلاں وقت آجانا میں تیار رہوں گا چپکے سے نکل چلیں گے۔ بعض اوقات طبیعت زیادہ خراب ہوتی درد ہو رہا ہوتا، جسمانی رطوبات کے اخراج کی نکیلیاں اور تھیلیاں لگی ہوتیں مگر وہ تھیلیاں ہاتھ میں لٹکائے میرے ساتھ کسی ادبی اجلاس میں شرکت کرنے چل پڑتے۔ مگر محفل میں کسی کو اپنی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیتے۔ اپنی دلچسپ باتوں کی پھلجھریاں چھوڑتے اور داو وصول کرتے رہتے۔ تنقیدی محفلوں میں اچھی بری ہر قسم کی شاعری پر خوب داد دیتے مگر افسانوں پر نپنی تلی اور معقول رائے دیتے۔ نقاد حضرات پر فخرے بازی، تعارفی تقریبات میں عموماً اپنا مضمون اس جملے سے شروع کرتے۔ ”صاحبو۔۔۔ میں نقاد نہیں ہوں۔ الحمد للہ کہ نہیں ہوں۔“ تنقید اور تحقیق کو عملی کام ضرور سمجھتے مگر تخلیق کے مقابلے میں کم تر درجہ دیتے اور بڑے بڑے نامور دانشوروں اور نقادوں کو کوئی تخلیقی کام کرنے کا مشورہ دیتے رہتے۔ خواتین اہل قلم سے ان کی چھیڑ چھاؤ دیکھ کر ان کی بزرگی اور بڑھاپے پر رشک آتا اور معانقوں سے رقابت محسوس ہونے لگتی۔ مجھے ان کی مابعد الطبیعیاتی باتوں، اعتقادات اور روحانیت سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ مجھے قائل کرنے کے لیے خوب بحثیں کرتے۔ ایک بار انہوں نے مجھے جن بھوت دکھانے کا وعدہ بھی کیا مگر پھر ٹال گئے۔ میں نے اصرار کیا تو کہا کہ یہ بڑا تکلیف دہ راستہ ہے اور میں تجھے تکلیف اور مصیبت میں ڈالتا نہیں چاہتا۔

ممتاز مفتی نے بھرپور زندگی گزاری اور علالت کے باوجود آخری دم تک ذہنی طور پر بیدار اور تخلیقی اعتبار سے سرگرم اور توانا رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ذہنی اور تخلیقی توانائی کا ایک سبب ان کی زندگی گزارنے کا سادہ انداز تھا۔ ہر طرح کے حالات میں خوش طبعی اختیار کیے رکھتے۔ دوستوں، مداحوں اور ملنے والوں سے محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے۔ ملنے والوں کو اکثر چائے پانی کا نہیں

پڑھتے تھے۔ ملاقاتوں کی اتنی تعداد ہوتی کہ یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ ہر ایک کی تواضع کی جائے۔ پانی مانگو تو صرف پانی ہی ملتا لیکن اگر کبھی گھر والے از خود چائے بھجوا دیتے تو خوش ہوتے۔ البتہ ہومیو پیتھی کی دوائیں خود تجویز کرتے۔ بنا کر مفت دیتے بعض احباب کو خود گھر جا کر دے آتے۔

ایک روز مجھ سے جدید افسانے پر بحث کر رہے تھے۔ وہ مجھے جدید ماننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے۔ کہتے تھے ہمارے افسانے تو میری سمجھ میں بھی آجاتے ہیں پھر تم کہاں کے جدید بیٹے ہو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کوئی بھی شخص خواہ وہ کتنا ہی پیوست زدہ اور روایت پسند ہو، پرانا اور قدامت پسند کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ مگر وہ میری ایک بات نہ سنتے۔ میں اپنے اور جدیدیت کے حق میں دلائل دیتا اور زیادہ زچ کرتا تو کہتے: ”اچھا جانا اپنا سر کھا۔“

ایک روز کہنے لگے۔ مجھے آٹھ دس جدید افسانے جن کر دو میں پڑھ کر دیکھوں۔ میں نے ان کی خواہش پوری کر دی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اطلاع دی کہ جدید افسانے پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا ہوں اور میں نے بھی ایک جدید افسانہ لکھا ہے۔ اسے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھوانے کا انتظام کرو اور سارے جدید افسانہ نگاروں اور ناقدوں کو بلاؤ تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ میرا یہ تجربہ کیسا ہے۔ میں نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ اور انہوں نے حلقہ کی ایک پر جھوم محفل میں اپنا پہلا اور آخری جدید افسانہ پڑھ کر سنایا۔ حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔ اہل نقد و نظر نے علام و رموز کی مختلف پرتیں دریافت کیں۔ اور ایسی ایسی انوکھی توجیہات اور مطالب بیان کیے کہ ممتاز مفتی کی باپچیں کھل گئیں۔ مگر جب اہل حلقہ ان کے فنی ارتقا اور نئے اسلوب افسانہ نگاری کی تعریف کر چکے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بتایا کہ مفتی صاحب جدید افسانے سے ہاتھ کر گئے ہیں اور یہ افسانہ جس کی آپ اس قدر تعریف و توصیف کر رہے ہیں، آٹھ دس افسانوں کے مختلف ٹکڑے جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ مگر اس سلیقے اور طریقے سے کہ معلوم پڑے یہ ایک ہی شخص کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔

آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دور دور کی کوڑی لانے اور انوکھے انوکھے علامتی مقامات و مطالب دریافت کرنے والے نقادوں اور ایک ہی طرح کی ڈکشن میں ایک ہی جیسے افسانے لکھتے چلے جانے والے جدید افسانہ نگاروں کا کیا حال ہوا ہو گا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا اور سینئر افسانہ نگار اس قسم کا عملی مذاق کرے گا۔ مگر ایسی ہی شوخیاں خوش لمبیاں انہیں اندر سے جوان اور تازہ رکھتی تھیں اور ہم جیسے لوگوں کو بھی حوصلہ دیتی تھیں۔

ممتاز مفتی اردو فکشن کا ایک عمدہ تھے۔ ان کا عظیم اور ضخیم ناول ”علی پور کا ایلی“ 1961ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول سینکڑوں افسانوں کے مواد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ”الکھ گمری“ میں ان گنت افسانوں کا مواد موجود ہے۔ یعنی اگر وہ یہ ناول یا آپ بیتیاں نہ لکھتے اور اس سارے مواد کو افسانوں کی

صورت میں پیش کرتے تو ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوتی۔ اب ان کے آٹھ افسانوی مجموعے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

- 1- ان کی (1943ء) 17 افسانے
- 2- گماگمی (1944ء) 15 افسانے
- 3- چپ (1947ء) 15 افسانے
- 4- اسرار میں (1952ء) 17 افسانے
- 5- گزرا گھر (1965ء) 14 افسانے
- 6- روغنی پتلے (1984ء) 18 افسانے
- 7- سے کا بندھن (1987ء) 19 افسانے
- 8- کئی نہ جائے (1992ء) 20 افسانے

اس طرح ان کے 135 افسانے کتابی صورت میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جن میں پہلے سات مجموعے ”مختلانے“ کے نام سے شائع ہوئے والے ان کے کلیات میں شامل ہیں۔

ممتاز مفتی اردو افسانے کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کے فن میں سب سے مختلف اور منفرد روش اختیار کی۔ بقول ان کے انسانی شخصیت کی گہمن گھیریوں کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ نہایت دلچسپ، نازک اور وسیع میدان تھا اور ممتاز مفتی خوب کھل کر کھیلتے اور کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی پھیلتا اور زمانے اور ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے نازک تر ہوتا گیا۔ سیدھے سادے آپا سجادہ کی طرح کے کرداروں کی جگہ دو موہنے بلکہ کئی کئی موضوعوں اور چہروں والے کرداروں نے لے لی۔ وہ خود بھی قبے سے نکل کر بڑے اور جدید شہروں میں آئے۔ افسانے کے فن میں کئی طرح کی تبدیلیاں، تحریکیں اور رجحانات در آئے مگر ان کا فن کہیں رکایا جلد نہیں ہوا۔ وقت کے ساتھ ان کے فن میں ارتقاء کا عمل برابر جاری رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر عہد کی نوجوان نسل سے نہ صرف ذاتی رابطہ اور تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کی تحریریں پڑھتے اور پسند کر رہے تھے ہر قسم کے اسلوب اور طرز اظہار سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ محفل پسند، طنز اور کثیر الاہلی تھے۔ نئے پرانے لکھنے والوں اور والیوں کی بھڑک رہتی تھی۔ کسی کی کتاب کا فلیپ یا دیباچہ لکھ رہے ہیں کسی کو کم لکھنے پر ڈانٹ رہے ہیں کوئی ان کا انٹرویو کرنے آیا ہے کسی کو خاکہ لکھنے کی خاطر بٹھا کر سوال جواب کر رہے ہیں کوئی اپنی یا کتاب کی تعریف سن کر پھولے نہیں سنا کسی کو کوئی فضول تحریر یا کتاب رکھنے پر پیار بھری گالیوں سے نواز رہے ہیں۔

خواتین کی وہ بہت اچھی اور ہم راز سبیلی ثابت ہوئے نہ صرف دکھ سکھ پاٹنے اور مشورے دیتے بلکہ ہر طرح کی مدد بھی کرتے کئی ایک لڑکیوں کی شادیوں کا اہتمام اور انتظام کیا کئی گھر اجڑنے سے بچائے۔ ان کی زندگی کی اپنی اتنی کہانیاں ہیں کہ انہیں بیان کرنے کے لیے دفتر چاہیے۔

عام طور سے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں قالین پو بیٹھ کر لکھتے۔ اگلے پر لکھتے، پچھلے پر میل ملاقاتیں کرتے۔ چھاپہ خانوں اور کمپیوٹر کے ردی کیے ہوئے بڑے بڑے صفحات کی پشت پر موٹے موٹے حروف میں لکھتے۔ نوے سال کے لگ بھگ عمر میں بھی نظر کا چشمہ نہیں لگاتے تھے اور اسے کسی بزرگ کے سرے کی کرامت اور برکت بتاتے اور ایک لمبی کہانی سناتے۔ پڑھنے کے لیے عبارت ہوئے لفظوں میں لکھتے اور مناسب روشنی کی ضرورت محسوس کرتے۔ کانڈ کے حاشیوں پر بھی تیروں کے نشانات دے کر بہت کچھ لکھا ہوتا۔ اور خوش خط لکھتے اور نہایت بلند آواز میں لفظوں پر زور دے دے کر پڑھتے اور ایک ایک جملے پر داو وصول کرتے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ آخری عمر میں بھی گھر کا خرچہ پورا کرنے کے لیے انہیں ریڈیو کے سکرپٹس اور بعض رسائل کے لیے مضامین وغیرہ لکھنا پڑتے تھے۔ کیونکہ پنشن اور کتابوں کی رائلٹی ناکافی تھی۔

گھر کے اندر دو گھر تھے۔ ایک ان کے بیٹے، بہو اور لوگوں کا اور دوسرا ان کا اپنا جس میں ان کی بیوی، ملازمہ اور شادی سے پہلے کی بیٹیاں شامل تھیں۔ وہ اپنے گھر کا خرچ خود اٹھاتے تھے۔ مکان ان کے نام تھا اور اس کا کرایہ بیٹے کے دفتر کی طرف سے ان کو ملتا تھا مگر سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے قلم کی مزدوری کرنا ضروری تھا۔

مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے کسی اجلاس میں ہوئی وہ مزے لے لے کر اپنا کوئی طویل افسانہ سنا رہے تھے اور شعروں کی طرح جملوں پر داو و تحسین وصول کر رہے تھے۔ پھر جب میں نے اسلام آباد میں حلقہ ارباب ذوق قائم کیا تو ان سے رابطہ اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ نہ صرف خود حلقے میں افسانے پڑھتے بلکہ قدرت اللہ شہاب صاحب بھی اپنے مضامین پڑھنے کے لیے ان کے ہمراہ حلقہ میں آتے گئے۔ لیکن ان سے ایک تفصیلی ملاقات 1975ء میں ان کے گھر پر ہوئی جب میں مظہر الاسلام کے ساتھ پہلی بار ان کے گھر گیا۔ وہ احمد بشیر کے ساتھ لان میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ بڑی محبت سے ملے اور ملتے رہنے کی تاکید کی۔ اور بالاخر ان سے دوستی اور محبت کا رشتہ گہرا ہوا گیا۔ اس وقت تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے چھپ چکے تھے مگر 1965ء کے بعد کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ بے شمار چھپے ہوئے افسانے اوپر اوپر پڑے تھے۔ میں نے ان سے کئی بار اصرار کے ساتھ تقاضا کیا کہ وہ اپنے افسانوں کا مجموعہ مرتب کریں۔ مگر وہ

ان دنوں لبیک کی مقبولیت کے ایسے نشے میں تھے کہ افسانوں کے مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ ڈاک سے انہیں ہر روز عام قارئین کی طرف سے لبیک کی پسندیدگی کے بہت سے خطوط ملتے رہتے تھے۔ بہر حال میں ان سے ایک مجموعہ ”روغنی پتے“ مرتب کرانے اور چھپوانے میں کامیاب ہو گیا۔ کتاب کے کنٹریکٹ کے بارے میں خاصے فکر مند رہتے۔ انہوں نے کنٹریکٹ بنا کر دستخط کر کے مجھے دے دیا اور سارا کام مجھ پر چھوڑ دیا۔ ان دنوں میری کتابیں زاہد ملک کے مکتبہ حرمت سے شائع ہو رہی تھیں۔ میں نے یہ کتاب بھی ان کو دے دی اور ایک روز چھپی ہوئی کتاب کا پیکٹ لے کر حاضر ہوا۔ یہ 1984ء کی بات ہے کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ایک جلد اپنے لیے مانگی مگر انہوں نے کہا۔ ”ابھی نہیں۔ میں ذرا دیکھ پڑھ لوں۔“ مگر جب میں گھر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ میں تمہارے ہاں آ رہا ہوں۔ میں سمجھا کہ کتاب کی چھپائی میں کوئی بڑی کوتاہی ہو گئی ہے تھوڑی دیر بعد وہ سکوتر پر میرے گھر آ گئے۔ پتہ چلا کہ مجھے کتاب دینے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جب تھوڑی دیر پہلے میں نے خود مانگی تھی تب کیوں نہ دی۔ کہنے لگے یار یہ بھی کوئی طریقہ ہوتا کتاب دینے کا۔

”روغنی پتے“ کی اشاعت سے انہیں تحریک ہوئی۔ اور انہوں نے افسانوں کے مزید مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ دینا شروع کر دی اور ادبی حلقوں اور ادبی ایڈیشنوں میں ان کی افسانہ نگاری پر رکی ہوئی بات دوبارہ چل نکلی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کو ادبی طور پر بیدار، فعال اور زندہ رکھنے میں روزنامہ جنگ راولپنڈی کے ادبی ایڈیشن اور مظہر الاسلام کا بھی بہت حصہ ہے۔ ان کی بعض کتابیں شائع کرانے میں کرٹل ڈاکٹر ابدال بٹالانے بہت مدد دی۔

پھر پروین عارف بھی اسلام آباد آ گئیں اور مفتی صاحب کے ساتھ ہماری خوب محفلیں بننے لگیں۔ اس دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے سالانہ انکیشن تھے۔ اکبر حمیدی بلا مقابلہ سیکرٹری ہونے والے تھے کہ ادب اور ادبی انجمنوں کا کاروبار کرنے والے ہمارے دوست غففر مہدی نے ایک چال چلی اور انکیشن افسر اور بیک اعوان کو اعتماد میں لے کر اخترالمان کو بھی سیکرٹری کے عہدہ کے لیے کھڑا کر دیا۔ کانڈز نامزدگی کی تاریخ گزر چکی تھی مگر انکیشن افسر نے اس میں از خود توسیع کر دی اور اخترالمان کے کانڈز شامل کر لیے گئے۔ ہم لوگوں نے احتجاج کیا کہ یہ ضوابط کی خلاف ورزی ہے مگر اس کی مختلف تالیس کر کے اکبر حمیدی اور اخترالمان کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لاکھڑا کر دیا گیا۔ بد ساخت مقابلہ ہوا۔ ممتاز مفتی اور پروین عارف نے کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ وہ اکبر حمیدی کو ووٹ دیں گے۔ اخترالمان کے پولنگ ایجنٹ بھی غففر مہدی تھے۔ جب ممتاز

کبھی کبھی میں انہیں چھیڑتا کہ آپ خواتین کے بارے میں برازم گوشہ رکھتے ہیں۔ کہتے کہ عورت خدا کا عظیم تحفہ ہے عورتوں کے پسینے کی خوشبو کا بھی کچھ ذکر کیا کرتے اور جس عمر میں وہ اب تھے وہاں کم سنی ہی عورت کا سب سے بڑا حسن تھی۔ اور پچاس ساٹھ سال کی عورتیں بھی انہیں لڑکیاں معلوم ہوتی تھیں اور وہ انہیں کڑی کہہ کر خوش کرتے۔

ایک بار ایک معروف افسانہ نگار نے میری معرفت انہیں اپنی کتاب بھجوائی۔ دوسرے تیسرے روز ٹیلی فون آیا کہنے لگے۔ یار یہ خاتون کیا لکھتی ہے۔ بڑے واہیات افسانے ہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہے۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آئی کتاب۔ بڑی خشک اور بور تحریر ہے۔

چند روز بعد ایک تقریب کے آخر میں جب چائے پی جا رہی تھی میں نے اس خاتون کا مفتی صاحب سے تعارف کرایا۔ خاتون نے عقیدت اور احترام کا اظہار کیا۔ میں انہیں باتیں کرتے چھوڑ کر ادھر ادھر چلا گیا۔ جب میں دوبارہ مفتی صاحب کے پاس آیا تو وہ اس خاتون افسانہ نگار سے کہہ رہے تھے۔ ”بڑی باکمال افسانہ نگار ہو۔ ایسی اچھوتی اور خوبصورت باتیں تمہیں سوچتی کیسے ہیں؟ کیا انداز بیاں ہے۔ واہ واہ۔“ خاتون جھینپ رہی تھی اور انکساری کا اظہار کر رہی تھی اور مفتی صاحب تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ میں نے کان میں کہا۔ اس روز تو آپ کچھ اور فرما رہے تھے۔ بتا دوں۔ بولے۔ ”تو کیوں نہ کر۔ جا کر چاٹ، سمو سے کھا میرا سر نہ کھا۔“

بعد میں مجھے کہا۔ ”مجھے پتہ نہیں ہے عورتوں سے کیسے پیش آنا چاہیے تو پینڈو اور گوار ہے۔ پتہ نہیں اتنے اچھے افسانے کیسے لکھ لیتا ہے۔“

دوسری بہت سی خواتین کی طرح میری بیوی سے بھی بے تکلفی تھی۔ وہ اس کے کھانے کی تعریفیں کرتے اور میرے خلاف اسے بھڑکاتے رہتے وہ ہنسی رہتی۔ چڑ جاتے۔ کہتے۔ ”تو بہت سیدھی ہے۔ اس کا اعتبار نہ کیا کر۔ اسے باندھ کے رکھا کر۔“ وہ جب بھی سرسوں کا ساگ اور گڑ کے ٹٹھے چاول پکاتی، مفتی صاحب کے لیے ضرور بھیجتی انہیں یہ بہت پسند تھے۔ شروع میں جب پروین شاکر ان کے حلقہ ارادت میں شامل نہیں تھی اس سے ناخوش تھے۔ اس کے خلاف اشفاق ورک کا ایک مضمون انہیں ملا جو انہوں نے ”علامت“ میں چھپنے کے لیے بھجوا دیا۔ مگر مجھے اشاعت سے پہلے پتہ چل گیا اور میں نے مضمون کی اشاعت رکوا دی اور مفتی صاحب سے معذرت کر لی۔ وہ سخت ناراض ہوئے مگر پھر پروین شاکر مرحومہ آہستہ آہستہ ان کے ہاں آنے جانے لگیں۔ اور انہوں نے ان کا ایک بہت عمدہ خاکہ بھی لکھا۔

نیلو فر اقبال بھی ان کی بہت مداح تھیں اور قریب ہی رہتی تھیں۔ انہوں نے مفتی صاحب کی سالگرہوں کے موقعوں پر بہت پر تکلف دعوتیں اور جلے کیے اور بڑے بڑے یکے بولائے اور خوب

محفلیں سجاں۔ مفتی صاحب کی آخری سالگرہ کی تقریب میں بھی رابطہ کے زیر اہتمام نیلو فر اقبال شبانہ حبیب اور نکلت سلیم کے تعاون اور اہتمام سے منعقد ہوئی تھی جس کے دوسرے تیسرے روز ان کا انتقال ہو گیا۔ بلقیس محمود بھی ان کی بہت مداح تھیں اور وہ بھی انہیں بے حد عزیز جانتے تھے۔

گھر یلو کاموں، ضرورتوں اور ادبی مسائل میں مجھ سے مشورہ کرتے۔ گھر کا گزربند ہوتا، پانی کی سپلائی کم ہوتی یا تعمیر و مرمت میں مشورہ درکار ہوتا تو مجھے فون کرتے۔ کسی کو کتاب بھیجنا ہوتی، یا کسی تقریب میں شامل ہونا ہوتا تو مجھے یاد کرتے۔ یہاں تک کہ ایک بار ان کی پالتو ہرنی کو ”گرمی“ ہو گئی۔ کہنے لگے۔ ”سنا ہے تمہارے حکمہ کے شعبہ جنگلات کے پاس ہرن ہیں۔ تم اس کا انتظام کرو۔“ میں نے کہا۔ ”جی میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔“ کہنے لگے۔ ”اس کا برا حال ہے۔ وہ مرجائے گی۔ اور اس کا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔“ میں نے متعلقہ محکمے سے بات کی اور ”چولا“ بن کر سارے معاملات طے کروا دیے۔ پتہ نہیں ملاقات ہوئی یا نہیں مگر ایک دن پتہ چلا کہ ہرنی مر گئی ہے۔

سردیوں میں گھر کے ملحقہ لان میں دھوپ میں بیٹھتے تھے اور جب تک دھوپ رہتی، بیٹھے رہتے۔ کبھی تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا کام کرتے۔ ورنہ صرف بیٹھے رہتے یا کوئی ملاقاتی آجاتا تو گپ شپ کر لیتے۔ بیمار ہوتے تب بھی پتہ نہ چلنے دیتے کہ تکلیف میں ہیں۔

بھارت سے ایک معروف نقاد، شاعر اور ایڈیٹر اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ ممتاز مفتی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ میں نے بتایا کہ وہ بیمار ہیں۔ مگر انہیں اگلے روز واپس جانا تھا۔ میں مجبوراً انہیں ساتھ لے کر مفتی صاحب کے گھر گیا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں نے مفتی صاحب کو ملاقات کے لیے تیار کیا۔ سردیوں کے دن تھے اور وہ سانس کے عارضے میں مبتلا تھے۔ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے اور دیر تک مہمان سے باتیں کرتے رہے اور اس طریقے سے پیش آئے جیسے مدت سے جانتے ہوں۔ اگلے روز ٹیلی فون پر مجھ سے پوچھنے لگے کہ یار رات کو جو صاحب تمہارے ساتھ آئے تھے کون تھے۔

ایک بار ہسپتال میں داخل تھے میں مزاج پر سی کے لیے گیا اور کچھ دیر ان کے پاس رہنا چاہتا تھا مگر انہوں نے کہا۔ ”اچھا اب تو جا۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

مجھے یہ روکھا پھیکا جواب برا لگا۔ دوسرے روز ڈاکٹر زاہدی مزاج پر سی کے لیے گئے۔ انہیں یہی کہا۔ ”اچھا ڈاکٹر۔ اب تو جا۔ میں ٹھیک ہوں۔“

پھر انور زاہدی نے مجھے بتایا کہ دراصل مفتی صاحب بہت تکلیف میں تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ دوستوں اور تیار داروں کی موجودگی میں ان کے منہ سے آہ بکراہ یا چیخ نکل جائے۔

عکسی مفتی بتاتے ہیں کہ وہ آخری وقت تک ذہنی طور پر ہوشیار رہے۔ نرس سے چہلیں کر

رہے تھے کہ تو اتنی خوبصورت ہو کر یہ نوکری کر رہی ہے۔ تجھے تو کسی فلم کی ہیروئین ہونا چاہیے تھا۔ وغیرہ۔ وہ بعد میں بہت روئی کہ ابھی چند منٹ پہلے تو بلبلی ہنس بول رہے تھے۔ اتنی جلدی کیسے چلے گئے۔

وہ ایک عرصہ سے سانس اور پیشاب کی تکلیف میں مبتلا تھے کئی آپریشن ہو چکے تھے۔ مگر وہ ذہنی طور پر موت کو گلے لگانے کو تیار رہتے۔ کہتے میں تو مرنا نہیں چاہتا مگر یہ اعضاء جواب دے گئے ہیں۔ اب خدا سے مہلت مانگ رکھی تھی۔ وہ بھی مکمل ہو گئی ہے۔ اب میں اسٹیشن پر تیار کھڑا ہوں۔ میری گاڑی کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ انتقال کے وقت ہنس بول رہے تھے کہ اچانک عکسی مفتی سے کہا۔ ”عکسی میں جا رہا ہوں۔“ اور چلے گئے۔ اللہ وانا الہ راجعون۔

یہ کتب ”ممتاز مفتی کے منتخب افسانے“ ایک طرح کا خراج تحسین ہے۔ اسے امجد طفیل اور میں نے مرتب کیا ہے۔ مفتی صاحب کے فن پر امجد طفیل نے روشنی ڈالی ہے۔ میرے پاس تو ان کی محبتوں کی یادیں ہی یادیں ہیں یا پھر ایک آنسو ہے جو ان کے چلے جانے پر آنکھ میں اڑا تھا یہ آنسو چپکنا ہے نہ خشک ہوتا ہے پلکوں پر اٹکا ہوا ہے اور نجانے کب تک اٹکا رہے۔

منشایاؤ

9۔ جولائی 1997ء

اسلام آباد

جھکی جھکی آنکھیں

عذران عورتوں میں سے ہے جن سے وصال میں بھی تکمیل حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ جو دلخراش حقائق سے دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے مگر عذران میں یہ خصوصیات نمایاں ہے۔

عذران کو بار بار دیکھ کر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ، حساس ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران مونی مونی آنکھیں اور گرد از جسم۔ اس کی حیران خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوت تکلم کا بیشتر حصہ سب کر چکی ہیں، نہ جانے کون سی دنیا میں رہتی ہیں۔ بہر صورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ اس کا خوند اور ساس رہتے ہیں، رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کمر کا وہ ہلکا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے، بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہی خم اس کی جاذبیت کا راز ہے۔ جب کبھی عذران کچھ بن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف احساس پیدا ہو گا کہ بے شک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے۔ لیکن اگر وہ آنکھیں اٹھ کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کرو گے۔ اس وقت تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عذران مجھ سے کوسوں دور ہے۔ یقین نہیں پڑتا کہ وہ زندگی کی حقیقت ہے یا محض خواب۔ اس وقت چراغ مدہم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گھوم جاتی ہے۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے۔ جب وہ بیس سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر ان دنوں اس کے انداز میں یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں اس کی نگاہ میں جھپٹنے ہی سے تھیں۔ شاید اس لیے کہ بچپن سے ہی وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی مگر شادی کے بعد اس کی نگاہیں اور بھی حیران ہو گئیں اور اب وہ ترنم سے بھگ چکی ہیں۔ اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اس کی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانپنے رکھتی ہیں۔

ان دنوں جب سکول سے لوٹا کرتی تو اس کے انداز میں ”بیگانہ روئی“ پیدا کرنے کی کوشش میاں ہوتی۔ مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چھلک ہی پڑتی، چلتے چلتے ٹھک جاتی یا آنکھ میں ہلکا سا

تبسم لہزا جاتا جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اسے زندگی سے دلچسپیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے انداز میں ایسی بیگانہ روئی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی جو والدین کے نقطہ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہیے۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداری دیکھنے کے متحمل کیوں نہیں ہو سکتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے جیسی کلیوں کی طرح سوئے سوئے ہی رہیں اور یوں سوئے سوئے ہی مر جھاجائیں۔ اس لیے وہ ان میں بیداری پیدا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور جو پیدا ہو جاتی ہے اسے نہ دیکھنے کا۔ عذرا کے والد موخر الذکر قسم کے آدمی تھے۔ گھر میں کھانے پینے کے لیے کافی تھا اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ بیویوں کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو بہت بد نصیب سمجھتے تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ ان کی بیویوں کی شادی کے فوراً بعد ہی عام ہو جانے کی قبیح عادت ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ایسی بیوی ملے جو گونا گوں ہو اور ان کا ایمان تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس لیے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کے خیال میں بیوی کا یوں عام ہو جانا اس کی بد مذاقی کی دلیل ہے اور وہ اپنے خیال کو اکثر ظاہر کیا کرتے تھے۔

انجینئر صاحب کی بیوی کو دیکھئے۔ اس کی آنکھوں میں بیسویں نگاہیں ہیں۔ ایک سے ایک نئی۔ کبھی وہ اداسی میں تو کبھی سرخی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کبھی ہم تمہیں جانتے ہی نہیں اور کبھی اب کہنے مزاج کیسے ہیں کی سی نگاہیں اور پھر ان کا تو رنگ بھی اورتا بدلتا ہے۔ کبھی گلابی گلابی، گہری گہری، گدہری گدہری، میلی میلی یہ جو پڑوس میں مسز ملک ہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں اسے کس قدر ملکہ ہے اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر خم و چوڑی مضطرب رہتے ہیں۔ ایک وہ عذرا کی ماں تھی کہ بیٹھ جاتی تو گھنٹوں اٹھنا محال ہو جاتا۔ بس دن بھر آہی چھیلی رہتی تھی اور پھر وہ زمرہ تھی کہ ایک مرتبہ ساڑھی کے لیے بڑی بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھ رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصہ تک چہرے کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمہ اجل ہو گئی۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوا۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں۔ اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خود تو وہ عام طور پر باہر بیٹھک میں بیٹھے رہتے یا کبھی اندر آتے تو عذرا کو کوئی نصیحت کرنے کے لیے کہتے۔

”عذرا دوشہ سنبھال لو۔ بیٹیوں کو یوں ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا۔“

”حشمت وہ کھڑکی کیوں کھلی ہے؟ بند کر دے۔ دیکھو تو عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے

جاتے ہیں۔“

”عذرا تم یہ مسز ملک و ملک کے ہاں نہ جایا کرو، لڑکیاں اپنے گھر بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔“

ان نصیحتوں کے باوجود انہوں نے کبھی آنکھ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ بیٹی جوان ہو جائے تو جانے کیوں اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے اسے کبھی بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔ کیونکہ گو وہ چالیس برس کے تھے لیکن ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے دوست اور احباب انہیں زینت محفل سمجھتے تھے۔ باہر یوں خانے میں تنگٹھار جاتا تھا اور قہقروں سے درو دیوار گونجتے۔

ایک روز صبح سویرے جب عذرا اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنا محبوب ٹیلا سوٹ پہنے پال بٹاری تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آ کر خشکیاں انداز سے کہنے لگے۔

”عذرا آج سے تم سکول نہ جایا کرو۔ بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔“

”مگر بابا جان۔“ عذرا نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ حیرانی اور خوف سے بد نما ہو

رہا تھا۔

”مگر وہ کچھ نہیں۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔“

ایک ساعت کے لیے عذرا کی آنکھیں اٹھیں۔ شعلے کی طرح چمکیں مگر والد جا چکے تھے۔ حشمت نے ان آنکھوں کو دیکھا اور ایسے محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھہر رہا تھا، پھر وہ جھک گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسو رخساروں سے ڈھلک کر لباس میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہوتی گئیں۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہوتی گئیں۔ اس دن سے عذرا کو ٹھیکے ہوئے کسی نے نہ دیکھا اور اسے بیگانہ روئی پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی۔ شام کو وہ کوشے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جماتے ہوئے کھوئی ہوئی سی رہتی۔ حتیٰ کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذر سے نکاح پر دھوا کر اسے رخصت کر دیا۔ غالباً اس لیے کہ عذرا کی بیداری کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا۔ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان۔ چند ایک ساعت کے لیے ان خاموش مسیب چٹانوں میں ابھرا بھر کر خاموشیوں کے ممکن کو اور بھی خاموش اور بھیا تک تر چھوڑ جاتی ہے۔

اس جھٹ پٹ پر خلق خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونے ہی تھے۔ چہ بیگونیاں ہوئیں، دہلی دہلی آوازیں اٹھیں، مگر آواز کہنے کی نوبت نہ پہنچی۔ ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرح دار نہیں سمجھی جاتی تھی کہ محلہ والیاں اس سے کینہ دوزی کرتیں۔ دوسرے انہیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشر کرتیں، بلکہ وہ تو ان کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان کی نگاہوں کی قدر دان تھیں۔ چند ایک مثلاً انجینئر

انے کے لیے کیا عذر پیش کیا تھا یا کس راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھانک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا رکنہ پڑا بھی تھا یا نہیں اس روز اس کی آنکھیں تبسم سے آشنا ہوئی تھیں اور اس کی چال نے ٹھسکا سیکھا تھا۔

اسے اس واقعے کی حقیقت پر اعتبار نہ آیا تھا۔ مگر اس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے اور اس کے شانوں پر لذیذ سادہ رو رہا تھا۔

اس روز اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی۔ ”جسولی چاہے تم کوئی بھی ہو، تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ پھر اس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اسے گدگدایا۔ وہ فہم پڑی۔ ”کیوں سولی ہے نا۔“

اس کے بعد ان کی دو چار سرسری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور دو چار خطوط آئے گئے ہوں گے اور بس۔ سیم بیش کے لیے اس کے لیے چند ایک دھندلے دھندلے نقوش، چند ایک دل کی پرکیف، تیز کنیں اور ہاتھوں شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور سینے کی چند تبسم تھر تھراہٹوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔ جس قدر یہ نقوش مدھم تھے، اس کے دل میں ان کے متعلق حیات اسی قدر گہری تھیں۔

کازمی میں عذرا اپنی ساس کے ہمراہ درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی۔ وہ جاری تھی مگر اسے تین تین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جاری ہے اس کا دل کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ سمجھتی تھی کہ خواب دیکھ رہی تھی جیسے قدرت اسے چھیننے کے لیے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ایسی بات کیسے ممکن تھی۔

باہر کیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پیکا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چھپتا تھا۔ ان کیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے بست دیو نما کبجے گرد سے اٹے ہوئے مسانوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھنکوں میں کوئی گیور کھڑا ہو سورج چمک چمک کر تھک چکا تھا اور اس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں۔ دور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا ان جھلے ہوئے میدانوں کے تسلسل میں دھندلے خواب کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے ایسے معلوم ہوتا جیسے اس نیلے پر سلیم اسے بلارہا تھا جیسے دور سڑک پر جولاری جاری تھی، اس میں سلیم بیٹھا ہے۔ پھر اس کے شانے پر کوئی نامعلوم گرفت محسوس کرتی اور وہ سستی تم میری ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ اور وہ ٹھسک کر بیدار ہو جاتی اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سولی اس کی طرف غلغلی باندھ کر دیکھ رہے ہیں مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف

کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آواز کئے میں ملکہ تھا۔ ان کا تو یہ گلہ تھا کہ نہ دھول نہ چھم چھم۔ نہ ٹانگ نہ جھانک۔ نہ تو تو میں میں۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی۔ کئی ایک کو تو مدت سے عذرا کی شادی کی تقریب سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو اور مہمان بن کر جائیں۔ حنا ملد یہ ہاتھ ہوں۔ جھلملاتی ہوئی ساڑھیاں ہوں۔ کاجل، جھمکے، بندیاں چمکیں۔ پٹیوں سے چوڑیاں بھیں پان بنائے جائیں اور اس افزائش میں اچانک کوئی آنکھ تو گھونگھٹ نکالنا تو کیا دوپٹہ سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ کوئی گستاخ نہ جھٹک کر منہ پر آگرے اور ٹانگ میں دم کر دے یا پتی پتی گوری گوری انگلیاں دوپٹے کو سنبھالنے کی ناکام جستجو میں عریاں رہ جائیں۔ باریک تھوں سے نظریں چھن چھن کر پڑیں۔ سفید سفید بایں گھونگھٹ سے نکل کر کچھ دیں، کچھ لیں۔ یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو۔

آخر خلق خدا خلق خدا ہی ہے اور بات بات ہے جو نکل ہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا کسی سے آنکھ لڑ گئی ہوگی۔ کوئی کہنے لگی۔ ”لو اب ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی۔“ کوئی کہنے لگی۔ ”سنا ہے اس کے لباس نے خط پکڑ لیا۔“ کوئی بولی۔ ”ایلو بی بی وہ تو اس کے لباس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ دفتر سے آ رہے تھے۔ بلغم میں وہ اسے پھلو میں لیے بیٹھا تھا۔ تو بہ کیسا زمانہ آیا ہے۔“ غرضیکہ کئی باتیں نکلیں بلکہ کون سی باتیں تھی جو رہ گئیں۔ مگر دہلی باتیں ہوئیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

اس بے چاری کا یہی قصور تھا کہ سکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے ہوئے بیٹھی رہتی کہ مرمیس بت کاشہ ہو تا اگر کسی شوخ چشم کے دل میں اس بت کو دیکھ کر ایک مصور پیدا ہو جائے اور اسے اس بت میں محو کر دے تو عذرا کا اس میں کیا قصور، ہاں سکول کی دیر ان سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔

پوری تفصیلات سے مجھے واقفیت نہیں، ہاں سلیم کا اونچا لمبا قد اور فراخ شانے اور اس کا انداز بے نیازی۔۔۔ اس امر کا شاید ہے کہ اسے ٹانگ جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا علوی ہے غرضیکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے قصور میں اوندھے پڑے رہنے، آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشتاق ہیں۔ چند دن تو صبح چھ بجے وہ روز اس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا، پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا سکول کے پھانک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ رہی تھی تو سلیم نے آکر اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا اور اسے شانوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔ ”تم کون ہو؟ تمہارا کیا نام ہے؟ تم بولتی کیوں نہیں۔۔۔؟ اچھا۔“ اس نے عذرا سے جھنجھوڑ کر کہا۔ ”تم چاہتے کوئی بھی ہو تم میری ہو اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔“ اور پھر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے یا اسے کیا کرنا چاہیے۔ سیم جا چکا تھا۔ پھر اسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے

تھی۔ ماں کی آنکھوں میں تجتیش اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپانہ سکتی تھیں۔ اس کے برعکس سولی کی آنکھیں پر غم معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دل کی کیفیت سے واقف تھے مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے۔ اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش ہوئی۔ نہ جانے کتنی بہاریں اس نے اس پنجرے میں گزاری ہیں۔ کیا اس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے؟ کیا اس کے دل میں بھی زمانے کی یاد اٹھتی ہے؟ پھر اس نے سنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی سٹیشن پر کھڑی تھی ماں پوچھ رہی تھی۔ ”عذرا بیٹی! نذر پوچھتا ہے کچھ پیو گی؟ دیکھو ناس قدر گرمی ہے تمہیں ضرور پیاس لگی ہو گی کیوں بیٹی!“ اس کی آواز میں منت تھی۔ عذرا نے آنکھوں سے دیکھا۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا اسے آنکھوں سے بھی اوجھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر اس نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا ہو۔

اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا ہو۔ ”نہیں اماں تم کو تو دیکھو کس قدر گرمی ہے۔“ اس بھدی آواز میں کس قدر اداسی تھی۔ ماں اگر سلیم اس سے پوچھتا اگر وہ سلیم کے گھ ب رہی ہوتی۔ مگر سلیم، سلیم جانے کہاں ہوگا، جانے اسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں۔ شاید اپنی بے چاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو، شاید ان رتکین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کئی۔ مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ الزام ہے۔ سلیم ایسا نہیں۔ پھر وہ اداسی بھری متبسم آنکھیں اس کے سامنے معلق ہو جاتیں۔ نہیں۔ وہ آنکھیں مذاق نہیں کر سکتیں۔ حقیقت سے لبریز ہیں۔ اس کے دل میں یقین سا ہو جاتا، وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ دنیا کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ شاید وہ اسی گاڑی میں موجود ہو۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ وہ ایک جھرجھری سی محسوس ہوتی۔ نہیں۔ وہ بیمار نہیں۔ بس نہیں عذرا اپنا سر کھڑکی کی چونکھٹ پر ٹیک دیتی اور اسے ایسے محسوس ہوتا کہ وہ چونکھٹ نہیں، سلیم کے شانے ہیں۔ وہ سمٹ کر ان شانوں پر جھک جاتی۔ چاہے کچھ ہی ہو، اب مجھ کو تم سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔

ماس نے اسے کمرے میں ایک فرائنگ پلنگ پر بٹھادیا۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی۔ تمام مکان سنان محسوس ہوتا تھا۔ دو چار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں مگر چند منٹ ٹھہریں اور چلی گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ اس رات لیپ روشن نہیں معلوم ہوتے تھے اور اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سیڑھا تھا، وہ محسوس کر رہی تھی جیسے سلیم کے انتظار میں بیٹھی ہو۔

دور ہو اور خنوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک

اداس کالا درخت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا لیپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی جھریاں تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ سلیم کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیسا بیدار حسین خواب تھا۔ اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں وہ اس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بند ہونے کے علاوہ اس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ یگانہ باہر سڑک پر کسی تانگے والے کی ”پھاڑی“ کی تان اس کے کان میں پڑی۔ تانگے کے پیسوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لیے پھاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اس کے سامنے سکول والی سڑک لہرا گئی۔ جب وہ آزاد تھی۔ جب وہ تانگے پر آیا جایا کرتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی۔ سلیم کی پہلی ٹمکنی۔

اس کے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ سولی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ بے چارہ سولی بھی اس چار دیواری میں قید محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سویا ہوا تھا۔ جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو۔ چہرے پر ایک تبسم سا تھا۔ جیسے کوئی خواب میں اسے گدگد رہا ہو۔ باہر فضا میں دھیمی رو پہلی روشنی پھیل رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھاٹ سی سنائی دی۔ عذرا سمٹ کر چارپائی کے کونے پر ہو بیٹھی۔ ”عذرا۔۔۔ نذر۔“ نذر کی ماں بلاری تھی۔ نذر لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب چھا گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں عذرا پر آ کر گئیں۔ پھر اس کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے۔ ”آیا اماں!“ کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر کسی کو عذرا کو دیکھنے کا شوق تھا۔ اوجیز عمر کی عورتیں جن کے لیے جوانی کے چند دن ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے۔ عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ مگر کوئی دبی دبی ہوئی آہ اس مسکراہٹ کو اداس بنا دیتی۔ وہ شوق سے آئیں مگر کھوئے ہوئے انداز سے لونتیں۔ جس طرح کوئی اپنی گذشتہ زندگی کے کسی رنگین واقعے کو یاد کر کے اپنی کھوئی ہوئی جوانیوں پر کسک سی محسوس کرتا ہے اور اپنے گرد ایک اداسی اور مٹی ہوئی دنیا پاتا ہے۔ دو ایک جوانی سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں۔ چلتی ہوئی، ٹھٹکتی ہوئی، مسکراتی ہوئی۔ ”ہم جانتے ہیں۔“ کی سی مسکراہٹیں۔ ”بس یہ ظاہر داری رہے دو۔“ ابھی تو اس گہری پر کی دلہیز بیٹھی ہو۔ ”کی سی نگاہیں اچھالتی ہوئی۔ بنتی سنورتی، ٹھٹکتی ہوئی مگر عذرا اپنی نگہری میں گم صم تھی۔ لیکن جب کوئی نواہر اس کا منہ دیکھنے کے لیے

اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی۔ پھر اسے یاد آنا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تپتا اٹھتا۔ وہاں صرف سولی ہی ایسا متنفس تھا جو اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھا۔

سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اسے از سر نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پر پڑ پڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چنگ۔

شام کے وقت نذر نے سولی کا پنجرہ عذرا کے چنگ کے قریب رکھ دیا۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخا بند کر دی اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹنگی بندھ کر بیٹھ گیا۔ عذرا نے سولی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ میں چمک آگئی۔ صرف سولی ہی اس کا راز دار تھا جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی۔

نذر عذرا کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی۔ ”تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا، عذرا! کچھ تو کھاؤ، اماں نے تمہاری اتنی نہیں کی ہیں۔“ اس نے دھیمی منت بھری آواز میں کہا۔ ”یہ تمہارا اپنا گھر ہے عذرا تم اس کی مالک ہو۔“ اس کا حلق جذبات کی بجھ سے رک رہا تھا۔ اس نے اپنے بھدے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”عذرا تم چپ کیوں ہو؟“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی زبان کسنے والی زبان نہ تھی مگر اس کا ہاتھ خاموش اور مدہم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ بھدہ اگر مہاتھ قوت گویائی سے زیادہ متکلم تھا۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے بند بند میں سنا اور اس کی تمام قوت شل ہو گئی۔ وہ اپنا ہاتھ پھڑکانا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کی مرضی کے خلاف اس کے جسم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ صرف دماغ کا کوئی خفیف حصہ جسم کی اس غداری اور اپنی بے بسی پر پیچ و خم کھارہا تھا۔ جس طرح ڈر اور ناخواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھتا چاہتا ہے، مگر جاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح عذرا بت بنی بیٹھی تھی۔ اس میں اپنا ہاتھ پھڑکانے کی قدرت نہ تھی۔ اس نے ایک مجموعہ دھندلے میں نذر کا ہاتھ دیکھا۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم تھا۔ ہاں سلیم کا ہاتھ متحرک تھا۔ بلا کا تبخ۔۔۔ اس کے دل میں خواہ مخواہ آرزو پیدا ہو گئی کہ وہ بھدہ ہاتھ متحرک ہو جائے۔ اس کی اپنی تمام قوت شوخی زندگی اس گھڑی کے لیے اس بڑے بھدے ہاتھ اور ان مضبوط ہاتھوں میں منتقل ہو جائے۔ اس کا جسم اس بھدے ہاتھ کے لیے منتظر تھا۔ بے تاب تھا اور وہ اپنی اس خواہش پر شرم محسوس کر رہی تھی اور پریشان تھی۔ مگر وہ احساس شرم اور پریشانی کسی نقار خانے میں طوطی تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آکھڑا ہوا۔ تم ہو سلیم۔! مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اس کے شانے جھک گئے۔ سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا۔ سلیم کی دو مضبوط ہاتھیں اس کے گرد آ پڑیں۔ وہ

سلیم کے پاس تھی۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کے والد نذر کے لیے ایک معمولی سامان اور چند واجب الادا رقیں چھوڑ کر مرے تھے۔ وہ عذرا کے والد کے بہت گریے دوست تھے۔ نذر نے کچھ عرصہ پہلے کیس اتفاقاً ”عذرا کو دیکھ لیا تھا اور عذرا کی ننھی نگاہوں اور اس کی لٹکی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنے خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازہ ہستی پریشان کرنا ہے۔ مرحوم دوست کے تلاش بیٹے کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ جب اس نے اپنی ماں سے سنا کہ عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو اسے یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ اٹھے گا اور اسے احساس ہو گا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدد ہوش کن خوابیں ان لامتناہی فائلوں کے سامنے کس قدر ممکن پڑتی ہیں۔ مگر شاید یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ عذرا اب صریحا ”اس کی تھی۔ نذر کے لیے عذرا کی آمد مسرت کی ایسی لہر تھی جو ہر غیر متوقع خوشی میں ہم رکاب ہوتی ہے۔ اس کی خواہشات میں جو صرف ضروریات زندگی تک محدود تھیں، ساڑھیاں جھلکانے لگیں۔ پھول مک اٹھے اور طلائی چوڑیوں کی جھنکار نقد زن ہو گئیں۔ عذرا کے لیے حسین نازک چمک ہو، عذرا کے لیے قد آدم آئینہ ہو، عذرا کے لیے شریفی ریشم ہو۔ عذرا کے لیے۔۔۔ عذرا اس کی خواہشات میں بخور بن کر آئی تھی۔

اس نے ایک چھوٹا سا پرانا ٹاپ راسٹر خرید لیا تاکہ فرصت کے وقت ٹاپ کر کے اپنی آمدنی بڑھائے۔ یہ سب کچھ اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور اس کی خاموشی حسرت بھری تشویش ہے۔

عذرا کو پہلی مرتبہ ساڑھی میں دیکھ کر نذر کی آنکھ میں ایک مخمور چمک آگئی۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کے تبسم کو محسوس کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غسل خانے میں یہ کسی اور جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر وہ نذر کی جرابوں میں آن ٹھہری۔ ”بیٹا یہ جرابیں مجھے دے دو۔“ اس نے کہا۔ ”دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں۔ لاؤ انہیں دھو دوں۔“

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑھی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں۔ پرسوں ہی تو پہنی تھیں۔“ ”نہیں بیٹا۔ نہیں۔“ ماں نے اصرار سے کہا۔ ”کیا حرج ہے؟“ جرابیں لے کر ماں چلی گئی۔ کچھ دور تک نذر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر عذرا کی طرف مڑ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”عذرا یہ نیلی ساڑھی تمہیں بہت زیب دیتی ہے میری طرف دیکھو عذرا!“

سوچتا۔ دیکھو کتنی جگہوں سے پھٹ رہی ہے۔ بوسیدہ ہو چکی ہے۔ چمک نہیں۔ پھر بھی عذرا سے میرے لیے پنپنے پھرتی ہے۔ اس لیے کہ میں اسے نیلی ساڑھی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ صرف میری خوشی کے لیے۔ حالانکہ اس کے پاس سرخ ساڑھی بھی تو ہے۔ بلکہ سرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ عورت جس کو خاوند کی خوشی زبانش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

ہندوستانی عورتیں۔۔۔ دیویاں ہوتی ہیں۔

مگر یہ ساڑھی تو بس اب پہننے کے قابل نہیں۔ گوندا رام کہہ رہا تھا۔ ایسی ساڑھی چالیس روپے کی ملے گی۔ چالیس روپے۔ ساڑھی بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے جا بیٹھتا۔ اس کے صبح وشام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا، جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا۔ عذرا دیکھیے گی۔ خوشی بھری، تعجب بھری، محبت بھری نگاہ۔ اس لمحہ کی نگاہ حاصل کرنے کے لیے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لیے تیار تھا۔

عذرا اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا بلکہ وہ نذر کے وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بے گانہ تھی۔ وہ اس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی۔ صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی۔ باقی خدو خال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی۔ شاید اس لیے کہ نذر کی پیشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ دن بھر وہ سولی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے پاس پہنچنے کے لیے اسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب عذرا اماں کے پاس بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ کوئی اجنبی عورت آ کر ان سے اصرار دھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر ماں جب نماز پڑھنے کے لیے گئی تو اس عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں لپٹا ہوا کانڈ کا گولہ رکھ دیا اور اس کی مضطرب ہند کر دی۔ اس نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ ”یہ انہوں نے دیا ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔“

پہلے تو عذر احرارانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تر اضافہ تھا۔ اس نے لفافے کو غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی۔ اس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر پیدا ہو گیا مگر وہ عورت جاچکی تھی۔

غالباً ”وہ اپنے خیالِ سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھو

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا منہ اپنی طرف پھیر دیا، عذرا نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہاں اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا ان کو بھی نیلی پوشاک بہت پسند تھی۔ اس روز پارک میں کس شوق سے دیکھتے رہتے تھے کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں۔ کس قدر پیاری آواز تھی عذرا تمہیں نیلا لباس کس قدر زیب دیتا ہے اور کس پیار اور منت سے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ عذرا وعدہ کر کہ تم ہمیشہ نیلا لباس پہنا کر گوئی میرے لیے۔ میری خوشی کے لیے اور وعدہ کر کے کہ کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ کس دیوانگی سے جھومے تھے۔

اس نے اپنے ہاتھ پر دیا محسوس کیا۔ سولی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سولی کے پتھرے کے قریب جا بیٹھی۔ وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی۔ ”تم میرے ہوتا سولی؟“ وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سولی ہی ایسی ہستی ہے جس سے بات کرنے کے لیے بولنے کی ضرورت نہیں۔

انہیں نینا رنگ پسند تھا تا سول؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے، تم جانتے ہو نا! اس میں ان کے ہاتھوں کی بو ہے۔ ان کے پیار کی سلوٹیں ہیں۔ ان پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لیے توڑ کر لایا کرتے تھے۔ کیوں سولی تم جانتے ہو نا۔۔۔؟ مگر تم نہیں جانتے۔ تم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم صرف سمجھتے ہو۔ اور سولی ان کے نچلے ہاتھ، بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھینر دینے والی شوخ بانیں۔۔۔ اس کے کندھوں کے گزشتہ دباؤ آواز ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی نیم وا آنکھوں نے اس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے جھٹک دیا۔

یوں ہی دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔ مہینے گزر گئے۔

یوں تو رہنے کو عذرا اس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چار دیواری قید نہ کر سکی۔ یا شاید اس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ آنکھیں دو بین ہو گئیں۔ وہ اپنے دل کی دنیا ان نیچی نگاہوں کی جھلکی ہوئی مڑگاہ پر اٹھائے پھرتی اور شاید جھلکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ہی ان نگاہوں نے نذر کی دنیا بدل ڈالی۔

گو نذر ان کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا۔ کبھی کبھی ان نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اسے ڈر محسوس ہوتا تھا مگر شاید وہ ہلکا ڈر ان نگاہوں کو نذر کے لیے اور بھی جاذب بنا رہا تھا۔ نذر اُجب کبھی اپنی دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اس کی طرف غشی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ آنکھوں کو جھکا لیتی۔ وہ ایک تبسم نذر کے لیے پیامِ حیات بن جاتا۔ وہ اس حیا سے بہت تبسم کے لیے اپنی زندگی، اپنا آپ۔۔۔ کبھی کچھ دینے کے لیے تیار تھا۔ پھر اس کی نظریں سارا سہی پڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہنے کے ناقابل ہو رہی ہے۔ اس میں وہ چمک نہ رہی تھی۔ وہ

جکی تھی کہ اسے کسی جیتے جاگتے سلیم کا انتظار نہ رہا تھا۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا۔ شاید اگر سلیم بذات خود اس وقت اس کے سامنے آمو جو ہو تا تو اسے بیگانہ محسوس ہوتا۔ بہر صورت اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لفاظ کس کا تھا۔ اس کے دل میں لفاظی کو کھولنے کی ہمت نہ پڑی تھی اور وہ سخت پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر سے اپنی مٹھی میں دبایا۔ اٹھ بیٹھی۔ اندر چلی گئی۔ پھر باورچی خانے میں گئی۔ صحن میں آئی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لیے یہاں وہاں گھوم رہی ہے۔ جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر کسی نامعلوم آنے والے کو ڈر محسوس کرتے ہوئے پرندے کھلی اواس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔

وہ چاہتی تھی کہ مٹھی میں اس کاغذ کے گولے کو بھیج بھیج کر ناپید کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کر لے۔ کمرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے ٹرنک کے اوپر بیٹھے ہوئے پایا۔ ٹرنک کھلا تھا۔ وہ لپٹا ہوا لفاظ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں اسے چاڑھ کر کھولا۔ اس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھیل رہی تھیں جیسے وہ مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو۔ اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اس کو ساتھ لے کر جانے پر مصر ہیں۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہی ہو۔ بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا۔ وہ بھاگی پھر رہی تھی مگر خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس پر غلبہ پارہا تھا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اس کے سامنے ناچ گئی۔ جانا۔۔۔ چلے جانا۔۔۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔۔۔ دماغ میں خلاء سا پھیل گیا۔ ماحول میں کوئی مضمون نہ رہا۔ اس وقت کائنات اس کے لیے ایک بے معنی پھیلناؤ تھی۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس رات سلیم کی بجائے کئی اور خوفناک شکلیں اس کے خوابوں میں کھس آئی تھیں۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی ڈارونی شکلیں۔ نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا۔ ”کیا ہے عذرا؟“ اس کا چہرہ فکر اور خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ ”آج تمہیں کیا ہے؟ تم بیمار تو نہیں؟“ عذرا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میلوں دور کوئی کچھ کہہ رہا ہو۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی۔ ”ہاں وہ عورت۔۔۔ دوپہر۔۔۔ وہ خط۔۔۔ ان کا خط۔۔۔ سلیم کا۔۔۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔“ اس نے جھرجھری سی لی۔ نذر کسی سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ عذرا نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا سر کسی کے شانوں پر جا نکا۔ آج پہلے دن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا۔ جانے تلکے پر تھا یا پھر۔۔۔ مگر نذر کے شانوں پر عذرا کا سر تھا اور عذرا کے بالوں کی دھبی

دھبی خوشبو نذر کو فکر مند اور پریشان کر رہی تھی۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات ایک دوسرے سے بگڑ رہی تھیں۔ ایک حصہ سولی کی شکل میں کہہ رہا تھا۔ تم ان کی ہو عذرا۔۔۔ اور اب ان سے تم کو کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ فراخ پیشانی اور سفید سفید دانت کہہ رہے تھے۔ عذرا تم بیمار تو نہیں۔۔۔ تمہیں کیا ہے عذرا۔۔۔ دو بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے۔ تم آنکھیں جھکا لو۔ عذرا تمہاری دنیا تو پاس ہے۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ ڈراؤنی ہنسی، پیاری ہنسی۔۔۔

شام کو وہ سولی سے کہہ رہی تھی۔ ”سولی تم اکیلے رہ سکو گے؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کرو گے؟ مجھے برا تو نہیں کہو گے سولی؟ کیا میں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ وہ آج رات کو دو بجے شیشم کے درخت کے نیچے آئیں گے۔ وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر دکھائی دیتا ہے۔ کیوں سولی میں ان کے ساتھ چلی جاؤں؟ دنیا کیا کہے گی؟ لہاجان کیا کہیں گے؟ سولی۔۔۔ تم تو جانتے ہو۔۔۔ تم تو سمجھتے ہو نا؟“

شام کو اس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل بنالیا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس کا دل ہلکا درد محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ اس روز وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے سے ڈر رہی تھی۔ اس نے ایک پرانا رسالہ اٹھالیا۔ پڑھنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے سے فکر اگر گھوم جاتے۔ اس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی۔ اس روز اس کی قوت سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی۔ اس نے نذر کی ماں کے کمرے میں جاتے ہوئے سنا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے بوڑھا شیشم کا درخت تھا۔ سلیم آج وہاں آنے والا تھا۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کی نظر بار بار کھڑکی سے باہر درخت پر جا رہی تھی۔ اس وقت کھڑکی بند تھی مگر شیشے میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ باہر سڑک پر کبھی لمبی وئی راہ گیر گزرتا تو اس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی۔ شیشم کا درخت مسانت سے کھڑا تھا۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ درخت اس کے راز سے واقف ہو۔ صحن والی کھڑکی میں سولی کا پنجرہ تھا۔ سولی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وئی دنیا سے بے زار رہ چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا لپک اٹھی۔ اس نے پارسل اٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے سناں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

”تم نے تو اپنا آپ تباہ کر لیا۔ صبح شام کالم، دن رات کالم۔ ہر وقت کی ٹک ٹک۔۔۔ ایک

ساڑھی کے لیے اپنا آپ حلال کر رکھا ہے۔“

”نہیں امل۔ یہ نہ کہو۔“ نذر بار بار کھانسی رہا تھا۔ ”جب سے وہ آئی ہے۔ ہم نے اس کو دیا ہی کیا ہے۔ مگر امل وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا۔ میں اسے دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تنخواہ میں بمشکل گزارہ ہوتا ہے۔“

مگر مینا اس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں۔ وہ کیوں نہیں پہن لیتی۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لیے اس قدر بے تاب ہے۔ میں تو نہیں سمجھتی۔۔۔ ہمارے زمانے میں۔۔۔“

”امل تم بھولتی ہو۔ اس نے تو مجھے نہیں کہا۔۔۔ مگر یہ تو معمولی بخار ہے۔ تم فکر نہ کرو۔“

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔ اسے تیز بخار تھا۔ عذرا کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کسی گہری دلی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے بھنے ہوئے ہونٹ کسی چھپے ہوئے بنگلے کا حال کہہ رہے تھے۔ ”تم سو جاؤ عذرا!“ نذر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم کیوں میرے لیے بے آرام ہو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بخار کی شدت میں وہ کچھ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہہ سکا تھا۔ اس لیے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تم نہ ہو تمیں عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی۔ تم میری زندگی ہو۔۔۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا۔“ اس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں۔ پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا۔ اس قرب پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی بچہ بڑے پیار سے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ عذرا بت بنی بیٹھی تھی۔ شاید وہ اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر لیکن اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ چونک اٹھی، کانپ اٹھی۔ اس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں۔ آج پہلی مرتبہ اس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا تھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے۔

رات بخار سے بے چین وہ بار بار بڑباٹھا۔ ”چالیس روپے۔ نیلی چالیس روپے۔“ وہ اکثر عذرا عذرا چیخ کر اٹھ بیٹھتا۔ پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا۔ ”تم میرے پاس ہو نا عذرا۔۔۔؟ ہاں۔۔۔ تم میرے پاس ہو۔“ پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا۔ ”تم آرام کرو عذرا۔ تم اب سو جاؤ۔۔۔ تم بیمار ہو جاؤ گی۔ میری فکر نہ کرو۔ میں اب اچھا ہوں۔“ اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ وہ سوچ بچار کے ناقابل تھی۔ باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور کوئی دھندلی سی شکل اس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عذرا بڑبڑا رہی تھی وہ آئے ہیں۔ ہاں۔۔۔! عذرا کا جی چاہتا تھا کہ سلیم سے جا ملے۔ کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اٹھ بیٹھی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی

ہے۔ یا کیا کرنا چاہتی ہے۔ باہر ہوا زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی شاخیں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عذرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اٹھالی۔ نذر بڑباٹھا رہا تھا۔ ”نیلی چالیس روپے۔“ عذرا ڈر گئی۔ اس کا سر انگارے کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔ سولی نے چیخ ماری۔۔۔ دردناک چیخ۔ عذرا نے اسے دیکھا۔ غریب اپنے پنجرے میں یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو۔ میز پر پنسل پڑی تھی۔ دفعتاً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی۔ وہ پارسل لکھ رہی تھی۔ ”میں نہیں آ سکتی۔“ اس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی۔ اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کٹ نہ دے۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھے بغیر وہ پارسل مڑک پر پھینک کر جھٹ کر دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی۔ عذرا پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں سمجھ کر بند کر لیں۔ اور اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اس کے کانوں میں ایک شور محشر سنائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا، کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا۔ وہ چیخ کر اسے بلالینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے دل میں شکست کی آواز سنی اور دھم سے کرسی پر گر گئی۔ ”یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔“ اس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے۔ بے اختیار اس کے منہ سے چیخ بھگی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا۔ ”کیوں عذرا۔۔۔ کیوں۔۔۔ میں۔۔۔ تم روتی ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟ عذرا میں یہاں ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ عذرا تم فکر نہ کرو۔ سو جاؤ۔“ نذر نے عذرا کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رکتی نہ تھیں۔ ”میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا۔“

”سلیم تم نہ جاؤ۔ سلیم۔۔۔ سلیم۔“ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا۔ ”سلیم مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔۔۔“ پھر اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا تھا۔ ”عذرا میری وفا کی دیوی۔“

کا طوطا، محمود کا طوطا اس کے دل کا کوئی حصہ نہ رہا تھا۔ جیسے اسے چھوڑ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر سامنے کھڑی پر جا پڑی جو گلی میں کھلتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ صبح شام کی مسلسل کوفت میں صرف وہ کھڑی ہی خوشی کی ایک امید گاہ تھی مگر وہ بوڑھا فقیر جس پر رشید اس کھڑکی سے پتھر پھینکا کرتا تھا، دو روز سے نہیں گزرا تھا۔ دو روز اس نے بوڑھے فقیر کے انتظار میں گزارے تھے۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور لاشعوری طور پر اس نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے کسی طرف پھینک دیا۔

رشید ابھی چھ ماہ کا نہ ہوا تھا اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑی بہن کا بھائی ہے اور ماں باپ نے اسے سسک سسک کر پایا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بذات خود کیا ہے۔ آیا وہ باپ کا نام قائم کرنے یا ماں کا ساگ مستحکم کرنے کے لیے ہے یا ماں باپ کے کسی خاص مقصد کے لیے ہے یا ویسے ہی ہے۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اول تو وہ ہے ضرور اور دوسرے وہ کوئی بڑی اہم ہستی ہے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہے۔ گو ہستی اور نور کے متعلق اس کے احساسات واضح نہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بار بار ”گو“ کہہ کر وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے۔ یعنی اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کے لیے اسے صرف ہونٹ ہلانے کی ضرورت تھی۔ جب چھ سال کی مسلسل منتوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تو ماں باپ کے لیے اسے نظر انداز کرنا زرا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب رشید کو پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو گیا تو اسے دودھ پیتے، سونے اور باقی وقت نکتے پڑے رہنے یا فضول اپنا انگوٹھا تلاش کرنے یا دور پڑی ہوئی چیزوں کو پکڑنے کی کوشش میں چنداں دلچسپی نہ رہی۔ البتہ لوگوں کو نچانا ضرور باعث فرحت تھا۔ اس دلچسپ شغل میں اس نے دو سال بسر کیے۔ اس عرصے میں ہزاروں انکشافات کے علاوہ اس پر یہ بھی آشکارا ہوا کہ وہ بد صورت ہے۔ ابتدا میں تو اسے بد صورتی کی تفصیلات کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی ناک چھٹی ہے۔ پیشانی چھوٹی اور ہونٹ موٹے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ بد صورتی عیب سمجھی جاتی ہے یا وصف۔ وہ صرف یہ جان سکا کہ ماں باپ اسے بد صورت کہہ کر یا اس کے ناک، ہونٹ اور پیشانی کے متعلق کہہ کر فرط انبساط سے اسے گود میں اٹھا کر بہار کرتے تھے۔ اس لحاظ سے تو بد صورتی بہت پیاری خصوصیت تھی۔

اس زمانے میں دنیا یوں بے معنی نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص اصولوں پر چلتی تھی۔ اس کا بننا، رونا، روٹنا یقینی نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ وہ دو سال اس کی زندگی میں ایک گذشتہ مگر قابل حصول نتیجہ سے سرشار تھے۔ ان دنوں زندگی اس قدر پیچیدہ اور لوگ اس قدر ضدی اور اندھے نہ تھے۔ ان دنوں اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے اسے کسی دقیق عمل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جلد ہی وہ دن آ گیا جب وہ بات نہ رہی۔ اس روز وہ اپنی بہن کی گود میں بیٹھ کر حسب معمول قواعد کو ادا کرتا تھا کہ ان

بیگانگی

رشید نے اٹھ کر آنکھیں کھولیں۔ دو ایک انگڑائیاں لیں اور کھوئے ہوئے انداز میں میڑھیوں کے قریب جا بیٹھا۔ اس نے کوشے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ تمام چار پائیاں خالی پڑی تھیں۔ سب لوگ نیچے جا چکے تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سامنے اونچے اونچے مکانوں کا انبار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لیے دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔ اچھا اب تو صبح ہو چکی ہے۔ اس نے ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے وہ نہ ختم ہونے والے دن کی کوفت کا بو جھ محسوس کر رہا ہو۔ اس کے لیے دن، ایک مسلسل کوفت تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ اس کے نزدیک چھٹی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہ تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ گھر کے تمام لوگ اس کے وجود سے ہی منکر تھے۔ اس لیے انہیں اپنے وجود اور عظمت کا احساس دلانے کے لیے اس پر لازم ہو جاتا کہ وہ آپا کے چنگلے یا محمود کا منہ چڑائے یا محمود کے پالتو طوطے کی دم کھینچ لے۔ اور نہیں تو چیزیں اوہرا اوہرا کر دے۔

رشید نے ایک اور انگڑائی لی۔ اب میں کیا کروں؟ وہ مبہم طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تمام لوگ گھر میں اسے کوئی ایسا کونہ تک نظر نہیں آتا تھا جسے وہ اپنا سکتا یا جہاں اس کی موجودگی سے بیگانگی نہ برتی۔ اس نے اکتائے ہوئے انداز سے فیض کے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگا لیا۔ زندگی اس کے لیے ناقابل فہم بیگانگی سے بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف یہ سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہے کیا ہو جائے گا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں رشید ہے اور محمود کیوں محمود ہے۔ اور اس نے محمود کا سا برتاؤ کر کے آزما دیکھا تھا مگر اس کے باوجود گھر والے اس پر ”رشیدیت“ ٹھونس رہے تھے۔

اس کی نگاہیں اکتائے ہوئے انداز میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں گھوم رہی تھیں۔ سامنے محمود کا طوطا پتھر سے میٹھ پتھر اڑ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت کی ایک لہری دوڑ گئی۔ محمود

کی ملازمہ رضیہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ ”بی بی تمہیں مبارک ہو۔ خدا نے تمہارے گھر ایک اور ننھا بھائی دیا ہے۔“ سلیمہ نے یہ سنا تو رشید کو یوں پٹک کر بھاگ گئی جس طرح وہ خود نے کھلونے کی آمد پر پرانے کھلونے پھینک دیا کرتا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب رشید کی یوں تحقیر کی گئی۔ رشید کی تحقیر۔۔۔ سلیمہ کی اتنی جرات۔ پہلے تو وہ حیران چپ چاپ زمین پر بیٹھا رہا۔ پھر ان سب باتوں کو سوچ کر اس نے یلکھت روٹا شروع کر دیا۔ اس کی دانست میں رونے سے بڑھ کر کوئی قوت نہ تھی مگر خدا جانے اس روز اس کے رونے میں کیوں اثر نہ تھا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں والا روٹا بھی کام نہ آیا۔ پھر اسے تازہ دم ہو کر روٹا پڑا۔

آخر رضیہ آئی۔ اس نے رشید کو جھنجھوڑ کر اٹھالیا۔ لول تو رضیہ اسے مٹانے کو آئے۔ رضیہ ایک ادنیٰ ملازمہ۔۔۔ کس قدر بے عزتی کی بات تھی اور پھر وہ بھی اسے جھنجھوڑ کر اٹھائے۔ اس روز اس کے خیال میں دنیا کے اصول ہی بدل رہے تھے۔

ماں کے سامنے جا کر اس نے دو تین چیخوں سے آپا رضیہ اور دنیا بھر کے خلاف شکایت کی مگر ماں اسے گود میں اٹھانے اور جملہ لوگوں کو برا بھلا کہنے اور گھورنے کی بجائے خیف سی آواز میں کہنے لگی۔ ”یہ کیا سر کھا رہا ہے۔۔۔ اسے یہاں سے لے جا اور جو نعمت خانے میں مٹھائی پڑی ہے، وہ اسے دے دے۔“ یہ تھی اس کی ماں۔ اس کی اپنی ماں جس کی آنکھوں کو اس نے نور بخشا تھا۔ وہ ماں۔۔۔ اگر اس کی قوت اظہار اپنے باپ کی طرح وسیع ہوتی تو وہ یہ کہہ اٹھتا۔ ”بس چودھویں صدی آگئی ہے جب کہ ماں کو اپنے گئے بیٹے سے محبت نہیں رہی۔ ماں کا خون بھی سفید ہو گیا۔۔۔“ رضیہ اسے بلورچی خانے میں تن تھا چھوڑ جائے۔ اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھانے کے لیے۔۔۔ ماں سے دور ماں کی واری مدد سے بغیر۔۔۔ سوکھی مٹھائی اور ماں اس گوشت کے لوتھڑے کے پاس لیٹی ہے۔ کیسی بے ہودہ شکل تھی۔ نہ سرنہ منہ، یقینی طور پر چودھویں صدی آچکی ہے جس کے متعلق اکثر اباؤ کر کیا کرتے تھے۔

پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ ماں بیمار ہے اور اس نے اخذ کیا کہ بیمار اسے کہتے ہیں جس کے ارد گرد بھیڑ لگی رہے۔ جس کے لیے مٹھائیاں منگوائی جائیں اور جس کی اتنی ہی دیکھ بھال ہو، جتنی کسی زمانے میں اس کی اپنی ہوا کرتی تھی۔ یعنی بیماری میں بھی وہی تاثیر تھی جو کسی زمانے میں اس کے رونے میں تھی اور اب دن بدن ضائع ہو رہی تھی۔ بیمار بن کر اس کی حکومت شاید لوٹ آئے مگر اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس طرح بیمار پڑ جائے۔ اس نے دو ایک مرتبہ اپنی بیمار ماں کو اس امید پر لپٹ کر چوما کہ شاید اس طرح ماں کی بیماری اسے لگ جائے مگر اس کے بلو جو گھر والے اسے بیمار سمجھنے سے منکر رہے۔ بہر حال ان دنوں اپنی مٹی ہوئی امانیت حاصل کرنے کے لیے رونے، روٹنے اور ضد

کرنے کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور ان کے استعمال میں اس نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ مگر ان کے استعمال سے مزید مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

ماتا کہ ماں کے دودھ کے علاوہ مٹھائی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھانے کا عادی تھا مگر ماں کے دودھ سے بالکل محروم کر دینا۔ کھیلنے کو بھی نہ دینا کس قدر کمینہ پن تھا۔ اس سے پہلے تو اسے بے روک ٹوک کھیلنے کی اجازت تھی۔

پہلے پھل تو اسے یہ آس رہی کہ صحت ہونے پر ماں وہی پہلی سی ماں ہو جائے گی۔ مگر ماں نے بستر چھوڑ دیا۔ چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ مگر اسے وہ محبت نصیب نہ ہوئی۔ پیار تو وہ کرتی تھی مگر وہ پیار مقابلتا ”ظاہری اور پھیکا محسوس ہوتا۔ ماں کا دھیان تو ہر وقت نسخے کی طرف لگا رہتا تھا۔ اسی کو ساتھ سلاتی اور رشید جب رات کو جاگتا تو وہ دیکھتا کہ وہ تن تنہا کھولے پر پڑا ہے۔ وہ بے چارہ اس اندھیر پر رو پڑتا اور چاہتا کہ ماں اسے پاس بلائے مگر ماں کس بیگانگی سے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپک دیتی، جس طرح دور سے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔

آخر رشید لوگوں کی عدم توجہی سے تنگ آ کر احتجاجی حرکات کو جائز قرار دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی حرکات سے متاثر تو کیا، ماں باپ نے انہیں سمجھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ درد دل کا اظہار لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتے رہے کہ رشید کو بستر پر پیشاب کرنے کی قبیح عادت پڑ گئی ہے اور وہ رات کو بلبلاتا اٹھتا ہے اور اسے اسہال کی شکایت ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جو گالیوں، بد دعاؤں یا لفظوں سے اپنے غصے اور دنیا کی بے وفائی کا اظہار نہیں کر سکتے، وہ درد دل کا اظہار مٹانے اور معدے سے کر سکتے ہیں۔

ماں سے مایوس ہو کر رشید نے ابا سے آڑ سر نور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل مجبور تھے کیونکہ وہ ہر وقت سنتے تھے کہ محمود کی شکل ان پر تھی اور بد صورتی تو خیر رشید کی شکل بالکل ان پر نہ تھی۔ باپ کے لیے اس اہم تفصیل کو نظر انداز کرنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح محمود سے غدار می کر سکتے تھے۔

آخر آہستہ آہستہ رشید پر انکشاف ہو گیا کہ ملی کی دم کھینچنے اور مرغی کے پر نوپنے میں بھی راحت ہوتی ہے۔ گویہ راحت ماں باپ کا نور نظر اور گھر کا چراغ ہونے کے مقابلے میں بیچ تھی، مگر راحت ضرور تھی۔ ماں باپ تو اسے گوشت کے لوتھڑے میں، جسے وہ محمود کہہ کر پکارتے تھے، اپنا وجود کھو چکے تھے۔ صبح سے شام تک محمود کا ذکر۔ محمود کی آنکھوں، پیشانی اور ہونٹوں کے قصے۔ محمود کی صحت، مسکراہٹ اور کھیل کا روٹا اور محمود بھی وہ جسے رونے تک کی تمیز نہ تھی۔ کیسی بے سری الپا تھا۔ رشید نے کئی دفعہ محمود کا منہ تک نوچنا گوارہ کیا کہ ماں کا قرب حاصل ہو یا اس کا منہ جو سننے

سے وہ خود محمود بن جائے۔ مگر والدین بھی پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ ان پر ان باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک روز جب رشید ابا کی چھتری کا گھوڑا بنا کر سواری کر رہا تھا اور ان کے کفالت کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو انہوں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب رشید نے جواب میں چیخوں سے درودل کا اظہار کیا تو انہوں نے ایک دو تھپڑ جڑ دیئے اور جلال میں کہنے لگے۔ ”بہت بد معاش ہوا جا رہا ہے۔ کبھی آپا کو مار۔ کبھی ماں سے لڑ۔ گھر میں کھرام بچا رکھا ہے۔“ پاجی۔ ”اس سرزنش کے دوران میں ماں محمود کا پوتہ ٹھیک کرنے میں شدت سے مصروف رہی۔ گو اوہر سے پیار کی کوئی امید نظر نہ آتی۔ پھر بھی اسے مجبوراً فریاد لے کر ماں کے پاس جانا ہی پڑا لیکن ماں نے بھی ”ہر وقت سر کھپاتا رہتا ہے۔“ کہہ کر ایک تھپڑ مار دیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ ماں نے ”یہاں مر۔“ کہہ کر جھنجھوڑ کر اسے اٹھالیا اور اپنے پاس لٹا لیا۔ یہی تو اس کی خواہش تھی کہ وہاں مرے۔ کسی سے تھپڑ کھا کر اسے وہاں مرنے نصیب تو ہوا۔ اس کی معلومات میں یہ ایک اضافہ تھا۔

اب رشید تیسری جماعت میں تھا۔ چونکہ پچھلے سال وہ فیل ہو گیا تھا۔ رشید کے والد کو یقین تھا کہ رشید فطری طور پر کند ذہن ہے بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس کے دماغ میں عقل سلیم کا خانہ خالی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ تیسری جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ اپنے اس خیال کے متعلق اکثر بات کرنے کے علوی تھے یا وہ محمود کی ایسے انداز میں تعریف کرتے جس سے رشید کی نااہلیت اخذ ہو۔

”محمود سوالوں میں طاق ہے۔ اگر رشید کا ذہن بھی اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات تھی۔ مگر یہ رشید کا قصور نہیں۔۔۔ اس کی یادداشت ٹھیک نہیں۔۔۔ بے چارے کو باتیں یاد نہیں رہتیں۔۔۔ اور۔۔۔ محمود کی ماں۔۔۔ تم نے سنا۔۔۔ اوہر آتا۔۔۔ باہر محمود کا استاد آیا ہوا تھا۔ کتا تھا، محمود فر فر سبق سنا رہا ہے۔“

کسی وقت جب دونوں بچوں کے مستقل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ اکثر کہا کرتے۔ ”محمود۔۔۔ محمود۔۔۔ کو تو انجینئر بنائیں گے۔ اسے رڈ کی بھیجیں گے۔ رڈ کی۔ رڈ کی سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی انجینئر نہ کالج نہیں۔ سنا تم نے محمود کی ماں۔ رڈ کی میں بہت بڑا کالج ہے۔“ شاندار۔“

اس دوران میں وہ محمود کی طرف اس زوایئے سے دیکھتے جیسے کوئی مصور اپنے شاہکار کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ چونک کر ایک موہوم سی آہ بھر کر رشید کی طرف دیکھتے۔ ”رشید محمود کے طوطے کو دق نہ کر۔ تمہیں تو ہر وقت شرارت سو جھتی ہے۔ محمود کی ماں۔۔۔ دیکھا تم نے جگرے کو بل دے رہا تھا شیطان۔ محمود کی ماں۔۔۔ اگر رشید بھی ذہین ہوتا تو اسے بھی رڈ کی بھیجتے۔ مگر کوئی بات

نہیں۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ یہ تو قدرتی باتیں ہیں۔ انسان کو ان باتوں میں دخل نہیں۔ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کیوں محمود کی ماں۔۔۔ یہ تم کیا دھور رہی ہو۔ تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ ہاں رضیہ کہاں ہے۔ رشید میں کہتا ہوں، اس پنجرے کو نہ چھیڑ۔۔۔ سنا نہیں۔“

رشید باپ کی ان پیچیدہ باتوں کے دوران بیٹائیاں لے لے کر تھک جاتا۔ پھر دھنٹا۔ اس کا جی چاہتا کہ زور سے مرغی کی دم کھینچے یا آپا کی ٹانگ میں چٹکی لے یا کسی ریختی ہوئی چوہنی کو پاؤں سے مل دے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بد نما چڑا اس کے نزدیک محمود کا طوطا تھا۔

رشید اپنی جگہ سے اٹھا۔ ایک اور انگڑائی لی۔۔۔ ”اچھا تو اب کیا کروں۔“ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر کوئی چیز اس کے لیے باعث دلچسپی نہ تھی۔ بیڑھیوں سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا کہ ماں، آپا اور رضیہ باجی باورچی خانے میں ہیں۔۔۔ ابا اور محمود کی آوازیں بیٹھک میں سے آرہی تھیں۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ ”ماں“ اس نے آکٹائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”بھوک لگ رہی ہے۔“

اماں بولی۔ ”آگئے۔ آنکھ کھل گئی۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ صبح اٹھ کر سکول کا کام کیا کرو۔“

آپا کہنے لگی۔ ”اماں! محمود نے آج صبح ہی صبح دس سوال نکال لیے ہیں۔“

رشید نے ان باتوں پر دھیان نہ دیا۔ اس نے چاروں طرف سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر ماں سے ٹسی کا گلاس لے لیا۔

ماں نے کہا۔ ”منہ ہاتھ تو دھو لیا کر۔ کتنا گندا ہے۔“

مگر رشید ٹسی پی چکا تھا۔ وہ اپنی قبض سے منہ پونچھ کر گلاس صندوق پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ کمرے میں سامنے چاقو پڑا تھا۔ اس نے چاقو اٹھالیا اور سرسری طور پر میز کا کونہ کھرچنا شروع کر دیا۔ باہر بیٹھک سے ابا اور کسی صمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”یہ بھی کیا عمر ہے۔۔۔ بادشاہی عمر۔۔۔ بچپن سے بڑھ کر زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔“

رشید سوچ رہا تھا۔ بچپن سے بڑھ کر کوئی عمر نہیں۔ یہی بچپن۔۔۔ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بناء پر لوگ بچپن کو اس قدر سراہتے ہیں۔ کیا باقی بچپن سے بھی زیادہ آکٹا دینے والی ہے۔ اس نے ایک جھرمجی لی۔۔۔ باہر لیا کہہ رہے تھے۔

”محمود۔۔۔ محمود تو سوالوں میں بے حد طاق ہے۔ رڈ کی۔! رڈ کی سے بڑھ کر کوئی درس گاہ

نہیں۔ سو روپیہ ماہوار خرچ۔ نصیب کی باتیں ہیں۔ وہ ہمارا رشید۔۔۔ وہ سال اس سے بڑا ہے۔

بالکل کند ذہن، کلم چور، نکم۔۔۔ لنگہ کا ہر حال میں شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

رشید اٹھ بیٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ شاید اس کے لیے وہاں ابا کی آواز نہیں

جانوروں سے کس قدر محبت ہے۔ محمود کی ماں!۔ محمود کی ماں!

”کیوں ایجابی۔“ محمود نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بیٹا۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”رشید نے تمہارا طوطا دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ بے چارے کا گرمی کے مارے پر احوال ہو رہا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے۔“

اس پر محمود بولا۔ ”نہیں ایجابی! میں نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ اس نے پانی کی کنوری الٹ دی تھی اور پانی میں تر ہو رہا تھا۔ میں نے اسے سکھانے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا۔ پھر اسے اٹھانا مجھے یاد نہیں رہا۔“

”محمود کی ماں۔۔۔ محمود کی ماں۔۔۔“ باپ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے سنا؟ محمود نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ محمود کی یہ بہت اچھی عادت ہے۔ دیکھو ناچ بچ کہہ دینے سے بالکل نہیں گھبراتا۔ لو اگر رشید طوطے کو دھوپ میں رکھتا تو چاہے کچھ ہی ہو جاتا، وہ کبھی اقرار نہ کرتا۔ رضیہ۔۔۔ رضیہ کہاں ہے رشید؟ رضیہ۔۔۔!“

”ابھی یہیں تھا۔“ ماں نے کہا۔ ”جانے کہاں چلا گیا ہے؟ گلی میں ہو گا۔ میں تو اس لڑکے سے تنگ آچکی ہوں۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔ تم تو گھبرا جاتی ہو۔ یہیں کہیں ہو گا۔“ باپ نے اسے تسلی دی۔ رشید دبے پاؤں غسل خانے سے نکل کر چوبارے میں چلا گیا۔ بوڑھے فقیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا مگر وہ بوڑھا دونوں سے نہیں آیا تھا۔

رشید کے بدن میں ناامیدی سے سستی سی محسوس ہو رہی تھی اس واحد عشرت سے وہ گزشتہ دو دنوں سے محروم تھا۔ اس نے چھ سات موٹے موٹے پتھر چرن لیے اور کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ سامنے مکانوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ گلی میں خاک اڑ رہی تھی۔ دھوپ سے آنکھیں چندھائے جاتی تھیں۔ مکانوں سے پرے ریت کے نیلے کھڑے تھے۔ کہیں کہیں گبولے بناج رہے تھے۔ وہ ان گبولوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ فقیر کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ اس نے جھرجھری لی۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنی ٹھوڑی اس پر ٹکادی۔ اور معصومیت بھرے انداز میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی مظلوم کے دکھ کو دیکھ کر وہ خدا سے اس کی نجات کے لیے دعا کر رہا ہو۔

انتظار سے مایوس ہو کر وہ اوھر اوھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ سامنے والے مکان کے روشن دان پر پڑی۔ روشن دان میں سرخ شیشے کو دیکھ کر ایک بیگانہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور اس سے کھیلنے لگا۔ پتھر نہ جانے کیا سوچھی۔ اس کے بازو نے زور سے جھٹکا

پہنچتی تھی۔ یا اس لیے کہ سامنے پڑی ہوئی چٹائی سے تنکے کھینچنے کی خواہش اسے مجبور کر رہی تھی۔ بلورچی خانے میں ماں کہہ رہی تھی کہ ”رضیہ وہ کہاں عائب ہو گیا ہے۔ جا دیکھ تو کہیں میں صندوق میں سے کپڑے نکال کر پھاڑ تو نہیں رہا۔ میں بھی کتنی بھول کرتی ہوں۔ صبح صندوق کو کھولا تھا تو اسے بند نہیں کیا۔ جا دیکھ تو۔۔۔ توبہ میں تو اس لڑکے سے عاجز آچکی ہوں۔“

رضیہ کی آہٹ سن کر رشید چٹائی کو چھوڑ کر پرے جا بیٹھا اور ایک لوہے کے ٹکڑے سے ناخن کریدنے میں مشغول ہو گیا۔ رضیہ اندر آئی۔ اس نے نفرت سے کھولتی ہوئی نگاہ رشید پر ڈالی۔ مگر رشید بظاہر اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا۔ پھر جب رضیہ صندوق کو تالا لگا رہی تھی تو نہ جانے رشید کو کیا ہوا۔ اس نے اپنے بازو میں شدید اکڑ سی محسوس کی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر پکا اور انگلیوں نے بڑھ کر رضیہ کی کمر میں چنگی لے لی۔ اس نے بھاگتے ہوئے ”اوئی“ سنا اور پھر رضیہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ مگر وہ غسل خانے پہنچ کر بالٹی میں ہاتھ ڈبو رہا تھا اور گرتے ہوئے قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ قطروں کو گرتے ہوئے دیکھ کر اسے وہ بوڑھا فقیر یاد آ گیا جس پر وہ چوبارے کی کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا۔

بوڑھے کی عاجزانہ نگاہ۔۔۔ بے بسی۔۔۔ اور بے چارگی۔۔۔ اس روز جب اس کی آنکھوں سے پانی قطروں میں گر رہا تھا کس قدر مضحکہ خیز شکل تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ باہر ماں غصے سے پوچھ رہی تھی۔

”رضیہ محمود کے طوطے کا بیڑہ یہاں دھوپ میں کس نے رکھا ہے؟“

رضیہ بولی۔ ”توبہ بی بی۔ میں نے تو ابھی اسے چوبارے میں رکھا دیکھا تھا۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ میری تو بی بی یہ عادت ہی نہیں۔“

ماں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”بس یہ اسی شیطان کی کارستانی ہے۔ نہ جانے محمود کے طوطے سے اسے کیا میر ہے۔ اور بھائی ہوتے ہیں۔ آپس میں پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ اس لڑکے پر تو محمود کو دیکھ کر بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ رضیہ۔۔۔! لے۔ اسے چوبارے میں رکھ اور اس کی کنوری میں پانی ڈال دے۔“

رشید دروازے سے جھانک رہا تھا۔ ”محمود کا طوطا“ اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ محمود کے طوطے کو؟“ ابنا اندر آ کر کہہ رہے تھے۔ ”ہاں بس ایسا کون کلام کرے گا۔ اس لڑکے میں تو ذرہ بھر رحم نہیں۔ قصائی ہے قصائی۔ صبح شام چیزیں الٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں۔ کل میرے دفتر کے کافذات کی بیڑیاں بنا رہا تھا۔ نامعقول۔۔۔ لے رضیہ اسے چوبارے میں لے جا۔ محمود تو طوطے پر جان چھڑکتا ہے۔ جب تک اسے کھانا لے، خود نہیں کھاتا۔ اسے

کھایا۔۔۔ پھر سے سرخ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر چوکی پر آ بیٹھا۔ سامنے محمود کا طوطا پھڑپھڑا رہا تھا۔ محمود کا طوطا۔۔۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ جیسے کوئی اسے چھیڑ رہا ہو۔ محمود کا طوطا۔۔۔ محمود کا طوطا۔۔۔ تمام فضا آوازوں سے بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لپک کر بچرہ اتار لیا اور اسے دھوپ میں رکھ دیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ چوکی پر لبا کا بسترادیکھ کر رشید ٹھٹھک گیا۔ اس نے استرا اٹھالیا۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ منہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ ”محمود کا طوطا۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ بچرے کے قریب ہو بیٹھا۔ بچرے کا دروازہ کھل گیا۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اسے بوڑھا فقیر بھی یاد نہ رہا۔ چیخ چیخ۔۔۔ لہو کی بوندیں اس کے ہاتھوں پر گر رہی تھیں۔۔۔ سرخ رنگین محمل سالو۔ کھڑکی سے باہر رنگین سنہری سرخی تلچ رہی تھی۔ دو بگولے آسمان پر محلی قوس بن کر جموم رہے تھے۔

”محمود کا طوطا۔“ اس کے دل کا کوئی کونہ تسخیر سے کہہ رہا تھا۔ ”محمود۔!“

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے جو بدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں، آپا اور اسی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا۔ اسی جان میں بھی پلہ کروں گا۔

”وہ۔۔۔ ابھی ہے۔“ اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ ”اچھا بدو تمہارا بیٹا آپا سے کر دیں؟“

”اونہوں۔۔۔۔“ بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں۔ ”کیوں آپا کو کیا ہے؟“

”ہم تو چھابو بلی سے پیادہ کریں گے۔“

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی۔ ”کیوں۔۔۔ دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں۔۔۔!“

”میں بتاؤں کسی ہے؟“ وہ چلایا۔

”ہاں بتاؤ تو بھلا۔“ اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چوہے پر آرکی۔ چوہے میں اپنے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”ایسی۔“ پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا۔ ”اور چھابو ہانی ایسی۔“ اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگی۔ ”تصدق بدو سے پوچھنا کہ آپا کیسی ہیں۔“ آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ لی جیسے ہنسی پکانے میں منہمک ہو۔

”ہاں تو کیسی ہے آیا بدو؟“ وہ بولے۔ ”جناؤں۔“ بدو چلایا۔ اور اس نے اپنے کا کھڑا سارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اودنہ۔“ بدو رونے لگا تو ماں کہنے لگی۔ ”پنگے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے۔ اس میں چنگاری ہے۔“

”وہ تو جلا ہوا ہے ماں! بدو نے سورتے ہوئے کہا۔

اماں بولیں۔ ”میرے لال بھی جھیس معلوم نہیں۔ اس کے اندر آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔“

بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ ”کیوں آپا! اس میں آگ ہے کیا؟“

اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ ”میں کیا جانوں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھٹکی سے اٹھا کر چلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگیں۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی۔ مگر میں کہا کرتی تھی۔ ”آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔“ اور وہ مسکرا کر کہتی۔ ”پنگی“ اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کے لیے کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چنچکا۔ ”آپا میرا لیا۔“ ادھر ابا گھورتے۔ ”سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟“ سچ میں اماں بول اٹھتی۔ ”بنیادھولی کب سے باہر کھڑا ہے۔“ اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنسنے ہوئے نہیں سنا۔ زیادہ سے زیادہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ اکثر مسکرایا کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہنستی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تل پر ناچ رہی ہو۔ اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر میں کبھی نہ اکتائی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے۔ ”ہیں جی۔۔۔ کیوں جی؟“ اور اس کی کال کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگے۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری لگتی تھی۔

ساحرہ اور شریا ہمارے پردوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر میں جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھائی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا ایک ”یہ کرو“ وہ کرو“ والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑ گڑانے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے سنا ”سچ تو یہ ہے کہ مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے۔“ سجادہ کی ماں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔“

”کیوں؟“ اماں پوچھنے لگی۔

کہنے لگے۔ ”بس تمام دن برتن بچتے رہتے ہیں۔۔۔ اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔“ اماں تنک کر بولی۔ ”مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔“

ابا کہنے لگے۔ ”افوہ۔۔۔! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی، برتن بچنے لگے۔ بازار کے موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔“ میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ۔ جی ہاں۔ اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور کڑو کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ مٹ مٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری کھنی کے دانے بھون رہا ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر نہ ہوتے تو وہ بھدی آوازیں گایا بھی کرتے تھے۔

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے

نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا پھر مار کر کہتی۔ ”بدو روٹ۔“ اور پھر آپ ہی بیٹھی مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے کوئی بی دو ماہ ہوئے تھے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی ”بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں۔ ”اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب۔“ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی کچھلی بہت

سی باتیں لے بیٹھتی ہے۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آٹھ رہے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ آتاتے۔ البتہ آپا سے زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جلتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ بن جاتا اور آپا کی ہیکلی ہیکلی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کلام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتی تھی گو کتنی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اس وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے۔ ”بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟“

”آپا۔۔۔“ بدو لا پرواہی سے دہرائے۔ ”بیٹھی ہے۔۔۔ بلاؤں؟“

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے۔ ”نہیں نہیں۔ اچھا بدو۔۔۔ آج تمہیں یہ دیکھو۔ اس طرف۔ تمہیں دکھائیں۔“ اور جب بدو کا دھیان اوہرا اوہرا ہو جاتا تو مدھم مدھم سی آواز میں کہتے۔ ”ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔“ بدو چیخ اٹھتا۔ ”کیا ہوں میں؟“ اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈمگ ڈمگ۔۔۔ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے۔ دیکھا جسے ڈھول بھی کہتے ہیں۔ ڈمگ ڈمگ سمجھ اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر رک جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی۔ اور پھر چولے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا۔ بالوں کی لٹ پھل کر گالوں پر آگرتی اور وہ ہیکلی ہیکلی آنکھیں چولے میں تپتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ملتے گویا کچا رہی ہو۔ مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر املا یا بابا پورچی خانے میں آجاتے تو آپا ٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ پال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آگیا ہو۔

ایک دن میں آپا اور املا محفل میں تھیں۔ اس وقت بھائی اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بھائی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے۔ ”میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے۔ کتابیں پڑھ سکے۔ شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بٹے سے یوں ڈڑن ڈڑن۔ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزیدار کھانے پکا کر کھلا سکے۔ سمجھے۔۔۔؟“

بدو بولا۔ ”ہم تو چھاجو بانی سے بیاہ کریں گے۔“

”نہ نہ۔۔۔“ بھائی نے کہا۔

بدو چیخنے لگا۔ ”میں جانتا ہوں۔ تم آپا سے بیاہ کر دو۔“

اس وقت املا نے آپا کی طرف دیکھا مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ ”واہ تمہاری آپا فنی پکاتی ہے تو پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھینکی۔۔۔ آخ تمہو۔“

بدو نے کہا۔ ”ابا جو کہتے ہیں کہ فنی میں کم میٹھا ہونا چاہیے۔“

”تو وہ اپنے ابا کے لیے پکاتی ہے ہمارے لیے تو نہیں۔“

”میں کھوں آپا سے؟“ بدو چیخا۔

بھائی چلائے۔ ”اوہ پگلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرح۔۔۔ ڈمگ ڈمگ۔“ بدو پھر چلانے لگتا۔ ”میں جانتا ہوں۔ تم میز بجارہے ہو نا؟ ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹنا ہے نا۔“ بھائی کہہ رہے تھے۔ ”کشتیوں میں۔ اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گلا اور تم بدو پہلوان۔ ذرا ٹھہرو جب میں تین کھوں تب۔“ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز سے کہا۔ ”ارے یار! تمہاری دوستی تو مجھے بہت مشکلی پڑتی ہے۔“

میرا خیال ہے آپا نے اس نے روک سکی۔ اس لیے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو فنی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور املا نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آگئے اور کہنے لگے۔ ”کیا پڑھ رہی ہو ج ہے نا؟“ ان کے منہ سے جینسان کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزہ آنے لگتا ہے۔ میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کوئی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی املا سوتا ٹپکتی ہوئی آ رہی ہو۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوارنے میں مکمل حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جینسان کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے۔ مگر وہ تو پرانی بات تھی۔ جب آپا پھونتی تھی۔ اب تو بھائی اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لیتے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا۔ ”سکول کا کام کر رہی ہوں۔“ پوچھنے لگے کہ تم نے کوئی برتاؤ شاکی کتاب پڑھی ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان والی دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آپا نے تو ہمارا بریک ہاؤس پڑھی ہوگی۔“ وہ نکلیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے نظریں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم سی آواز میں کہا۔ ”نہیں۔“ اور سو بیٹھنے میں

گئی رہی۔

بھائی بولے۔ ”کیا بتاؤں جیسا کہ وہ کیا چیز ہے۔ نشہ ہے نشہ۔ خالص شہد۔ تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور پڑھوں گی۔“

پھر پوچھنے لگے۔ ”میں کہتا ہوں جہاں آپ نے میٹرک کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟“

میں نے چڑ کر کہا۔ ”مجھے کیا معلوم۔ آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔“ حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپ نے کالج جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ ”میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی نمائش گاہ ہو۔ درس گاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔“ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر بیٹھ رہنے والی ہے۔ کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چیں۔

اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلی فون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم مسم بھیگی ملی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا آئے۔ ”آج فرنی میں اتنی شکریوں ہے؟ قد سے ہونٹ چپکے جا رہے ہیں۔ سجادہ۔۔۔ سجادہ بیٹی۔ کیا چینی اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک لقمہ لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔“

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا مگر اس وقت اس کے گال تھمارے تھے۔ کہنے لگی۔ ”شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید کیا خوب شاید۔

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ ”چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں، فرنی میں قد بڑھتی جا رہی ہے۔“ صحن سے اباں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے ان کی علت ہے۔ ”آپ تو تاحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا بھلا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں۔ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے۔ اس کا تو خیال کرنا چاہیے۔“ ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی کہنے لگے۔ ”اوہ یہ بات ہے۔ مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں۔۔۔“ اور وہ دونوں آپس میں کھسپ پھر کرنے لگے۔

آپا سارہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا ان سے ملنا تو کیا بات تک کو ناپسند کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں۔ کبھی کبھار سارہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری

طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو قائم کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتیں کر کے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی بول اٹھتی۔ ”ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔“ یہ کہہ کر باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا نوٹ آئی تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی سارہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ ”آج آپا آئی تھی؟“

سارہ نے ناخن پالش لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہارٹ بریک ہاؤس۔“

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا کہ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک پتھوئی انگڑائی لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں لیٹ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ ”آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے؟ دل توڑنے والا گھر۔۔۔ اس کے کیا معنی ہوتے؟“ پہلے تو آپا ٹھٹک گئی۔ پھر سنبھل کر ہنسنے لگی مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ ”اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔“ کہنے لگی۔ ”میں کیا جانوں۔“

میں نے اسے جلائے کو کہا۔ ”ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے۔“ میرا خیال ہے یہ بات اسے ضرور بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور حق بجا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ ”جیسا اچھا یہ بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاڈ بنانا آتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میں کیا جانوں۔ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔“ ہنس کر کہنے لگے۔ ”آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟“ میں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ پھر بولے۔ ”نہیں۔ ابھی تو لڑکی ہو۔ شاید کسی دن لڑاکا بن جاؤ۔“ اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ ”دیکھو جیسا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک مجھ سے لڑ سکے اور نہ آکٹائے۔“ میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ ”فروٹ سلاڈ کیا ہوتا ہے بھائی جان؟“

بولے۔ ”وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا۔“ میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی۔ پھر کہنے لگے۔ ”وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ یہاں تو ہے نا ہم فرنی کھا کھا کر آکٹا گئے۔“

میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی

نعمت خانہ۔ پڑھ رہی تھیں۔ اس دن کے بعد روزِ ملائکہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاڈ بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس جاتا تو جھٹ فروٹ سلاڈ کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چیخنے کی خاطر میں نے بدو سے پوچھا۔ ”بدو بھلا بو جھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟“

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چکا دیا۔ میں نے کہا۔ بدو جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو۔ اس کھانے کا کیا نام ہے۔“

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے غصے سے گھورا تھا۔

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پر بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جیسے ہم سب سا جو باجی کہا کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے ہمارے گھر آٹھریں۔ سا جو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھما جو باجی۔ چھما جو باجی چیختا پھرتا اور کہتا۔ ”ہم تو چھما جو باجی سے بیاہ کریں گے۔“

باجی کہتی۔ ”شکل تو دیکھو اپنی۔ پہلے منہ دھو آؤ۔“ پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کلی کلی آنکھوں کے گوشے مسکراتے اور وہ پنچم تان میں پوچھتی۔ ”ہے نا بھائی جان۔۔۔!“

باجی کے منہ سے ”بھئی جان۔“ ایسا بھلا سنائی دیتا تھا کہ میں خوشی سے پھولی نہ ساتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا بھائی صاحب کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر صاحب جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی صاحب کی جگہ جا آن کہہ کر وہ اس سادے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ جا آن کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جا آن کہہ کر وہ ایسی کلی کلی آنکھوں میں مسکراتی کہ سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے بھائی صاحب اور باجی کے بھائی جان میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہو گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھینا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج اور کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی۔ ”بھائی جان ایک بورڈ لگے گا۔“ یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے۔ ”کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟“ باجی بول اٹھتی۔ ”آپا سے پوچھئے۔“ بھائی کہتے۔ ”اور تم۔۔۔“ باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی۔ بھنوسیں سنالیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی ہو جاتی پھر کہتی۔ ”اؤ نہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔“ بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے۔ ”نکل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟“ وہ جواب دیتی۔ ”میں نے کہا چلو بھی جا آن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ وہ مجھ سے ہار گئے۔“ اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھروں سے رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان یورپی خانے ہی میں بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھما جو باجی چھما جو باجی کہتا ہوا باجی کا پلو پکڑے اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کشتی تھی۔ ”بھائی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرنی کی پلیٹ مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائی تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا۔ ہے نا بھی جا آن۔“ ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاڈ کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھایا۔ پیٹھ اس کے آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ ”لےجئے بھائی جا آن!“ اس نے آنکھوں میں ہنسنے ہوئے کہا۔ ”آپ بھی کیا کہیں گے کہ سا جو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔“

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا۔ ”خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بتایا ہے؟“ باجی نے آپا کی طرف آنکھوں سے دیکھا اور ہنسنے ہوئے کہا۔ ”سا جو باجی نے اور کس نے بھی جا آن کے لیے۔“ بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ ”میں بتاؤ بھائی جان۔۔۔“ آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باہر آپا انگلی کے قریب کھڑی تھی۔ بھائی جان نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی۔ ”چھوڑیئے چھوڑیئے۔“ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے بدو بھی نہیں ادھر ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ ”آج ایک حند نا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟“ بھائی جان بولے۔ ”واہ یہاں لگ لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو۔“ غالباً انہوں نے باجی کی طرف زر سے پیر چلایا ہو گا۔ وہ بتاؤٹی غصے میں چلائی۔ ”وہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں۔“ بھائی جان معاً بول اٹھے۔ ”تو کیا ہاتھ سے۔۔۔“ ”چپ

خاموش۔" باہی چیختی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑو دھکڑھکی دے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ "آپا اندر بھائی جان باہی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھینے لگا۔ آپا کارنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ بہت بے کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا وہ کہنے لگا۔ "اماں کہاں ہے؟" اور اماں کو بلانے کے لیے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھالیا اور باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاڈ والی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنپے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باہی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باہی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی جان بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے سوا ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے۔ "بدو سا جو باہی سے بیاہ کرے؟"

"اونہ۔" بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا۔ ہم تو چھابو باہی سے بیاہ کریں گے۔" اماں نے پوچھا۔ "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا۔ "بیٹاؤں آپا کیسی ہے۔۔۔ پھر چولے میں جلے ہوئے ایلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔۔۔ ایسی۔ اور چھابو باہی روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے۔۔۔ ایسی۔" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "جہاں یاد ہے۔" بھائی نے کہا۔ پھر جب باہی کسی کام کے لیے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے۔

"نہ جانے اب بجلی کا کیا ہو گیا ہے۔ جلتی بجتی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم آواز میں کہا۔ "اف کتنی سردی ہے۔" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولے کے سامنے جا بیٹھے اور سلگتے ہوئے ایلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے۔ "ممائی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے ایلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھتی۔ کیوں سجدے۔"

آپا پرے سر نکلتی تھی تو چھین سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ۔ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔"

نفرت

عجب واقعات تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک معمولی سا واقعہ نازی کی طبیعت کو ایک سخت قطعی طور پر بدل دے، یہ میرے لیے بے حد حیران کن بات ہے۔ اس کی یہ تبدیلی میرے لیے معجزہ ہے۔ چونکہ اس واقعہ سے پہلے مجھے یقین تھا کہ اس کی طبیعت کو بدلنا قطعی ناممکن ہے۔ اس لیے اب میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ نازی وہ نازی ہی نہیں رہی جو بچپن سے اب تک میری سہیلی تھی۔ جیسے اس کی اس تبدیلی میں انسان کی روح کی حقیقت کا بھید چھپا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک بہت ہی معمولی واقعہ تھا یعنی کسی بھدے سے بد نما آدمی سے خدا واسطے کا بغض محسوس کرنا۔۔۔ کتنی عام سی بات ہے۔

سہیلی کے علاوہ وہ میری بھالی تھی۔ کیونکہ اس کی شادی بھائی مظفر سے ہو چکی تھی۔ اس بات کو تقریباً دو۔ ال گزر چکے تھے۔ مظفر میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور جالندھر میں وکالت کرتے ہیں۔ یہ واقعہ لاہور اسٹیشن پر ہوا۔ اس روز میں اور نازی دونوں لائل پور سے جالندھر کو آ رہی تھیں۔

ایک چھوٹے سے درمیانے درجے کے ڈبے میں ہم دونوں اکیلے بیٹھی تھیں۔ نازی پردے کی سخت مخالف تھی۔ برقعے کا بوجھ اٹھانا اس سے دو بھر ہو جاتا تھا۔ اس لیے گاڑی میں داخل ہوتے ہی اس نے برقع اتار کر لپیٹا اور سیٹ پر رکھ دیا۔ اس روز اس نے زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس پر طلائی حاشیہ تھا۔ زرد رنگ اسے بہت پسند تھا اور اس کے گورے گورے جسم میں گلابی صلب پیدا کر دیتا تھا۔

اس کی یہ بے پردگی اور بے باکی مجھے پسند نہ تھی۔ مگر اس بات پر اسے کچھ کسنا بے کار تھا۔ اتنے جاتے لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے مگر وہ اپنے خیالات میں یوں مگن تھی جیسے جنگل میں تنہا بیٹھی ہو۔ دو تین گھنٹے تو یوں ہی گزر گئے مگر لاہور کے قریب جانے کو نسا اسٹیشن تھا، جہاں سے

دو نوجوان لڑکے سوار ہوئے۔ مجھے تو کسی کالج کے طالب علم نظر آتے تھے۔ ان لڑکوں نے ہر اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر ہمیں تاڑنا شروع کر دیا۔ ہمارے ڈبے کے سامنے آکھڑے ہوتے اور متبسم نظروں سے ہماری طرف دیکھتے۔ پھر آپس میں باتیں کرتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے۔ نازلی ویسے ہی بے باکی سے کھڑکی میں بیٹھی رہی بلکہ میرا خیال ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ نوجوان اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے لیے اس کی یہ بے نیازی بے حد پریشان کن تھی۔ میں کچھ شرم اور کچھ غصہ محسوس کر رہی تھی۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

میں نے کہا۔ ”نازلی برقع پہن لو۔ دیکھو لڑکے کب سے تمہیں تاڑ رہے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ اس نے چونک کر کہا، پھر مسکرا دی۔ ”دیکھنے دو۔ ہمارا کیا لیتے ہیں۔ آپ ہی آگیا جائیں گے۔ بے چارے۔“

”مگر برقع اوڑھ لینے میں کیا حرج ہے؟“

”اگر برقع اوڑھنے سے لوگ یوں گھورتا چھوڑ دیں تو شاید عورتیں برقع اوڑھنا ترک کر دیں۔ برقع پہن لوں تو یہی ہو گا کہ سامنے کھڑے ہونے کی بجائے اوہرا اوہر منڈلاتے پھریں گے۔“

”تم بھی حد کرتی ہو۔“

”میں کبھی ہوں نجی ایمان سے کہنا۔ کیا تم اپنے آپ کو چھپانے کے لیے برقع پہنتی ہو؟“ وہ مجھے نجی کہا کرتی تھی۔ چونکہ اس کے خیال کے مطابق عجم النساء گنگنا نام تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”اچھا مان لیا کہ تم واقعی اپنے آپ کو چھپانے کے لیے برقع پہنتی ہو۔ چلو مان لیا برقع پہن کر تم لوگوں پر یہ ظاہر کرتی ہو کہ اس برقعے میں چھپانے کے قابل چیز ہے۔ یعنی ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ یقین نہ ہو تو خود دیکھ لیجئے اور یہ برقع تو دیکھو۔“ اس نے میرے برقعے کو ہاتھ میں مسلتے ہوئے کہا۔

یہ ریشمی بوسکی فیتے جھالریہ تو برقع بذات خود خوب صورت ہے اور برقعے والی کیا ہوگی۔ اندازہ کر لیجئے۔ واہ کیا خوب پردہ ہے۔“

”تم خواہ مخواہ بگڑتی ہو۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”بگڑنا تو خیر ہو گا۔ مجھے تمہاری طرح بننا نہیں آتا۔“

”پگلی کبھی عورت بھی پردے میں رہ سکتی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ عورتوں نے پردے کو بھی زیبائش بنادیا ہے۔ آخر جو بات ہے اسے ماننے میں کیا حرج ہے؟“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

”تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔“ میں نے بگڑ کر کہا۔

”لو اور سنو۔ جو ہم کہیں وہ تو ہوا مذاق اور جو آپ کہیں وہ حقیقت ہے۔“

”اچھا بابا محاف کرو۔ بھول ہوئی۔ اب برقعہ تو اٹھا لو کیا ان درختوں سے بھی پردہ کرو گی؟“

”تمہارے خیالات بہت عجیب ہیں۔“ میں نے برقعہ اتارتے ہوئے کہا۔ اسٹیشن بہت دور رہ

گیا تھا اور گاڑی ایک وسیع میدان سے گزر رہی تھی۔

”عجیب۔۔۔ ہاں عجیب ہیں۔ اس لیے کہ وہ میرے اپنے ہیں۔ اگر میں بھی تمہاری طرح سنی سنائی باتیں شروع کر دوں تو تم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہو۔“

”سنی سنائی۔۔۔؟“

”ہاں سنی سنائی۔ اس لیے کہ یہ باتیں ظہیر صاحب کو بہت پسند ہیں اور تم چاہتی ہو کہ وہ تمہیں چاہیں۔ تمہارے میاں جو ہوئے۔ یہ سنہری چوڑیاں ہی دیکھو۔ یاد ہے تم سنہری چوڑیوں کو کیسی نفرت کی نظر سے دیکھا کرتی تھیں؟ مگر یہ انہیں پسند ہیں نا۔ اس لیے یہ بوجھ اٹھائے پھرتی ہو۔ ان کی محبت و محتاج جو ٹھہریں۔ ایمان سے کہنا۔ کیا یہ غلط ہے؟ مجھے تو ایسی محتاجی گوارا نہیں۔ تم ہی نے تو مردوں کا مزاج بگاڑ رکھا ہے۔ ورنہ وہ بے چارے۔“

”تمہیں بھی تو زور و رنگ پوارا ہے نا؟“

”ہاں ہے اور رہے گا۔ میری اپنی پسند ہے۔ میں اپنے میاں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں بننا چاہتی کہ جیسا جی چاہیں، نہ چاہیں۔ میں نے ان سے بیاہ کیا ہے۔ ان کے پاس اپنی روح گروی نہیں رکھی اور تم۔۔۔ تمہاری تو مرضی ہے ہی نہیں۔ تم تو ہوا کے رخ میں اڑنا چاہتی ہو۔“

دو گھنٹہ گاڑی نے جھٹکا کھلایا اور وہ لڑھک کر مجھ پر آگری۔

”یہ جھوٹ بولنے کی سزا ہے۔“ میں نے اسے جھپٹنے کو کہا اور ہم دونوں ہنس پڑیں۔ گاڑی اسٹیشن پر رک گئی۔ دونوں نوجوان گاڑی سے اتر کر ہمارے سامنے آکھڑے ہوئے اور نازلی کو تاڑنے لگے۔ اس نے دو ایک مرتبہ ان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر نفرت بھرا مسخر کھیل رہا تھا۔

”بے چارے۔“ اس نے دبی آواز میں کہا۔ ”مجھے تو ان پر ترس آتا ہے۔“ اور وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔

نہ جانے اس کی بے باکی اور بے پروائی دیکھ کر کیا کسی اور وجہ سے وہ اور بھی دلیر ہو گئے۔ پہلے تو آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ان میں سے جو زیادہ دلیر معلوم ہوا تھا ہمارے ڈبے کی طرف بڑھا۔ مگر نازلی کے انداز کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ رک گیا۔ ہاتھ سے اپنی نکلانی سنواری۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ رومال نکالا اور پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر اوہرا اوہر دیکھا اور آخر ہمت کر کے نازلی کے قریب آکھڑا ہوا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔۔۔“

میں تو ڈر کے مارے پیمنہ پیمنہ ہو گئی۔ مگر نازلی ویسے ہی بیٹھی رہی اور نہایت سنجیدگی سے اپنے لگی۔ ”ہاں صرف اتنی مہربانی فرمائیے کہ یوں سامنے کھڑے ہو کر ہمیں گھورے نہیں۔“

”مریہ۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس وقت نازلی کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں حیران ہو رہی

تھی۔ اس میں کتنی ہمت تھی۔ خیر نوجوان کارنگ زرد پڑ گیا اور وہ کھینا ہوا کرواپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ہمیں کیس نظر نہ آئے۔

ان دنوں نازلی کی طبیعت بے حد شوخ تھی مگر شوخی کے باوجود وہ کبھی کبھی ایسی سنجیدگی سے کوئی بات کہہ دیتی کہ سننے والا پریشان ہو جاتا۔ ایسے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نسوانی جسم کی تہ میں کوئی مردانہ روح جی رہی ہو۔ مگر اس کے باوجود کو مردوں سے دلچسپی نہ تھی۔ یعنی وہ مردوں کی طرف آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنے والی عورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اسے جذبہ محبت کے خلاف بغض تھا۔ مظفر بھائی دو سال کے عرصہ میں بھی اسے سمجھ نہ سکے تھے۔ شاید اسی لیے وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ نازلی انہیں اس قدر پیاری تھی۔ حالانکہ وہ ان کے رو بہو ایسی باتیں کہہ دینے سے کبھی نہ بچ سکتی تھی جو کسی عام خاوند کو سننا گوارا نہیں ہوتیں مگر وہ نازلی کی باتیں سن کر ہنسی میں نال دیتے تھے۔

لاہور پہنچنے تک میں نے منت سماجت کر کے اسے برقع پہننے کے لیے منالیا۔ رات کو آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ جالندھر جانے والی گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ ہم اس پلیٹ فارم پر جا بیٹھے جہاں سے ہماری گاڑی کو چلنا تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ یہاں وہاں کہیں کہیں کوئی مسافر بیٹھا آگے رہا تھا یا کبھی کبھار کوئی وردی پوش بابو یا قلی تیزی سے ادھر سے ادھر گزر جاتا۔ مقابل کے پلیٹ فارم پر ایک مسافر گاڑی کھڑی تھی اور لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ ”لا حول ولا قوۃ“

میں نے نازلی کو کہتے سنا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ”کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے انگلی سے ساتھ والے بچ کی طرف اشارہ کیا۔

بچہ پر بجلی برق کے نیچے دو جوان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”توبہ!۔۔۔! جانگلی معلوم ہوتے ہیں۔“ نازلی نے کہا۔

سانے بیٹھے ہوئے آدمی کی ہیئت واقعی عجیب تھی جیسے گوشت کا بڑا سالو تھرا ہو۔ سوجا ہوا چہرہ، سانولا رنگ، تنگ پیشانی پر دو بھدی اور کھنی، بھنویں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کے نیچے دو اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سانپ کی سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چھاتی اور کندھے بے تحاشا چوڑے تھے جن پر سیاہ لبا کوٹ یوں پھنسا ہوا تھا جیسے پھنسا جا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تنگ جسم میں بہت سی جسمانی قوت ٹھونس رکھی ہو۔

چہرے پر بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بھدی اور مکروہ تھیں۔ ”دیکھو تو۔۔۔“

نازلی بولی۔ ”اس کے اعضاء کس قدر بھدے ہیں؟ انگلیاں تو دیکھو۔“ اس نے جھرجھری لی اور اپنا منہ

پھیر لیا۔

”تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ جانگلی ہے تو پڑا ہو۔“ میں نے کہا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس کی نگاہیں بھٹک کر اسی شخص پر جا پڑیں جیسے وہ اسے دیکھنے پر مجبور ہو۔ ”اسے کھاتے ہوئے تو دیکھنا۔۔۔ توبہ ہے۔“ نازلی نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

”صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تاکہ اس کا دھیان کسی اور طرف لگ جائے مگر اس نے میری بات نہ سنی اور ویسے ہی گم صم بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ بھدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹ نفرت سے پیچھے ہوئے تھے۔

میں نے اسے کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اس کے برعکس کئی بار جب مظفر بھائی کسی دہشت ناک قتل کی تفصیلات سناتے اور ہم سب ڈر اور شوق کے مارے چپ چاپ بیٹھے سن رہے ہوتے، اس وقت نازلی بے زاری سے اٹھ بیٹھتی اور جھمکی لے کر کمرے سے باہر چلی جاتی۔

مگر اس روز اس کا ایک اجنبی کی انگلیوں اور کھانے کے انداز کو یوں غور سے دیکھنا میرے لیے باعث تعجب تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی شکل دیکھ کر مجھے خود ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ ”دیکھا نا؟“ میں نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔ ”تم جو بھائی مظفر کی انگلیوں پر ہنسا کرتی ہو۔ یاد ہے تم کہا کرتی تھیں، یہ انگلیاں تو سوئی کا کلم کرنے کے لیے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یاد ہے نا؟“

”توبہ ہے۔“ نازلی نے نحیف آواز میں کہا۔ ”اس کا بس چلے تو سب کو کچا ہی کھا جائے۔ کوئی مردم خور معلوم ہوتا ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بیٹھی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے اس سے کچھ کہنے کا خیال چھوڑ دیا۔ دیر تک میں ادھر ادھر دیکھتی رہی حتیٰ کہ میں نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

”مجھی چلو کہیں دور جا بیٹھیں۔ ضرور یہ کوئی مجرم ہے۔“

”پگلی۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر جانگلی کو دیکھتے ہی مسکراہٹ خشک ہو گئی۔ جانگلی اپنے دھیان میں بیٹھا ہاتھ دھو رہا تھا۔ واقعی اس کی انگلیاں سلاخوں کی طرح موٹی اور بے تکی تھیں۔ میرے دل پر نامعلوم خوف چھا رہا تھا۔ پلیٹ فارم میری آنکھوں میں دھندلا دکھائی دینے لگا۔ پھر دونوں نے آپس میں باتیں کرنا شروع کر دی۔

”شادی؟“ جانگلی نے کہا اور اس کی آواز یوں گونجی جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔ نازلی نے جھرجھری لی اور سرک کر میرے قریب ہو بیٹھی۔ مگر اس نے نگاہیں اس شخص پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے جنش کی طاقت سلب ہو چکی ہو۔

”کچھ حالات ہی ایسے ہو گئے کہ شادی کے متعلق سوچنا میرے لیے نہایت ناخوشگوار ہو چکا

جانگلی نے بات پھر شروع کی۔ بولا۔ ”وہ یوں بن سنور کرواں کھڑی تھی گویا اپنی قیمت چکانے آئی ہو۔ ایک زرد رنگ کا رے کی طرح بل کھایا ہوا دوپٹہ اس کے شانوں پر لٹک رہا تھا۔ سرنگ۔ اف۔! تمہیں کیا بتاؤں۔ اس کے بعد میں نے ظہیر الدین صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کی بیٹی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ یعنی میں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر وہ بہت بگڑے اور مجھے کوئی اور نوکری تلاش کرنی پڑی۔ مبینوں بغیر نوکری کے رہا۔ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ راجپوتانے میں نوکری آسانی سے نہیں مل سکتی۔“

”مگر اس میں انکار کی کیا بات تھی؟“ اس کے ساتھی نے کہا۔ ”آخر مکیگر تھی۔“

”بس یہی کہ مجھے بے پردگی سے بے حد نفرت ہے اور آج کل کا ہٹاؤ سنگھار مجھے پسند نہیں۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ کوئی لڑکی جو زرد دوپٹہ پہن سکتی ہے۔ میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ گھر کے کام کاج کو عار سمجھتی تھی۔ یہ آج کافیشن ہے۔ تم جانتے ہو آج کل لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ بن سنور کر مردوں کو بھانے کے سوالن کا اور کوئی کام ہی نہیں اور برتن مانگنے سے ہاتھ میلے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہاتھ دکھانے کی چیز ہوں۔ یہیں دیکھ لو، کتنی بے پردگی ہے۔ عورتیں یوں برقعے اٹھائے پھرتی ہیں جیسے جنگل میں شکاری ہندو قیں اٹھائے پھرتے ہیں۔“

اس کا ساتھی ہنس پڑا اور پھر ہنسنے ہنسنے کہنے لگا۔ ”یار! تم تو راجپوتانے میں رہ کر بالکل بدل گئے ہو۔“

”او نہ ہوں۔۔۔ یہ بات نہیں۔“ جانگلی نے کہا۔ ”پردے کا تو میں بچپن ہی سے بہت قائل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ گھر میں دو عورتیں مہمان آئیں۔ ایک تو خیر ابھی چکی تھی۔ دوسری یہی کوئی پچیس سال کی ہوگی۔ ان دونوں میں خود آٹھ نو سال کا تھا۔ خیر وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔“ وہ رک گیا۔ پھر آپ ہی آپ بولا۔ ”مجھے اس بات پر بے حد غصہ آتا تھا۔ اس لیے میں اکثر باہر مردانے میں ہی بیٹھا رہتا، یعنی میں نے ان کے روبرو جانا بند کر دیا۔ ایک دن ابانے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ پیغام اندر لے جاؤ۔ خدا جالے کیا پیغام تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے کوئی زیور دیا تھا کہ انہیں دکھا دوں۔ شاید ان مہمانوں نے وہ زیور دیکھنے کے لیے منگوایا ہو۔ میں نے ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت صحن میں اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ اماں کہنے لگی۔ حمید اندر چلے آؤ۔ اسے تم اندر کیوں نہیں آتے؟ تم سے کوئی پردہ ہے؟ میں یہ سن کر ابا کے پاس واپس چلا آیا۔ میں نے کہا۔ ابا جی میں نہیں جاؤں گا۔ وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی۔ یہ بات میں نے اس قدر جوش اور غصے میں کہی کہ ابا بے اختیار ہنس پڑے۔ اس کے بعد دیر تک گھر والے میری اس بات پر مجھے چھیڑتے

ہے۔ میری شادی ہوتے ہوتے رک گئی۔ اسی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔“

”آخر کیا بات تھی؟ ہم بھی سنیں۔“ اس کے ساتھی نے کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بس میری اپنی بے ہنگم طبیعت۔“ وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی بہت بھونڈی تھی۔

نازی سرک کر میرے قریب ہو گئی۔

”میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔“ جانگلی نے کہا۔ ”تمام جھگڑا میری طبیعت کی وجہ سے ہی تھا۔ میری منگیتر میرے دوست ظہیر الدین صاحب کی لڑکی تھی۔ ظہیر الدین ہماری فرم کے منیجر تھے اور ان کا تمام کام میں ہی کیا کرتا تھا۔ چونکہ ان کے مجھ پر بہت سے احسانات تھے، میں نے انکی بات کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ میرے حالات کچھ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ شادی کا بکھیرا میرے لیے چنداں مفید نہ تھا۔ خیر میں نے سنا تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور سچ پوچھو تو خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا میں قطعی ناپسند کرتا ہوں۔“

”عجیب انسان ہو۔“ اس کے ساتھی نے کہا۔

”عجیب ہی سہی مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بد صورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں یہ بات نہیں۔ مگر کسی حسین لڑکی کو بیاہ لانا مجھے پسند نہیں۔“

”اوہ بڑا گھمنڈ ہے انہیں۔“ نازی نے میرے کان میں کہا۔

”خیر۔“ جانگلی نے بات جاری رکھی۔ ”ایک دن کی بات ہے کہ مجھے بے موقع ظہیر الدین کے مکان پر جانا پڑا۔ یاد نہیں کہ کیا بات تھی۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ کوئی ضروری کام تھا۔ چونکہ عام طور پر میں ان کے مکان میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بہر حال ایک چھوٹی سی لڑکی باہر آئی اور کہنے لگی، آپ اندر چل کر بیٹھے۔ وہ ابھی آتے ہیں۔ خیر میں ملاقاتی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً دروازہ آپ ہی کھل گیا اور کچھ دیر کے بعد ایک نوجوان لڑکی کھلے منہ دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ پہلے تو وہ یوں کھڑی رہی گویا اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے لڑکیاں مردوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں۔ پھر میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر چلی گئی۔ میں اس کی بے باکی اور ہٹاؤ سنگھار کو دیکھ کر غصے سے کھول رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ مجھے اب بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ کسی کو۔۔۔“ اس نے گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔

نازی نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر چیخ سی ماری۔ مگر ذرا نقابوت سے اس کی آواز ان دونوں تک نہ پہنچ سکی۔ ورنہ خدا جالے وہ کیا سمجھتے۔

رہے۔ البتہ زرد رنگ سے مجھے ان دونوں نفرت نہ تھی۔ طبیعت بھی عجیب نہ ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری طبیعت تو ایسی ہے جیسی مداری کا تھیڑا۔“ اس کے ساتھی نے ہنسنے ہوئے کہا اور وہ دونوں دیر تک ہنسنے رہے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھے۔

اس وقت پہلی مرتبہ جانگی کی نگاہ نازی پر پڑی جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی اور آنکھیں نفرت یا خدا جانے کس جذبے سے سرخ ہو گئیں۔ نازی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں جانگی پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ انہیں وہاں سے ہٹانا چاہتی ہو مگر ہٹانہ سکتی ہو اور تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نازی میں بٹنے جلنے کی سادگت نہ رہی ہو۔

ایک لحظہ جانگی مڑا اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اس وقت نازی عجیب بے بسی کے ساتھ مجھ سے گلی بیٹھی تھی۔ گویا اس میں بالکل جان نہ ہو۔

کچھ دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا۔ عین اس کے قریب سے ایک قلی گزرا۔ وہ ٹھنک گئی اور اس نے اپنا برقعہ منہ پر ڈال لیا۔

”اگر مجھے ایک خون معاف کر دیا جائے تو میں اسے یہیں گولی مار دوں۔“ نازی نے کہا۔

”کسے؟“ میں نے پوچھا۔

”کتنا بڑا ہے۔“

”اوہ تمہارا مطلب اس شخص سے ہے مگر تم خواہ مخواہ اس سے چڑ رہی ہو۔ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ اپنے اپنے خیالات ہیں۔ تمہیں اپنے خیالات پیارے ہیں اسے اپنے۔“

”بڑی طرف داری کر رہی ہو۔“ وہ بولی۔

”اس میں طرف داری کی کیا بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں تو آپ سنی سنائی باتوں سے نفرت ہے۔ اس کے خیالات بھی مانگے کے نہیں۔ باقی رہی شکل، وہ تو اللہ میاں کی دین ہے۔۔۔ ایمان کی بات پوچھو تو مجھے تو تم دونوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔“

”جی ہاں۔ تمہارا بس چلے تو ابھی میری ہانہ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں ڈے دو۔“

”لا حول ولا۔۔۔“ میں نے کہا۔

”لا حول ولا کی اس میں کیا بات ہے۔۔۔؟ میں کہتی ہوں اس کی بیوی اس کے ساتھ کیسے رہ سکے گی؟“

گاڑی پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اندر بیٹھے۔ ہم نے انٹر کا ایک چھوٹا سا زانہ ڈبہ تلاش کیا اور اس میں جا بیٹھے۔ نازی نے برقعہ اتار کر پلیٹ کر بیچ پر رکھ دیا اور خود کو نے میں بیٹھ گئی۔

حالانکہ ڈبے میں بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس نے کھڑکی کا تختہ جڑھا دیا۔ میں دوسرے پلیٹ فارم پر ہجوم دیکھنے میں محو ہو گئی۔ میرا خیال ہے ہم بہت دیر تک یوں خاموش بیٹھے رہے۔ ”توبہ ہے۔“

نازی کی آواز سن کر میں چونک پڑی۔ دیکھا تو میرے پاس ہی وہ جانگی ہاتھ میں سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس لمحے میں نازی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ سامنے اسے دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس نے پلیٹ کر دوپٹہ میرے سر سے کھینچ لیا اور ایک آن میں خود کو اس میں پلیٹ کر گھڑی سی بن کر پڑ گئی۔

”لا حول ولا قوہ“ جانگی کی بھدی آواز سنائی دی اور وہ اٹنے پاؤں لوٹ گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ غلطی سے ہمارے ڈبے میں چلا آیا تھا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو اپنی غلطی کو جان کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک نازی اسی طرح منہ سرپینے پڑی رہی۔ میرے دل میں عجیب عجیب ہول اٹھنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ خیر جوں توں ہم خیریت سے جالندھر پہنچ گئے۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی میرے کمرے میں آئے۔ ان کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار تھے۔ کہنے لگے۔ ”نجمہ! نازی، کیا ہو گیا ہے؟ کس مجھ سے ناراض تو نہیں؟“

”مجھے تو معلوم نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا ہوا؟“

”مدا جانے کیا بات ہے؟ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں جی ہاں۔ جی ہاں۔ نازی اور جی ہاں؟ میں سمجھا شاید مجھ سے ناراض ہے۔“

”نہیں ویسے ہی اس کی طبیعت ناماز ہے۔“

”طبیعت ناماز ہے؟“ انہوں نے حیرانی سے کہا۔ ”اگر طبیعت ناماز ہوتی تو کیا وہ بیٹھی باورچی خانے کا کام کرتی۔ وہ تو صبح سے حشمت کے پاس باورچی خانے میں بیٹھی ہے۔ کہتی ہے، میں کھانا پکانا بیکھوں گی۔ منہ ہاتھ تک نہیں دھویا۔ عجیب معلولہ ہے۔“

”وہ ہم نہ سمجھتے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ میں نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

”وہم کی اس میں کیا بات ہے۔ تم جانتی ہو اس کی طبیعت حراب ہو تو اس گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور باورچی خانے کے کام سے تو اسے چڑ ہے۔ آج تک وہ کی باورچی خانے میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ خدا جانے کیا بھید ہے۔“

وہ دو قدم چل کر لوٹ آئے۔

”اور مزے کی بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ جانتی ہو نا کہ اسے زرد رنگ کتنا پیارا ہے۔ میں

نازی نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ دیوانہ وار اٹھی۔ کھوئی سے لپک کر دوپٹہ اتار لیا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اسے چولہے کی طرف پھینک دیا جیسے کوئی بچھو ہو اور دوڑ کر حشمت کی چادر کو پکڑ لیا جو دوسرے دروازے کی پٹ پر لٹک رہی تھی اور اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا۔ زرد دوپٹہ چولہے میں جلنے لگا۔ اسی وقت بھائی صاحب اندر داخل ہوئے مگر وہ اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموش ہی کھڑے رہے۔ آخر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ نازی کہاں ہے؟

میں نے نازی کی طرف اشارہ کیا جو منہ لپیٹ کر کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”نازی!۔۔۔!“ انہوں نے حیرانی سے دہرایا۔

وہ نازی کے قریب گئے۔ ”یہ کیا مہلت ہے؟ چلو۔۔۔ باہر حمید انتظار کر رہا ہے۔“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر نحیف آواز میں کہنے لگی۔ ”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ وہ بولے۔

انفاقاً ”بھائی جان کی نظر چلتے ہوئے دوپٹے پر پڑی۔“

”نازی!۔۔۔!“ انہوں نے دوپٹے کی طرف دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

نازی نے سر ہلا دیا اور چپے سے دوپٹے کو پوری طرح چولہے میں ڈال دیا۔ بھائی نازی کی اس

تبدیلی پر بہت خوش دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نازی کی طبیعت بہت سنور گئی ہے۔ بات ہے

بھی درست۔ چونکہ اس کی طبیعت میں وہ ضد اور بے پاک شوخی نہیں رہی، مگر کبھی کسی وقت انہیں

اکٹھے دیکھ کر میں محسوس کرتی ہوں۔ گویا وہ نازی کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔

نے اس مرتبہ ایک نہایت خوب صورت زرد دوپٹہ اس کے لیے خریدا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زرد دوپٹہ دیکھ کر خوشی سے ناپے گی۔ مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہیں کھوئی سے لٹک رہا ہے۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگی۔ ”اچھا ہے۔ آپ کی مہربانی ہے۔“

نازی کے منہ سے یہ بات نکلے۔ سوچو تو۔۔۔ عجیب معاملہ ہے کہ نہیں۔“ وہ بولے۔

نازی کی مکمل اور فوری تبدیلی پر ہم سب حیران تھے۔ مگر وہ خود بالکل خاموش تھی۔ اسی طرح ایک دن گزر گیا۔ اسی شام بھائی مظفر تار ہاتھ میں لیے باورچی خانے میں آئے۔ ہم دونوں وہیں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ ”جانتی ہو یہ کس کا تار ہے۔ خالہ فرید کا بڑا لڑکا حمید تھا نا۔۔۔ جو چند رہ سال کی عمر میں راجپوتانے بھاگ گیا تھا؟ وہ واپس آ گیا ہے۔ اب وہ بہن کو ملنے دہلی جا رہا ہے۔ یہ تار اس کا ہے۔ کل صبح نوبت بچے یہاں پہنچے۔ کچھ ایک گھنٹوں کے لیے یہاں ٹھہرے۔“

”کون حمید؟“

”تم کو یاد ہو گا۔ میں اور حمید اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔“

نازی کے ہونٹ ہلے اور اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ ہاتھ سے پیالی گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

اگلے دن نوبت بچے کے قریب میں اور نازی باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ چائے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی مگر یوں بیٹھی تھی جیسے اسے کسی بات کا دھیان ہی نہ ہو۔ پاس ہی کھوئی پر اس کا زرد دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ بھائی مظفر نے زبردستی اسے وہ دوپٹہ لینے پر مجبور کر دیا تو اس نے لے لیا لیکن پسینے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے میلے تھے۔ اس وقت وہ میری طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔

باہر برآمدے میں بھائی صاحب کسی سے کہہ رہے تھے۔

”تم ہمیں بیٹھو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔ نہایت لوب سے بھائی کو سلام کرنا۔“

”اچھا تمہاری مرضی۔“ کسی نے بھدی آواز میں کہا جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا

ہو۔

”وہی۔“ میرے دل میں کسی نے کہا اور جانگلی کی شکل میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے دبے پاؤں اٹھی۔

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اسی وقت بھائی صاحب حمید سے کہہ رہے تھے۔ ”آؤ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔“

میں نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

نبی

ہائے ری کیا پیارا بچہ تھا آپ کا۔ بھورا بھورا۔ جیسے زرد روئی کا گلاب۔ چھوٹے چھوٹے گلے سے ہاتھ اور اتنا بڑا سر۔ جی چاہتا تھا چھاتی سے لگائے پھروں۔ پر توبہ۔۔۔! بھائی جان کی اماں نے کتنا پاکھنڈ چلایا تھا! بڑی آئی تھی ننھے کی مالکہ۔ ہونہ۔۔۔ گویا اپنی گرہ سے خرید اٹھا اسے۔ توبہ اس بڑھیا کی باتیں۔ مجھے تو ہنسی آ جاتی سن کر۔ دانت ہوں تو کوئی بات بھی کرے۔ یوں بولتی تھی جیسے بگڑی ہوئی چکی بھجھ بھجھ۔ بولی۔ ”بھینہ کونہ دو۔ گراندے۔“ بڑی آئی ننھے کی رکھوالی۔ نہ جانے کیا سمجھتی ہے وہ مجھے۔ جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں۔ ہونہ۔ بھائی جان نے بہتیرا کہا۔ لینے دو فیضو کو ذرا۔ کیا حرج ہے۔ لیکن وہ بڑھیا۔۔۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ ننھے کو اٹھا کر کوشے پر چڑھ جاؤں اور۔۔۔ اور۔۔۔ ہائے میں کیوں بھٹکتی اسے۔ کلبجے سے نہ لگائے رکھتی۔ ایسا پیارا بچہ ہے نبی نبی کالج سی آنکھیں۔ زعفرانی رنگ اور پھر لاکھے سنہری بال۔ جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتی ہی رہوں۔ گدا تھا گدا۔ ذراندہ روتا تھا۔ بس روئی صورت بنائی ہونٹ نکالے اور آنکھیں۔۔۔! اس وقت اس کی آنکھیں۔۔۔ جیسے نیل میں گہرا رنگ گھول دیا ہو۔ اور پھول سی آنکھیں۔ جیسے کوئی سبز پھول کھل گیا ہو۔ روناتو جانتا ہی نہ تھا۔

ننھے کی آنکھیں تو اک تماشائی ہوئی تھیں۔ جو کوئی آتا، اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کہتا۔ نہ جانے کس پر گیا ہے یہ ننھا۔ ہمارے خاندان میں تو کسی کی آنکھ نبی نہیں اور پھر ایسی نبی۔۔۔ یہ بات بھی سچی تھی۔ آپا کا بیاہ اپنے ہی خاندان میں ہوا تھا۔ بھائی جان، آپا اور میرے چچو بھی زاد تھے اور ہمارے گھروں میں تو سب ”کل ننھے“ تھے۔ بھائی جان کی آنکھ کبھی کبھی شریقی بھٹک مارتی تھی۔ وہ بھی صرف مسکراتے وقت۔ مگر وہ مسکراتے ہی کہاں تھے۔ آپا کی تو گھور کالی تھیں سیاہ اور توبہ۔۔۔! کیسی موٹی موٹی۔ آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آپا نظر بھر کر دیکھتی تو دوسرا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ میں تو سن ہو جاتی تھی۔ پھر نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ جاتا اور میں چیختی۔ ہم پر تو نہ نکالا

لے کوئی آنکھیں۔ اس بات پر بھائی جان مجھے چھیڑتے۔ ”نہ بھئی صفی۔ فیضو کونہ دکھایا کرو آنکھیں۔“ ”واہ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔“ میں کہتی اور وہ بن کر کہتے۔ ”توبہ فیضو تمہاری آپا نظر بھر کر دیکھتی ہے تو اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ اور تم۔۔۔ تم دیکھتی ہو تو پھوار پڑنے لگتی ہے۔“ ”اوں۔“ میں چڑ کر کہتی۔ ”کہاں پڑتی ہے پھوار۔ میں جانتی ہوں بتاتے ہیں آپ۔“ پر بھائی جان کا اور معاملہ تھا۔ ان کی بات مجھے بری نہ لگتی تھی اور وہ صرف مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے۔ گھر میں تو انہیں چپ لگی رہتی تھی۔ آپا سے کبھی یوں بات بھی نہ کی تھی جیسے دولہا دولہن سے کیا کرتا ہے۔ پھر وہ کچھ اور کہتے تو میں چیختی۔ ”بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی۔“ پر میرے دل میں ذرا بھی غصہ نہ آتا۔ ویسے میں یوں منہ موڑ لیتی جیسے۔۔۔ پر نہ جانے وہاں سے چلے آنا کیوں میرے لیے اس قدر مشکل ہو جاتا تھا۔ میں جانو۔۔۔ مجھے نہیں پتہ کیوں۔۔۔

توبہ۔۔۔! بھائی جان کی اماں نے ننھے کی آنکھوں پر کیا پاکھنڈ چلایا تھا۔ بولی۔ ”یہ انگریز کہاں سے آ گیا۔“ ”اوئی اماں دیکھو تو۔۔۔“ ”نجمہ چلائی۔“ ”اب تو ہری ہوئی جا رہی ہیں۔ توبہ۔۔۔!“ اور آپا بولتی۔ ”آنکھیں نہ ہوئیں گر گٹ ہوں۔“ ”ادھر ہماری ملازمہ بانو شور مچاتی۔“ ”دیکھو تو بی بی کیسا جعفرانی رنگ ہے اور بال تو سونے کی تاریں ہیں۔“ ”اونہوں۔“ ”بڑھیا بڑھاتی۔“ ”یہ تو لاکھے سنہری ہیں۔“ آپا کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں شرما اور چڑ جاتی تھی۔ شرمانے کی بات ہی کیا تھی اس میں۔ آخر صبی کے ہاں بچے ہوتے ہیں۔ پر آپا کا پہلا ننھا تھا۔ اس وقت آپا کی آنکھیں اور بھی گھور ہو جاتیں نہ گھٹا چھا جائے۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی یا چرے پر دوپٹہ ڈال کر چھپ جاتی۔ آپا بھی عجیب ہے۔ پر میں ہانوں، گھبرانے کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتی بھی تھی لیکن چھپ چھپ کر۔ پھر کوئی نہ کوئی چلا اٹھتی۔ ”نہ جانے کس پر گیا ہے ننھا۔ پورا انگریز ہے انگریز۔“ ”یا کوئی ناواقف آئی تو وہ ننھے کو دیکھ کر غور سے آپا کی طرف دیکھتی۔ اور پھر ننھے کی طرف جیسے حیران ہو رہی ہو۔ جیسی تو آپا کو لوگوں کا آنا جانا پسند نہ تھا اور وہ بات بات پر کہہ اٹھتی۔“ ”توبہ میرا سر کھا جاتی ہیں۔“

ننھے کی آنکھوں۔۔۔ رنگ اور بالوں کے بارے میں اگر کوئی غلاموش تھا تو وہ بھائی جان تھے۔ ’سی نے ننھے کی آنکھوں یا صورت کا ذکر چھیڑا اور وہ ہانے ہانے اٹھ کر وہ گئے جیسے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو اس بات میں۔ بات سن کر ان سنی کر دیتے تھے اور گھر میں تو بس یہی اک بات چلتی تھی۔ ان دنوں۔ ننھے کی آنکھیں، رنگ اور بال۔۔۔ سبھی اسی بات کے دیوانے ہو رہے تھے۔ بھائی جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ننھے کی طرف۔ اسے پیار بھی کرتے تو دھیان کسی اور طرف ہوتا۔ میری طرف یا جیسے دیوار سے پار کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ ان آنکھوں کا بھید پہانتے ہوں۔ یا جیسے اسے اپنے آپ سے چھپا رہے ہوں۔ یہ بات نہ تھی تو پھر وہ ہماری باتیں سن کر

دکھی گئیں ہو جاتے تھے جیسے پھوڑے کو چھینر دیا جائے اور اس وقت مسکراتے بھی تو وہ کیا مسکراہٹ ہوتی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی۔

اس روز وہ کس قدر گھبرائے جب لہاں کئے گئیں۔ ”بھینہ“ کس پر گیا ہے نہھا؟“ اور کنکھیں سے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ یہ سن کر بھائی جان گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ پھر آپا بولی۔ ”مجھے کیا معلوم۔ انہیں سے پوچھئے۔“ اس نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور لگی مسکراتے۔ بھائی جان کارنگ اڑ گیا۔ بڑی لہاں کب چھوڑنے والی تھی۔ بولی۔ ”کیوں جلیل کس پر گیا ہے نہھا؟ دیکھ ذرا۔“ بھائی بولے۔ ”لہاں میں پوچھتا ہوں۔ وہ میرا پن کہاں گیا۔ جانے کس نے اٹھالیا ہے۔ کیا مصیبت ہے۔“ ”اے ہے مل جائے گا۔“ ”کہاں مل جائے گا۔“ ”تو ذرا اپنے بیٹے کو تولے۔ دیکھ تو تیری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔“ ”لیکن گیا کہاں میرا پن؟“ بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”توبہ یہ آج کل کے لڑکے۔“ بڑی لہاں بڑبڑاتی۔ ”بڑے بیٹے کے نام سے تو چڑ ہے انہیں۔ اور اس کی لہاں کو چاہے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔“ آپا تڑپ کر مڑی۔ اس نے نگاہ بھر کر بڑی لہاں کی طرف دیکھا۔ توبہ وہ ایک نگاہ۔۔۔ جیسے چٹخیں بھری ہوئی ہوں۔ پھر آپا نے منہ موڑ لیا۔ بھلا بڑی لہاں کی طرف یوں دیکھنے سے فائدہ۔ آپا بھی تو بگی ہے۔ وہ بڑھیا تو مٹی کی بنی ہوئی ہے۔۔۔ مٹی کی۔ وہ تو کئی ہوئی بات کو بھی نہ سمجھے جب تک اس بات کو بار بار ڈھولک کی طرح نہ پیو۔ نہ جانے کبھی بوڑھی ہو کر مٹی کی کیوں ہو جاتی ہیں۔ ہائے۔۔۔ مجھے تو موت آجائے بڑھاپا نہ آئے۔ میں تو جیتے جی مر جاؤں۔ یوں مر کر جینے کا مزہ؟

آپا کے دکھ کو کون نہیں جانتا۔ اب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لے تو۔۔۔؟ پر کبھی جانتے ہیں۔ گو آپا نے کبھی ہونٹ تک نہیں ہلائے۔ بس یہی ہے نا، کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو آپا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس گھور گھٹا کو چھپالیا اور کسی نہ کسی طرف اکیلے میں جا بیٹھی۔ یا بھائی جان نے آپا کے شوق بھرے سوال کے جواب میں یوں منہ پھیر کر کسی معمولی سی بات کو چھینر دیا اور آپا کا سوال ان سا کر دیا اور پھر بے اعتنائی سے باہر نکل گئے۔ تو ایک آن کے لیے آپا کی آنکھیں چٹکیں اور پھر تیرنے لگیں اور اس نے منہ موڑ کر اس چھوٹی جوڑے کو چھپالیا اور تو اور مجھ سے بھی چھپاتی تھیں۔ وہ سمجھتی ہوں گی، میں بچی ہوں۔ مجھے ان باتوں سے کیا۔ کیوں میں کیا بچی ہوں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں اور ابھی بچی۔۔۔ وہ تو خود بچی ہے۔ ایک ذرا سے میاں کو اپنا نہ سکی۔ کبھی اندھے ہیں۔ کیا آپا اور کیا کوئی اور۔ اسی بھی تو چھپایا کرتی ہے مجھ سے بات۔ لیکن میں بھی بات جانے بنا نہیں رہتی۔ کیوں رہوں؟ پھر وہ چھپاتے کیوں ہیں مجھ سے؟ وہ نہ چھپائیں تو میں بھی نہ کریدوں۔ آپا تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ جہی تو لڑا کرتی ہے مجھ سے۔ فیض تو بھی کریدے بنانہ رہ سکی۔

توبہ یوں کسی کو بھرے گھر میں سے خارج کر دیتا۔ نہ جانے کیسے ہیں یہ لوگ؟ کیا امی اور کیا ابا۔ کتے ہیں۔۔۔ کھاؤ، پیو، ہنس، کھیلو۔ لیکن گھر میں کوئی بات ہو تو ہرے بن جاؤ۔ اندھے ہو جاؤ۔ اور سن بھی لو تو سن کر یوں بھیگی جلی بنی بیٹھ رہو جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ نا بھئی۔ ہم سے تو نہیں بنا جاتا بھیگی جلی۔ اس سے تو دیرانے میں جا رہنا ہی اچھا ہے۔ نہ بھئی ہم سے تو جیتے جی مرانہ جائے گا کہ دیکھ بھی لو اور پھر جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ سن لینا پر نہ جانتا۔۔۔ تو بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کیا۔ یوں سننے کو تو ہماری چتری مرغی بھی سنتی ہے۔ مزا تو جب ہے کہ بات سن کر اسے جان لیا جائے جیسے وہ آپ بیتی ہو۔ پھر یہ چلتا ہے بات کا۔ اور وہ بات ہی کیا جو اندر جا کر ناچنے نہ لگے۔ یا کچھ تو چھوڑ نہ دے۔ یا کہیں آگ نہ لگا دے۔ وہ نجمہ ہی ہے۔۔۔ بھیگی جلی۔ جو سنتی بھی رہتی ہوں ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ مکار کئی کی۔۔۔ ہونہہ!!

کیا میں نہیں جانتی کہ بھائی جان آپا سے بیاہ کرنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے ابا اور اس بڑھیا نے زبردستی انہیں آپا سے جوڑ دیا۔ جیسے ٹانگے میں ٹو جوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ابا کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ بات یوں ہے۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے جیسے دوسری شادیاں ہوتی ہیں، ویسی ہی ہے یہ شادی۔ بھائی جان تو ابا کے سامنے جا کر یوں بیٹھ رہتے، منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر جیسے بڑے اصل ہوں۔ توبہ۔۔۔ کیسے مکار ہوتے ہیں مرد۔ کتے، سروپ دھار سکتے ہیں۔ پر اڑتی اڑتی یہ بات ہم تک پہنچ ہی گئی تھی۔ آخر چھپتی کہاں ہے چھپانے سے ایسی بات۔ جو بھی آتی، امی کے کان میں منہ دے کر بیٹھ جاتی اور جب بھی کوئی امی سے منہ جوڑ کر بیٹھتی اور پھر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی۔ اور مجھ سے کہتی۔ ”اے ہے لڑکی تم اب کھیلو نا جا کر۔“ اور امی فوراً یہ کہتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی۔ ”فیض بیٹی اب دو لفظ پڑھ لو نا بیٹھ کر۔“ تو میں جھٹٹاڑ جاتی کہ کوئی بات ہوگی۔ بس پھر تو میرے تن بدن میں چوٹیاں چلنے لگتیں۔ جیسے رگوں میں بات رینگ رہی ہو۔ سر سر کر رہی ہو۔ بات، بات، بات اور دل یوں بچتا۔ سن۔۔۔ سن۔۔۔ سن۔ پھر نہ سننا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا میرے لیے۔ دیوار کے پیچھے کھڑکی کی اوٹ میں۔ پلوچی خانے کی ڈولی کے پیچھے۔ بھائی جان کے کمرے میں میز کی اوٹ میں۔ اور آپا کے کمرے میں ہو تو کھڑکی کی درواز میں سے۔ وہاں سے تو کتنے والی کا منہ بھی دکھتا تھا۔۔۔ ہائے بات سن لینا پر کتنے والی کو نہ دیکھتا۔ نہ جی ہم تو کبھی نہ سنیں رو کھی بات جو صرف کان میں بھنبھنائے اور بس۔ یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی بغیر کھائے طوہ نکل لے۔ جب وہ ہاتھ چلاتیں، منہ بتاتیں، آنکھیں چکاتیں اور انگلی ہونٹ پر رکھ لیتیں تو بات میں جان پڑ جاتی تھی اور بن دیکھے سو کھی بات جیسے مری ہوئی ہو۔ جیسے کھٹائی بنا چٹنی۔

ایک بولی۔ ”لو سناتم نے بی بی۔ یہاں تو بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن وہاں۔۔۔ آئے

وقت کٹ لیتی۔ اور دن میں چار چار بار اپنے گھر سے ہو آتی۔ پر آپا۔۔۔ ایوں گٹھڑی بن کر پڑی رہی گویا جان نکل چکی ہو۔ کسی نے پہلہ اٹھا دیا تو منہ دیکھ لیا۔ کسی نے ہاتھ میاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا تو وہیں پڑا رہا۔ جیسے مسالے کی بنی ہوئی جلیانی گڑیا ہو۔

توبہ۔۔۔ اس روز گھر میں ایک قیامت دہی ہوئی تھی۔ بڑی اماں بھائی جان کے ابا کے کان میں منہ دیئے بیٹھی تھی۔ نجمہ بانو سے پوچھ رہی تھی اور بانو مسکرا کر کہتی۔ ”چپ کوئی سن لے گا۔“ اور بھائی جان چارپائی پر پڑے تھے اور ان کے بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں، دہی زبان میں چیخ رہے تھے۔ ”اگر تمہیں گھر کی لالچ کا خیال نہیں تو پھر یہاں رہنے کا مطلب۔“ پھر بڑی اماں ڈاکٹر بھائی کی فٹیں کر رہی تھیں۔ ”آپ ہی سمجھ جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ اے ہے جو ان لڑکا ہے۔ اگر۔۔۔“ پھر ماں بیٹے کے پاس گئی۔ فٹیں کرتی رہی۔ پھر ان کے ابا اندر چلے گئے اور نگے گھورنے۔ بہت چھپا چھپا کر کر رہے تھے بات۔۔۔ ہونہ۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ بھائی جڑے ہوئے ہیں اور کوئی رسم ادا کرنے کو نہیں مانتے۔ میں سب سمجھتی تھی۔ آپا کو زبردستی اس ڈھول پر منڈھ دیا تھا اور آپا۔۔۔ دم پخت دیگ کی طرح دھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ جیسے لجائی ہوئی ہو۔ ہونہ لجائی۔۔۔ میں کیا جانتی نہیں۔ سبھی یونہی بیٹگی ملی بن کر بیٹھ جاتی ہیں سرسراں میں۔۔۔ جیسے بہت لجا رہی ہوں۔ بڑی لجانے والی۔ چاہے دل میں چوہے ناچ رہے ہوں اور بدن پر چونٹیاں ریگ رہی ہوں۔ اس لیے تو نہیں بیٹھ رہتیں کہ بیٹھنے میں مزا آتا ہے انہیں۔ میں جانوں ڈرتی ہیں کہ کہیں اٹھ کر ٹاپنے نہ لگیں خوشی سے۔۔۔ پر آپا۔۔۔ آپا کس بات پر لجائی۔ میں نے ایک بار پہلہ اٹھا کر دیکھا تو آنسو۔۔۔ اتنا بڑا آنسو۔۔۔ ہائے میرا دل بیٹھ گیا اور میں لپٹ گئی آپا سے۔ اپنے اپنے انداز ہیں۔ کوئی شرم کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتی ہے اور کوئی آنسو کی اوٹ میں۔ آپا سبھی کچھ جانتی تھی۔ نہ جانے آپا کو بات کیسے معلوم ہو جاتی تھی اور پھر بیٹھے بٹھائے۔ میں سارا سارا دن ماری ماری پھرتی۔ کبھی ڈولی کے پیچھے، کبھی میز کی اوٹ میں۔ تب کہیں جا کر پتہ چلا کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جان جاتی جیسے کلن میں ریڈیو لگا ہو۔ خوشی کی بات ہو تو مسکراتی پھرتی اور ایسی دسی ہو تو چٹکی ہوئی آنکھیں چھپاتی پھرتی بیٹھے بٹھائے بات پالنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ ایک دن مجھ سے بولی۔ ”فیضی! یہ کیا علوت ہے تیری۔ یوں لوگوں کی باتوں پر کلن لگائے رکھنا۔ کسی کی بات میں داخل دینا اچھا نہیں ہو تا۔“ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ ”پھر تم کیوں دیتی ہو میری بات میں دخل؟ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ بڑی کے سے آئی ہوئی تو دیکھو۔“ اور میں نے آپا کا منہ چڑا دیا۔

پہلے پہل تو بھائی جان آپا سے پرایوں کی طرح پیش آئے۔ ایک جگہ بھی توبہ نہ بیٹھتے تھے وہ دونوں۔ آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے اور وہ باہر آگئی تو یہ کمرے میں چلے گئے۔ بہانے بہانے۔ ہائے

ہائے۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔ سنا ہے لڑکا تو مانتا ہی نہیں۔ کتنا ہے میں تو ساری عمر کنوارا ہی رہوں گا۔ نو بی بی بھلا یہ بھی سنا ہے کبھی، ساری عمر بھی کنوارا رہ سکتا ہے کوئی؟ توبہ بی بی آج کل کے لڑکے۔ جب تک بیاہ نہ ہو۔ ”تو کنوارا رہوں گا میں۔ اور ہو جائے تو یتیم کے بغیر دم لکھا ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”چاہے تم برائی مانو۔ پر سبھی کہتے ہیں لڑکے کو کسی سے محبت ہے۔ سکول کی ہے کوئی۔ ہائے ری یہ سکول کی۔ توبہ ان کے ہتھے نہ جڑھے کوئی۔ سوڑی کی گھٹلی کی طرح چپک جاتی ہیں۔“

تیسری ہونٹ پر انگلی رکھ کر بولی۔ ”میں تو سچی بات کہوں گی۔ چنے خوئی مانے نہ مانے۔ ہاں میں نے تو بخایا ہے اس گھر کا۔ لڑنے نے پھن انجھے نہیں دھیں ہیں مجھے۔“

اور ای کہتی۔ ”اچھا جو لڑکی کے نصیب میں لکھا ہو گا ہو جائے گا۔ اب تو ہم نے ہاں کہہ دی ہے۔ ہاں۔ اگلی بات کو پھر کیسے نکل جاؤں۔ اب بس اللہ ہی کار سلا ہے۔ ہاں۔“

ہونہ کار سلا۔ جیسے اللہ کو کوئی اور کام ہی نہ ہو۔ توبہ ایسے سے ای یوں بن جاتی تھی جیسے کسی فرشتے کے پر اکھڑ گئے ہوں۔ بڑی حاجن تو دیکھو۔ اور دیے ابا سے بات ہو تو پنچے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ اس وقت اس کے کار سلا اللہ کہاں ہوتے ہیں۔ توبہ کیا کھرتائے آتے ہیں بڑوں کو۔

آپا نے بھی سن لی تھی بات۔ نہ جانے کیسے پتہ چل جاتا تھا اسے بیٹھے بٹھائے۔ پر سن بھی لو تو کیا۔ اس کے منہ میں زبان بھی ہو۔ بس آنکھیں چھلکانا ہی جانتی ہے۔ دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور آنسو گرا دیا یا بی گئی۔ اور پھر اٹھ کر کوئی کام لے بیٹھی جیسے کام بھلا سکتا ہو بات کو۔ ہم سے تو نہیں بھولتی، چاہے ہزار کام لے بیٹھیں۔ اور ہزار تو کیا ایک بھی لے بیٹھیں تو ستیاں کر کے رکھ دیں۔ مجھے تو بات کا بخار چڑھ جاتا ہے۔ پھر کام کیسے کروں۔ کام کو میں تو ہے نہیں۔ اگرچہ کڑوا ضرور ہوتا ہے۔۔۔ پر آپا۔!

ابا بولے۔ ”آپ ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں یہ لڑکے۔ بیاہ ہو لینے دو۔“ ابا تو بس مونچھوں کو تاؤ دینا ہی جانتے ہیں۔ تاؤ دیا اور سگارا سگارا کر بیٹھ گئے۔ یا ہم پر رعب چھانٹ لیا اور امی کے سامنے چوہے کی طرح دبک گئے۔ وہاں چلے بھی رعب ان کا۔ اور امی۔ توبہ اسے کیا کیا گر یاد ہیں۔ صبح و شام بیسیوں سنی اور یوں پی گئی جیسے شربت کے گھونٹ ہوں اور پھر چوٹ جھبی لگائے گئی جب لوہالال ہو۔ جب موقعہ آیا تو یتیم بن ٹھن کر بیٹھ گئی۔ ہائے کیسی پیاری لگتی ہے امی جب وہ ٹھن تیار ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ میرا توجی چاہتا ہے کہ ہاتھ چوم لوں اس کے۔

پہلی مرتبہ جب آپا سرال آئی تو امی نے مجھے بھی بھیج دیا ساتھ۔ آئی تو بڑی چاؤ سے تھی پر توبہ ہے پرائے گھر میں یوں آ بیٹھا۔ میرا جی چاہتا تھا، چچیں مار کر رو پڑوں۔ میں تو پھر نجمہ سے کھیل کر

ہلائے اور آپا کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آپس میں بات کر بھی لیتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا۔ آپا تو شاید اسی بات پر خوش تھی کہ چلو زبان تو ملی بات کرنے کو۔ بولنا تو سیکھ لیا اور آپا۔۔۔ حد کردی آپا نے تو۔ بھائی نے بات کردی تو سن لی۔ نہ کی تو نہ سنی۔ ان کے ہونٹوں کی طرف کستے رہتا۔ ہائے کیا غلامی ہے۔ آپا تو بس آئی گئی ہو کر رہ گئی تھی۔ آپا کی اس بات پر یا نہ جانے کیوں کئی بار بھائی جان ٹھٹھکتا جاتے اور پھر اک بھر پور نگاہ ڈالتے اس پر۔ یوں چونک کر دیکھتے اسے گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور آپا مسکراتی۔ چھپی چھپی مسکراہٹ۔ ایسی ایسی باتیں سن کر ہنس دیتی وہ یا جی ہاں کہہ دیتی جو کوئی اور بیوی سن لے تو قیامت ہی کھڑی کر دے۔ بس ہاں جی۔۔۔ جی ہاں۔ اور جی کے سوائے کچھ کہنا ہی نہ جانتی تھی۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے آپا پر اور یوں مسکرائے جاتی جیسے کوئی چشمہ پھاڑی۔ اندر ہی اندر راست بتا رہا ہو۔ ہائے ری مکار۔!

اس روز بھائی جان کس قدر پریشان تھے۔ میں نے انہیں کبھی یوں بے قرار نہ دیکھا تھا۔ کبھی لیٹ جاتے پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے۔ پھر آپا کے کمرے میں جھانکتے اور پھر جھینپ کر چلے جاتے یا اندر آتے بھی تو دو ایک ساعت کے لیے اوھر اوھر دیکھ کر لوٹ جاتے یا چونک کر کہتے۔ ”تم ہو فیضو۔۔۔ اچھا۔۔۔ اچھا۔“ اور پھر چلے جاتے۔ آپا بھی حیران تھی۔۔۔ آخر شام کے قریب وہ بولے۔ ”صفی کل مہمان آئیں گے۔ نہیں نہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔ اچھا میں پھر مات کروں گا تم سے۔“ اور وہ چلے گئے۔ آپا نے آنکھیں کھولیں۔ میرا مطلب ہے اس نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرا دی۔ عجیب مسکراہٹ تھی وہ۔ تعجب، خوشی اور غم میں بیٹھی ہوئی مسکراہٹ۔۔۔ وہ چلے گئے تو آپا بڑبڑائی۔ ”ہوں۔۔۔ میں جانتی تھی کہ ایک نایک دن آئیں گے۔ آہی جائیں تو اچھا ہے۔“ پھر وہ مجھے دیکھ کر ہنسی۔ ”تو نہیں بیٹھی ہے فیضو؟“

”کون آئیں گے؟“ میں نے آپا سے پوچھا۔
”ہوں گے نا کوئی۔ تم بھی دیکھ لیتا۔“ وہ مسکرائی۔

میں نے بن جانے بوجھے کہہ دیا۔ ”ہوں تمہاری سہیلی ہوگی کوئی۔“

آپا بہت ہنسی۔ ہنسی ہی گئی۔ توبہ ایسا بھی کیا ہے۔ خواہ مخواہ دوسرے کو شرمندہ کر دینا۔ میں نے کوئی بری بات تو نہ کہی تھی۔ پھر بولی۔ ”ہاں میری ہی تو ہے۔“ میں چڑ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”چاہے کوئی ہو۔ تمہاری سہیلی ہو یا ان کی دوست۔ ہمیں اس سے کیا مطلب؟“ اور آپا پھر ہنسنے لگی۔ کہنے لگی۔ ”میری سہیلی جو ہوئی، سوان کی بھی تو ہونی ہوئی کچھ۔“

رات کو بھائی جان نے دو ایک مرتبہ پھر ہمارے کمرے میں جھانکا۔ اس کمرے میں آپا اور میں سوتے تھے۔ پہلے بانو بھی سویا رتی تھی۔ ہمیں آپا کی چارپائی اور ننھے کی کھنولے سے پرے اس کو نہ

بے چاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ اس کے آپا کو چپ لگ گئی۔ نہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ جب بھائی کسی کام کو کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ ”اوہ۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی۔“ اور باہر نکل گئی اور وہ باہر آئے تو اوھر اوھر ہو گئی لیکن کیا مجال جو چہرے سے ظاہر ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپا جل گئی ہے بھائی جان سے، لیکن توبہ آپا۔۔۔ آپا جل جانے والی کہاں۔ وہ تو سلگتا جاتی ہے اور بس۔ بھی ایسا بھی نہ ہو کوئی۔ اٹھتی ہے اور چل پڑتی لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی انہیں۔ جیسے جی چاہتا ہوں۔ اب بھی بلا لیں تو بیٹھ جاؤں۔ نہ جانے کے لیے بہانہ ڈھونڈتی تھی۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ عورتیں کیوں مرتیں ہیں؟ رات بھر جاتی ہیں اور ویسے دیکھنے میں جھوٹی موٹی۔ ہٹو ہمیں شرم آتی ہے۔ غزو۔۔۔ بھی میں تو کبھی نہ یوں مرتوں کسی پر۔

آخر بھائی جان کی اکڑوں ٹوٹ ہی گئی۔ اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہو سکی جیسے بڑی آپا کے گھر میں۔۔۔ ہائے بڑی آپا کے گھر میں تو میل لگا رہتا ہے جیسے چینی کا ڈپو کھلا ہو۔ یہ آئی۔۔۔ وہ گئی۔ اور وہ دونوں یوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے میاں بیوی تو ہیں ہی نہیں۔ اک تماشا گاہ رکھتے ہیں۔ اس نے چھیڑا اور اٹھ بھاگی۔ اب وہ پکڑ رہے ہیں۔ اب چوٹی سے پکڑ کر گھمیت رہے ہیں اور اس نے چیخ ماری، جیسے کوئی مر رہا ہو۔ اوھر پڑوس میں دیوار پر لٹن نسیں جھانکی۔ اوھر چوبارے کی کھڑکی میں ملک صاحب کی ماں آکھڑی ہوئی۔ کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا اور یہ ہیں کہ ہنسنے ہنسنے لوٹ پوٹ ہوئے جارہے ہیں۔

یا کہیں گے نذرانہ ہمیں تنکے کیوں پسند ہیں؟ اور پھر بڑی آپا کے کندھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیں گے اور وہ چلائے گی، کیوں میں کیا تنکے ہوں؟ نہیں۔ نہیں۔۔۔ گاؤ تنکے نہیں، میں تو چھوٹے سے تنکے کی بات کر رہا ہوں اور پھر وہ اٹھ بھاگے اور آپا ہانپتی ہوئی پیچھے پیچھے۔ پھر اس روز جب بڑی آپا کا کندھا چھل گیا تھا اور میں ان کے کنبے پر سخر کی پھریری لائی تھی تو بولے۔ ”فیضی! یہ کیا مذاق ہے۔ اس پھریری سے کیا بنے گا۔ بیٹی بوتل ہی اٹھا لائی۔“

”بوتل۔۔۔ کیوں؟“ میں نے ویسے ہی پوچھا۔

بولے۔ ”اوہ نہیں۔ سمجھتی یہاں تو پھاڑ لینا ہے پھاڑ۔“ اور بڑی آپا غرائی۔

تو اب اس گھر میں قہقہوں کے پٹانے چھوٹے ہیں ہر وقت اور یہ گھر۔۔۔ بس برف پڑ رہی ہے ہر وقت اور وہ ٹوٹی ہوئی پچھلی بھپ۔۔۔ بھپ۔۔۔ بھپ۔۔۔ بھپ۔۔۔ آپا نے منہ موڑ کر دیوار سے پوچھا۔ ”مڑگوشت بنالوں؟“ اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔ ”بنالو۔“ یا انہوں نے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ رومال تو بہت میل ہو گیا ہے۔“ اور آپا بولی۔ ”ابھی دھوئے دیتی ہوں۔“ پر ہزار شور ہو۔ چاہے نجمہ بانو اور بڑھیا انکھی باتیں کر رہی ہوں لیکن بھائی نے ہونٹ

میں۔ ان دنوں وہ آپا کو دبایا کرتی تھی۔ پھر آپا نے کہا۔ ”بانو اب میں اچھی ہوں۔ جب ضرورت پڑے گی، بلا لیا کروں گی۔“ بس پھر ہم دونوں اکیلے رہ گئے یہاں۔ ساتھ ہی بھائی صاحب کا کمرہ تھا۔ دروازہ میرے سرہانے کھلتا تھا۔ بھائی جان نے جو جھانکا تو میں بولی۔ ”بھائی جان کب آئیں گے وہ مہمان؟“ بھائی جان حیران اور آپا کبھی غصے میں اور کبھی مسکراتی ہوئی۔ پھر بھائی جان بولے۔ ”فیضو کو الام بھی ہونے لگا ہے اب۔ بڑی مشکل ہو گئی۔“ میں نے کہا۔ ”میں کیا جانتی نہیں۔ آپا کی سیل آئی۔“ تو پھر پوچھ اپنی آپا سے۔ ”وہ بولے۔ پھر وہ آپا سے بولے۔ ”مافی تمہیں نیند تو نہیں آئے گی۔“ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرائی۔ اور وہ بولے۔ ”نہیں۔ اگر تمہیں نیند آئی ہے تو بے شک سو جاؤ۔ میرا مطلب ہے میں ذرا سا کام کر لوں۔“ اور انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ پھر آپا کی طرف۔ میں سمجھ گئی کہ بس اس بات کے انتظار میں ہیں وہ کہ میں سو جاؤں۔ پھر کیا تھا ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ گلی میں انگریزائیاں اور جمائیاں لینے اور پھر پتھری پڑ گئی جیسے کل کی مری ہوئی تھی۔ توبہ۔۔۔ ایسے سے کیا جھل کہ ذرا سی بھی ہل جاؤں۔ چاہے لاکھ چوٹیاں ریگیں، کھلی ہو۔ اونہوں۔۔۔

بھائی جان نے آکر پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلے سے رضائی میں درز رکھ لی تھی جس میں سے دیکھ بھی سکوں۔ وہ بولے۔ ”فیضو سو گئی؟“ ”فیضو؟“ آپا نے مجھے آواز دی اور پھر مسکرا دی۔ میں چپ۔۔۔ بھائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولے۔ ”یہاں بیٹھ جاؤں میں؟“ آپا ذرا پرے سرک گئی۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں جانوں وہ گھبرا رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ کیسے شروع کریں بات۔ بات کرنے سے ڈرتے ہوں گے۔ آپا بھی تاڑ گئی اور آپ ہی چھیر دی اس نے۔ بولی۔ ”کب آئیں گے مہمان؟ فیضی کی بات پر نہ جائیں آپ۔“

”نہیں نہیں۔ ٹھیک ہے۔“ وہ بولے۔ ”تم نے سچ کہا تھا۔ وہ کل آرہی ہے۔ کل رات کو۔ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں گا مافی۔۔۔ نہ جانے وہ کیوں آرہی ہے۔“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے۔ ”کسی گاؤں میں جانا ہے۔ ضروری کام ہو گا۔ کل رات یہاں پہنچے گی۔ پھر صبح سویرے موٹر سے چلی جائے گی اور شام تک لوٹ آئے گی۔ پھر رات یہاں رک کر صبح کی گاڑی سے واپس چلی جائے گی۔ لیکن وہ ویننگ روم میں ٹھہر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں یہاں گھر آکر ٹھہرنے پر ضد کر رہی ہے۔ اف انکی ضد۔۔۔“ بھائی نے کہا۔ ”اس کی ضد کون توڑے گا۔ اس کی ضد نے تو کیا توڑ کر رکھ دیا۔ اسے بھی تو ڈر دیا لیکن۔۔۔ وہ غصے میں بڑبڑائے۔ ”اب آنے کا مطلب؟ یہ میں پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کیوں آرہی ہے وہ؟“

”بلکہ اچھا ہوا۔“ آپ بولی۔ ”مجھے تو کب سے ملنے کی آرزو تھی۔“

یہ سن کر بھائی جان حیران رہ گئے۔ ”تم نہیں جانتیں مافی۔۔۔“ ”میں جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے معلوم تھا وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی۔“

”تم۔۔۔“ بھائی جان نے آپا کی طرف دیکھا۔ جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں آپا کو۔ وہ گھبرائے۔ ”مافی تم جانتی نہیں۔“ ”ہاں ہاں میں جانتی ہوں۔“

”میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا۔ میں تمہیں دھوکا نہ دوں گا مافی!“ ”میں جانتی ہوں۔“ آپا بولی۔ اس نے نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ”مافی!“ بھائی نے حیرانی سے دیکھا۔ ان کی نگاہ تشکر سے لبرز تھی۔ ”کچھ دن کے لیے یہاں۔۔۔“ وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

آپا بولی۔ ”میں روک لیجے گا۔ کچھ دیر اکٹھے رہیں گے۔ مجھے مدت سے آرزو تھی۔“ ”نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو مافی۔۔۔؟ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں۔“

”بس وہ تمہاری طرح ہے۔ تمہاری طرح۔“ بھائی بولے۔ ”میری طرح۔۔۔؟ میری طرح۔۔۔؟“ آپا کی اس مسکراہٹ میں کیا نہ تھا۔ طنز کی دھار تھی اور چیخ و پکار بھی۔ ہائے۔۔۔ آپا کی وہ ہنسی۔ میں تو کانپ کانپ گئی۔ ”بی۔“ بھائی بڑبڑائے۔ ”تمہاری طرح بے داغ۔ اعلیٰ۔ ہم کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ وہ سب سے الگ تھی۔ باقی لڑکیاں تو چاؤ چونچلے کرنے میں لگی رہتیں لیکن نیلی اس کا نام ہے۔ عیسائی ہے نا وہ۔ میں اسے نیلی کہا کرتا ہوں۔۔۔ نیلی۔“ بھائی مسکرائے۔ ”معا“ آپا نے ننھے کی طرف دیکھا۔ ”نیلی کسی سے نہ ملتی تھی۔ اس میں اک آن تھی۔“ بھائی نے پھر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ”مجھے اس کی یہی بات بھاگنی۔ ہم اکثر اکٹھے بیٹھے رہتے۔ میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے لیکن کیا مجال جو کوئی حرکت ہو۔ فضول بات۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔“ میں سمجھتی ہوں۔ ”آپا نے کہا۔ بھائی ہنسنے لگے۔ ”ایک دفعہ میں نے کچھ کہہ دیا تھا۔ ویسے ہی مذاق میں۔ اف کس قدر بگڑی۔ بولی، مسٹر جلیل۔۔۔ میرے خیال میں آپ یہاں آکر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہفتہ بھر تک اس کا غصہ نہ گیا۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پیغام دے دیا۔ شادی کرنے میں تو اسے اعتراض نہ تھا لیکن بڑی کڑی شرط تھی اس کی۔ کہنے لگی، مسٹر جلیل۔ ”پروپوزل“ دینے سے پہلے یہ جان لیجئے کہ میں شادی اپنے ہم مذہب ہی سے کروں گی۔ میں اس کے لیے وہ کام بھی کر سکتا تھا جو کسی کے لیے کرنے کو تیار نہ تھا لیکن مذہب بدلنا۔۔۔ یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ ہزار میں کیس۔ کہا، نیلی تم میری ہی نہیں، اپنی زندگی بھی برباد کر دو گی۔ پر۔۔۔ اس کی بات اٹل تھی۔

کہنے لگی، میں جانتی ہوں۔ اس سے زیادہ جانتی ہوں۔ شاید۔۔۔ شاید میں کبھی کسی سے بیاہ نہ کر سکوں لیکن مسٹر جلیل محبت بھی کچھ نہیں ہے اس دنیا میں۔ محبت ایک جہاں ضرور ہے لیکن اس کائنات میں اس سے بڑے بڑے جہاں بھی ہیں۔

چھ مہینے کے بعد جب میں پھر اس سے ملا تو کہنے لگی، بہتر ہے کہ اب یہ چنگاری یا توجھ جائے یا بھسم کر ڈالے۔ اب بار بار مل کر اسے بھڑکانا اچھا نہیں۔ ان دنوں وہ کس قدر لاغر ہو رہی تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی، اسے دق نہ ہوا تو کہنا لیکن اپنی ضد کی پکی ہے۔ یہ بات اس نے سن لی۔ کہنے لگی، اہاں۔۔۔! دق نہ بھی ہو تو کیا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا۔۔۔ بس ایک ہی افسوس ہے مجھے۔ صرف ایک بچہ۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بھائی نے ہانے ہانے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ تو بہ میں تو بھائی کی حالت دیکھ کر سن ہو رہی تھی۔ نہ جانے لوگوں کو آپ جلنے اور کسی کو جلانے میں کیوں مزہ آتا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ بھائی اس قدر دکھی ہیں۔ نہ جانے اب وہ کیوں آ رہی ہے؟“ بھائی اٹھ بیٹھے۔ ”ضد۔۔۔ اور کیا۔ لیکن صفی۔ یہ نہ بھولنا کہ اب۔۔۔ اب بے سود ہے۔ اب میں تمہارا ہوں۔۔۔ صرف تمہارا۔ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں آ سکتا۔“

بڑی اماں نے سنا تو ہچکچہ بھجھ کر کہے بولی۔ ”نہ جی میں نہیں جانتی۔ سہیلی دیہلی۔ تو بہ۔۔۔ کیا زمانہ آیا ہے۔“ ”یہ تو ویسے ہی چھیڑ رہے ہیں۔ سہیلی تو میری ہے۔“ ”آپا بولی۔“ ”چاہے کسی کی ہو۔“ بڑی اماں بولی۔ ”پر ہے تو کافر۔ میں تو کسی کافر کو منہ ٹکے دوں گی بچہ زچہ کے۔ نہ بھئی۔ یہ شگن اچھا نہیں ہوتا۔“

اس روز میں نے دوپہر کو جی بھر کر سولیا۔ جانتی تھی تاکہ رات کو وہ آنے والی ہے۔ ہائے کس قدر چاؤ تھا مجھے اسے دیکھنے کا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ دیکھوں تو کیسی ہے۔ بڑی بھین ہوگی۔ کالج کی جو ہوئی۔ ہائے میری تو جان جاتی ان کالج والیوں سے۔ کس طرح بات کرتی ہیں۔ جیسے شہرت کے گھونٹ پی رہی ہوں اور پھر ان کا چلنا پھرنا۔ ہر بات میں لے ہوتی ہے۔۔۔ لے اور رنگ۔ رنگوں کے چٹاؤ میں تو حد کر دیتی ہیں۔ مجھے تو ان کالج والیوں سے عشق ہے۔ عشق۔

اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ وہاں اس بیگم کی چارپائی ڈلا دی اور اپنی چارپائی ہمارے کمرے میں لے آئے۔

تو بہ کتنا انتظار کرنا پڑا مجھے۔ بھائی تو اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ اور آپا کروٹیں لے رہی تھیں۔ جیسے کسی پہلو قرار نہ ہو۔۔۔ نہ جانے کیا وقت تھا جب وہ آئے۔ اور میرا دل لگا دھک دھک کرنے۔ میں نے اپنی رضائی میں سے دیکھا۔ پر۔۔۔ ایسی جگہ پر تھی میری چارپائی کہ وہ نظر نہ آئی۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی۔ لیکن ہلتی کیسے۔ میں تو کب کی یوں پڑی تھی جیسے نیند میں بے ہوش ہو کوئی۔ ہلتی تو

آپا کو پتہ چل جاتا۔۔۔ اور ان دنوں کا جھگڑا شروع تھا۔ ہائے کیسی پیاری آواز تھی۔ کیسا لوچ تھا۔ یوں گول گول لفظ نکلتے تھے منہ سے جیسے رس گلے ہوں۔ پر تھی وہ اس طرف دیوار کی اوٹ میں اور سامنے بھائی جان کرسی پر بیٹھے تھے۔

وہ بچے کو دیکھنے کی ضد کر رہی تھی اور بھائی جان کہہ رہے تھے۔ ”اگر کچھ ہو گیا تو سب بھینس گئے کہ بس تم ہی کچھ کر گئی ہو۔“ وہ بھائی جان کی باتوں کو مانتی تو تھی۔ پر میں جانوں اسے آپا اور ننھے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ تو بہ۔۔۔ اس قدر دبی دبی باتیں کر رہے تھے کہ وہ سنی نہ جاتیں۔ کبھی دلی لفظ کلن میں پڑ جاتا۔ آپا بھی تو بار بار کلن سے بل ہناتی تھی۔ گو دیکھنے کو میں چپ پڑی تھی۔ وہ یوں کھوٹی ہوئی تھی کہ ننھے کو تھکانا بھی بھول گئی تھی۔

”ہاں۔“ اس کی آواز آئی۔ ”اب میں نے جان لیا ہے۔“ اس نے اک آہ بھری۔ ”اس بات میں مذہب کو لانا میری بھول تھی۔ لیکن۔۔۔“

”نہیں نہیں۔“ بھائی جان تڑپ کر بولے۔ ”اب۔ اب اس بات کو۔۔۔“

”ہاں۔ اب۔۔۔“ وہ ہنسی۔ دھارسا حیر ہنسی۔ گویا وہ دھار اپنے آپ کو کٹ رہی ہو۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ بھائی اٹھ بیٹھے۔ ”اگر اب جان بھی لیا تھا تو کہنے سے فائدہ۔۔۔؟“

لوہ۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا کہہ دیا نیلی۔ پھر سے مجھے۔۔۔“

”پھر سے۔“ وہ ہنسی۔ ”ہاں۔ آپ کے لیے تو پھر سے ہے۔ لیکن یہاں جب اور اب سب ایک تار سے بندھے ہیں۔ پھر تو ہوا ہی نہیں۔“

”نیلی۔۔۔!“ بھائی چلائے۔ ”تم اب آرام کرو۔ تھی ہوئی ہو۔“

”ہاں۔ چور ہوں چور۔۔۔ لیکن میں مسز جلیل نے ضرور ملوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ میں اب اندر چلی جاؤں گی۔“

”نہیں نہیں۔ آج نہیں۔“ بھائی بولے۔ ”اگر صفی کو اعتراض نہ ہوا تو کل بڑی اماں سے پوری۔۔۔“

”نور بچہ۔ وہ تو مجھے دے دیجئے گا۔ وہ میرا ہے۔ مسٹر جلیل!“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ بھائی بولے۔

”آخر میں کیسے گزار سکوں گی؟“

”لیکن۔ وہ نہ مانے گی۔“

”میں منالوں گی اسے۔“

بھائی جان گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

صبح جب میں جاگی تو مہمان جا چکی تھی۔ بھائی جان اسے پہلی موٹر میں بٹھا آئے تھے۔

”سارا دن میں دعائیں مانگتی رہی کہ بھائی جان اسے آپا سے ملانے پر راضی ہو جائیں۔ وہ آپا سے نہ ملتی تو میں اسے کیسے دیکھتی اور اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھی میں۔“

شام کو میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپا بگڑی بیٹھی ہے۔ غصے میں کہہ رہی تھی۔ ”میں ضرور ملوں گی۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں آپ اوھر چلی جاؤں گی۔“ بھائی جان نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا اور آپا کو چپ کرادیا۔ میں بھی وہاں سے سرک گئی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن بھائی جان کی میز کے پیچھے بیٹھ کر سننے لگی۔ وہ سمجھے میں یا ہر چلی گئی ہوں۔

آپا چمک کر بولی۔ اف۔۔۔ اس روز آپا لڑ رہی تھی۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔ آپا اور بھائی جان سے لڑے۔ وہ آپا جو جی ہاں کے سوا کچھ کہنا نہ جانتی تھی۔ بولی۔ ”اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر لوگ چار چار کرتے ہیں۔ میں اس کی خدمت کروں گی۔ ایمان سے مجھے کوئی لگہ نہ ہو گا۔“

”لیکن کیوں۔۔۔؟“ بھائی نے بات کاٹ دی۔

”بس میرا جی کہتا ہے۔“ آپا بولی۔ ”ایسی اچھی ہے وہ۔ اس کی زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں آپ؟“

”لیکن تمہاری زندگی؟“ بھائی بولے۔

”میری زندگی۔“ آپا نے دہرایا جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ بچتا ہے۔ ”میری زندگی کو جانے دیجئے۔“

گئی آئی چیز کا کیا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ بھائی غصے میں اٹھ بیٹھے۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ اب تم اور مجھ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپا کا چہرہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ جیسے کوئی بیماری کے بعد سکھ کی نیند سو جاتا ہے۔ آپ ہی آپ مسکراتی تھی۔ ایسی جیسے نیا نیا ساگ ملا ہو۔ شام کو نیلی لوٹ آئی۔ ہم سب انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب بڑی اماں عشاء کی نماز شروع کرے اور نیلی ہم سے ملے۔ چونکہ بھائی جان نے کہہ دیا تھا کہ اماں نماز شروع کرے گی تو ملا دیں گے تم سے۔ اماں کی نماز بھی تو ایسی ویسی نہ تھی۔ نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی وہ۔ نماز ختم ہوتی تو کھڑی ہو کر کچھ پڑھتی۔ پھر بیٹھ کر ہونٹ ہلاتی رہتی اور پھر ایک لمبا سجدہ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے سجدے میں ہی دم نکل گیا ہو۔ توبہ اس روز وقت تھا کہ رک گیا تھا۔۔۔ نہ جانے کس وقت اماں نے نماز شروع کی۔ اس نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی چونکہ نئی پڑوسن سیدانی کو آنا تھا نا۔۔۔ بچی کو دیکھنے کے لیے، لیکن سیدانی نہ آؤ۔ آخر اماں نے انتظار کے بعد شروع کی نماز۔

ہائے ری۔ وہ نیلی۔ کیا پھین تھی۔ کس شان سے وہ اندر آئی۔ گویا میم ہو میم۔ منہ سے ہل۔ زرد ٹمٹلی رنگ اور نیلی آنکھیں۔ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور یوں چونکی جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ پھر بے اختیار پلاٹھا کر نغصے کی طرف دیکھا اور پھر ہانکوں کی طرح نیلی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔ ”آئیے بیٹھے۔“

آپا نے نغصے کو اٹھا کر نیلی کی گود میں دال دیا اور مسکرا کر بولی۔ ”آپ ہی کا تو ہے۔ چاہے ابھی ملے پس یا جب جی چاہے۔ میں تو دلیہ ہوں اس کی۔“ اف آپا کی وہ بات۔

نیلی پہلے تو حیران بت بنی بیٹھی رہی، پھر چونک کر بولی۔ ”آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟“ ”کیا کہنے ہیں؟“ آپا نے کہا۔ ”کیا پیار اٹھا ہے۔“ اور اس نے نغصے کی طرف دیکھا۔ اف۔۔۔ اس کا تو رنگ اڑ گیا۔ شرم سے یا نہ جانے کیوں پانی پانی ہو گئی۔ پھر بھائی جان نے نیلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”نیلی۔ صغی جانتی ہے۔“ ”مجھے تو بہت خوشی ہے۔“ آپا کہنے لگی۔ ”کہ گھروالی آگئی۔“ ”نہیں۔“ نیلی چلائی۔ ”آپ نہیں جانتیں۔۔۔“ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ آپا مسکرائی۔ ”ام دونوں ہمیں اکٹھی رہا کریں گی۔ میں خدمت کروں گی۔“ آپا کی آواز بھرا گئی۔ ”نہیں نہیں۔“ بھائی جان چیختے لگے۔ ”اب نہیں۔“

عین اس وقت دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا اندر آگئی۔ ”میں پڑوس سے آئی ہوں بیٹی۔“ وہ بولی۔ ”برانہ مانا۔ میرا جی چاہتا تھا نغصے کو دیکھ آؤں۔“ بھائی سرک کر کونے میں ہو گئے۔ نیلی نے انہیں بھینچ کر بڑھیا کو بٹھالیا۔ میں جانوں وہی سیدانی تھی۔ بڑی اماں انتظار کرتی رہی تھی اس کا۔ ”اے کے جواب میں وہ دعائیں دینے لگی۔ پھر بولی۔ ”کہاں ہے نغصا؟“ نغصے کو دیکھا اور پھر غور سے نیلی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس وقت اس کی گود میں تھا نا وہ۔ ”اللہ عمر دراز کرے۔“ وہ بولی۔ ”کیا پیار ہے۔“ نیلی کی طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگی۔ ”بالکل ماں پر گیا ہے۔“ بھائی جان کا منہ فتح ہوا۔ نیلی تو تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پر وہ اپنی دھن میں بولتی رہی۔ ”اے ہے لڑکی۔۔۔“ اس نے نیلی کو ہاتھ مارا۔ ”یوں کرسی میں بیٹھنا۔ توبہ آج کل کی لڑکیاں تو زچہ بننا جانتی ہی نہیں۔۔۔ تجھے تو پٹنگ پر لگ جانا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”نانی۔۔۔۔۔“ نغصے کی اماں تو یہ رہی۔ ”میں نے آپا کی طرف اشارہ کیا۔ بڑھیا نے کہا۔ ”آپا کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ہنسی۔“ ”اے ہے لڑکی۔ مذاخ کرتی ہو۔ یہ بال دھوپ میں تو نہیں بیٹھتی۔“ ”پھر وہ نغصے سے مخاطب ہوئی۔ ”چاہے نغصے سے پوچھ لو کہ کون ہے اس کی اماں۔“ نیلی نے ہنسی بیٹھی تھی۔ اوھر آپا گنگنا نے لگی۔ ”نہیں اب ہمارے درمیان کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔“ وہ انگوٹوں کی طرح ہنسی۔

بڑھیا جو اپنی دھن میں بولتی گئی۔ ”کتے ہیں۔ بچ کتے ہیں سیانے باپ کی نظر میں جو دلسن کی صورت بچ جائے تو بچے کو تو ماں پر جانا ہی ہوا۔“

بڑھیا بولی۔ ”کیا ہنسی ہے بیٹی۔ بچہ حائل کمال ہوتا ہے۔ وہ تو اچھے دونوں میں بندھن بن جاتا ہے۔“ بڑھیا نے بھائی اور نیلی پر معنی خیز نگاہ ڈال کر کہا۔ ”اور پھر جب ماں پر شکل ہو اس کی۔۔۔!“

چپ

”چپ۔“

جینا نے چچی کی نظر بچا ماتھے پر پیاری تیوری چڑھا کر قاسم کو گھورا۔ اور پھر نشے کی شلوار کے اٹھائے ہوئے پائے کو مسکرا کر نیچے کھینچ لیا اور از سر نو چچی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ قاسم چونک کر شرمندہ سا ہو گیا اور پھر معصومانہ انداز سے چارپائی پر پڑے ہوئے رومل پر کاڑھی ہوئی تیل کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل خواہ مخواہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ قاسم کئی باریوں چوری چوری جینا کے جسم کی طرف دیکھتا ہوا پکڑا جا چکا تھا۔ جینا کے مسکرا دینے کے باوجود وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کی نگاہیں چھپنے کے لیے کونے تلاش کرتیں۔ نہ جانے کیوں یوں ان جانے میں اس کی نظر جینا کے جسم کے بیچ و خم یا ابھار پر جا پڑتی۔ اور وہیں گڑ جاتی۔ اس وقت وہ قطعاً بھول جاتا کہ کدھر دیکھ رہا ہے یا کچھ دیکھ رہا ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ بات تبھی وقوع میں آتی جب جینا کے پاس کوئی نہ کوئی ہمسائی بیٹھی ہوتی۔ پھر جب جینا اکیلی رہ جاتی تو وہ مسکرا کر پوچھتی۔ ”کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی؟“ ”میں۔۔۔ میں نہیں تو۔“ وہ گھبرا جاتا اور جینا ہنسی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی۔ ”کسی کے سامنے یوں پانگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے بلو۔“ اگرچہ اکیلے میں بھی جینا کا پانچہ اکثر اوپر اٹھ جاتا اور دوشہ بار بار چھاتی سے یوں نیچے ڈھلک جاتا کہ ساٹل میں لمبوس ابھار نمایاں ہو جاتے۔ لیکن اس وقت قاسم کو اوھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی حالانکہ جینا بظاہر شدت سے کلام میں منہمک ہوتی۔ لیکن قاسم بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔ اب میں جاتا ہوں۔ وہ نظر اٹھاتی اور پھر لاڈ بھری تیوری چڑھا کر کہتی۔ ”بیٹھو بھی۔ جاؤ گے کمال۔“

”کلام ہے ایک۔“ قاسم کی نگاہیں کونوں میں چھپنے کی کوشش کرتیں۔

”کوئی نہیں کلام دام۔ پھر کر لیتا۔“ لیکن وہ چلا جاتا جیسے کوئی جانے پر مجبور ہو اور آپ ہی آپ

پھر نجانے اسے کیا ہوا۔ ایک رات میں بے قراری سی چھا گئی۔ وہ چار پانی پر بیٹھا دعائیں مانگتا کہ وہ اکیلے ہوں۔ اس وقت آنکھیں یوں چڑھی ہوئیں جیسے پل کر آیا ہے۔ جسم میں ہوائیں چھوئیں۔ جیناں نیچی نظر سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اور پھر آنکھ بچا کر کوئی نہ کوئی شرارت کر دیتی۔ مثلاً "جب چچی یا بڑی بی کی نظر ادھر ہو تو جیناں جیسے بے خبری میں کوئی کپڑا اپنی گود میں ڈال لیتی اور نیچی نگاہ سے قاسم کی طرف دیکھ کر اسے تھپکنے لگتی اور قاسم — اف وہ بے چارہ تڑپ اٹھتا اور جیناں منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتی۔ یا وہ دونوں ہاتھ قاسم کی طرف بڑھا کر پھر اپنی گود کی

ہے۔“ میں نے ہی منع کر دیا تھا۔ بھابھی بولی۔ ”دیکھ بیٹی اللہ رکھے۔۔۔ اب وہ جوان ہے۔ نہ جانے کوئی کیا سمجھ لے۔ بیٹی کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا اور محلے والیوں کو تو تم جانتی ہو۔ وہ بات نکالتی ہیں جو کسی کی سدھ بدلہ میں نہیں ہوتی۔ اور پھر تمہاری عزت ہوئی۔ کیوں بیٹی۔۔۔ کیا برا کیا میں نے جو اسے جلانے سے روک دیا۔“ ایک ساعت کے لیے وہ چپ سی ہو گئی۔ لیکن جلد ہی مسکرا کر بولی۔ ”ٹھیک تو ہے بھابھی۔ تم نہ کرو میرا خیال تو کون کرے۔ تم سے زیادہ میرا کون ہے۔ تر بڑی سیانی ہو بھابھی۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کہاں چھپا بیٹا ہے؟“ اور اندر چلی گئی۔ قاسمی کا منہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ اسے یوں چپ دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے بولی۔ ”چپ۔“ پھر آواز بلند کرنے لگی۔ ”مجھے ڈی۔ ایم۔ سی کاک ڈبے۔ دو گے قاسمی۔ سبھی رنگ ہوں اس میں۔ اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر کاٹ لیا۔ قاسمی بننے لگا تو منہ پر انگلی رکھ کر بولی۔ ”چپ۔ اب تو زندگی حرام ہو گئی۔“ قاسمی نے اس کے کان میں کہا۔ ”اب میں کیا کروں گا۔ میرا کیا بنے گا۔“ ہو نہ زندگی حرام ہو گئی۔ بس اتنی سی بات پر گھبرا گئے۔ ”پھر آواز بلند سننے لگی۔ ”ڈبے میں لال گولا ضرور ہو۔ مجھے لال تاگے کی ضرورت ہے۔“ عیناں نے یہ کہہ کر اس کے کان سے منہ لگادیا۔ ”رات کو ایک بجے میٹھک کی تیسری کھڑکی کھل ہو گی۔ ضرور آنا۔“ ایک آن سے لیے وہ حیران رہ گیا۔ ”ضرور آنا۔“ وہ اس کا سر بدن سے مس کرتے ہوئے بولی۔ اور پھر آواز بلند اسے ڈبے کے لیے تاکید کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ”آج نہ سسی۔ کل ضرور آنا۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس رات محلے بھر کی آوازیں گلی میں آکر گونجتیں اور پھر قاسم کے دل میں دھک دھک بجتیں۔ عجیب سی ڈراؤنی آوازیں۔ اس رات وہ آوازیں ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل میں پہاڑی نالے کی طرح بہہ رہی تھیں۔ بنے جا رہی تھیں۔ محلہ ان آوازوں کی مدد سے اس سے انتقام لے رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کا کھیل اسے برا لگ رہا تھا۔ نہ جانے نائیں اتنی دیر بچوں کو باہر رہنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ پھر دور محلہ کی مسجد میں! کی اذان گونجی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیل مار کر رو رہا ہو۔ کس قدر او اس آواز تھی جسے وہ بھیانک تر بنا رہا تھا۔ ایک ساعت کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کراہتی ہوئی خاموشی۔ دروازے کھل رہے تھے یا بند ہو رہے تھے۔ اف کس قدر شور مچا رہے تھے وہ دروازے۔ گویا ریگ ریگ کر شکایت کر رہے ہوں۔

کیا کھڑکی بھی کھلتے وقت شور مچائے گی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ نمازی واپس آ رہے تھے۔ ان کے ہر قدم پر اس کے دل میں ”دھک“ سی ہوتی۔ توبہ۔۔۔! اس گلی میں چلنے سے حملہ بھرگو بختا ہے۔

”چر۔۔۔۔۔ چوں۔“ دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ تجلنے کیا ہو رہا تھا اس روز۔ کويا تمام محلہ پ دن کا بیمار تھا۔ ”کھڑ کھڑ دم۔ ائم ائم۔۔۔۔۔ ائم۔“ یا شاید وہ سب تفریحاً کھانسنے لگے تھے۔ تسنخ بھری کھانسی جیسے وہ سب اس بھید سے واقف تھے۔

”من مَن۔۔۔۔۔ بارہ۔۔۔۔۔“ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سنا۔ لیکن آوازیں تھیں کہ ختم ہیں۔ یہی نہ تھیں۔ کبھی کوئی پچر بلبلاتا تھا۔ اور ماں ورنی دینا شروع کر دیتی۔ کبھی کوئی بڑھا کھانسی کھانسی کر کھلے بھر کو از سر نو جگا دیتا۔ نہ جانے وہ سب یونہی بیدار رہنے کے عادی تھے یا اسی رات حالات بگڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے میں اماں کی کونوں سے چارپائی جھنجھ رہی تھی۔ اماں یوں یوں کون نہیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اس کا بھید جانتی نہ ہو کہیں۔ چلنے لگے تو اٹھ کر ہاتھ نہ پکڑ لے اماں۔ اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ شاید جیناں نہ آئے اور وہ مضطرب ہو جاتا۔ اف وہ کتے کیسی بھیاںک آوازیں رورہے تھے۔

شاید اس لیے کہ وہ جیناں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا۔ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ اور وہ حنائی ہاتھ پر سے اسے تھپکتا رہا۔ اور وہ آوازیں گونجتی رہیں یا شاید اس لیے کہ وہ سارا سارا دن آپس بھرتا۔ کروٹیں بدلتا اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ رات کو علیحدہ کمرے میں سونے کی ضد کرتا اور پھر جیناں ڈی۔ ایم۔ سی کا گولا منگوانے آتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ آنکھیں جھومٹیں اور وہ بھول جاتا کہ اماں کے پاس محلے والیاں بیٹھی ہیں۔ یا ویسے ہی جیناں کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جیناں کے میاں روز بروز بیوی سے جھگڑا کرنے لگے تھے۔ حالانکہ جیناں بظاہر ان کا اتنا رکھ رکھاؤ کرتی تھی، پھر ان دنوں تو وہ اور بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگی تھی۔ مگر میاں کو نہ جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا۔ گویا وہ توجہ صرف ملوہ تھی اور وہ روز بروز ان سے بے پروا ہو جاتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے اس کی وجہ محلے کی دیواریں ہوں جو اس قدر پرانی اور وفادار تھیں کہ جیناں کا یہ رویہ برداشت نہ کر سکتی ہوں۔ اس لیے انہوں نے وہ راز اچھال دیا۔ بہر حال وجہ چاہے کوئی ہو، بات نکل گئی۔ جیسا کہ اسے نکل جانے کی بری حادثہ۔

پہلے دبی دبی سرگوشیاں ہوئیں۔ ”یہ اپنا قاسم۔۔۔ نواب بی بی کا لڑکا۔۔۔ اے ہے ایسا تو نہیں دکھ تھا۔“ ”پر چاچی جینا تو راہ چلتے کو لیٹ لیتی ہے۔“

”نہ بڑی بی۔ میرے من تو نہیں لگتی یہ بات۔ ابھی کل کا پچھ ہی تو ہے اور وہ اللہ رکھے۔ بھری دیا۔“ میں کہتی ہوں بی بی۔ جب بھی جاؤ۔ اتنی آؤ بھگت سے ملتی ہے کیا کہوں۔ لوگوں کا سب سے چاہا اچھال دیا۔“ ”پر بھابھی۔ ذرا اسے دیکھو تو۔ اللہ مارے نشے کی شلوار ہے۔ سائل کی

ن کی آوازیں سستی رہتی ہوں۔ کان پک گئے ہیں۔ پڑوسن جو ہوئی ان کی اور پھر دیوار بھی ایک اشیا ہے۔ تو بے اللہ بچائے حرام کاری کی آوازوں سے۔ نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں دونوں؟ کبھی بٹنے میں۔ کبھی روتے ہیں۔ اور کبھی یوں دنگ کرنے کی آواز آتی ہے جیسے کوئی کبڈی کھیل رہا ہو۔ ”پر می۔ اپنا گھر والا موجود ہو تو یوں جھک مارنے کا مطلب“ ”تو چھوڑ اس بات کو۔“ میں کہوں چوری کا

ننگہ وہ واقعہ پیش آیا۔ نہ جانے ہوا کیا؟ آدمی رات کو جیناں کی چھین سن کر محلے والیاں

انکھی ہو گئیں۔ دیکھا تو جیناں کا خاوند پہلی کے درد سے تڑپ رہا ہے اور وہ پاس بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ ڈاکٹر بلوائے گئے۔ حکیم آئے۔ مگر بے سود۔ صبح دس بجے کے قریب میاں نے جان دے دی اور جیناں کی پرورد چچوں سے محلہ کانپ اٹھا۔ لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی سرگوشیاں از سر نو جاگ پڑیں۔ کوئی بولی۔ ”اب قدر جانی جب وہ مر گیا۔“ کسی نے کہا ”ابھی کیا ہے“ ابھی تو جانے گی۔ بے چارہ ایسا نیک تھا۔ اب تک نہ کی اور یہ بی بی ہوئی کھیلنے میں مصروف لگی رہی۔ ”چاچی نے سر پیٹ لیا۔ کہنے لگی۔ ”آئے ہائے ری۔ تم کیا جانو۔۔۔۔۔ اس کے لپھن۔ میں کہتی ہوں نہ جانے کچھ دے کر مار دیا ہو۔“ ”ہیں چاچی بس۔ تو چپ رہ۔ ہائے ری جوان میاں کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا۔ وہ منع کرتا تھا اے۔ اس کے سامنے تو کھیتی رہی اپنے کھیل۔ پھر جان لے لیتا۔۔۔۔۔؟ یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔ ہم تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے۔ محلے کی ناک کاٹ دی۔ میں کہتی ہوں اگر سرکار کو پتہ چل گیا تو۔ وہ تو قبر بھی کھود لیں گے۔“ ”بس بھابھی بس تو چھوڑ۔ اب اس بات کو دفع کر۔ کچھ۔۔۔۔۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔“

جب قاسم کی ماں نے سنا کہ بیٹا جیناں سے بیاہ کرنے پر تیار ہوا ہے تو اس نے سر پیٹ لیا۔ اپنا سر پیٹنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ قاسم اب جوان تھا۔ اپنی نوکری پر تھا۔ ہر ماہ سو پیاس اس کی جھولی میں ڈالتا تھا۔ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی مگر بیٹا ڈگھریا چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس لیے وہ چپ ہو گئی۔ اگرچہ اندر ہی اندر ٹھلنے لگی اور جیناں کے متعلق ایسی دعائیں مانگتے لگی کہ اگر وہ پوری ہو جائیں تو قاسم سر پیٹ کر گھر سے باہر نکل جاتا۔

جب محلے والیوں نے سنا کہ قاسم کا پیغام جیناں کی طرف گیا ہے تو چاروں طرف پھر سے چرچا ہونے لگا۔ ”کچھ سنا تم نے چاچی۔۔۔۔۔؟“ ”بس تو چپ کر رہ۔ آج کل تو آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے ہو کر بیٹھ رہو“ تب گزارہ ہوتا ہے۔ ”پر چاچی کبھی سننے میں نہ آیا تھا کہ بیوہ کو کنوارہ لڑکا پیغام بھیجے۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں بیوہ مر جاتی تھی مگر دوسری شادی کا نام نہ لیتی تھی اور اگر کوئی پیغام لاتا بھی تو اس کا منہ توڑ دیتی۔ لیکن آج نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ پر چاچی وہ تو لڑکے سے سات آٹھ سال بڑی ہو گی۔ اے اپنی فاطمہ سے دو ایک سال ہی چھوٹی ہے۔“ ”آئے ہائے کیا کہتی ہو تم۔ دیکھنے کا کیا بسن۔ ہار سنگار کر کے بیٹھ جاؤ۔ منہ پر وہ اللہ مارا کیا کہتے ہیں“ اسے آٹا لگلو۔ تو تم بھی چھوٹی دکھو گی۔ دیکھنے کا کیا ہے؟ اس سے تو عمر چھوٹی نہیں ہو جاتی۔“

قاسم کا خیال تھا کہ جب جیناں بیاہ کا پیغام سنے گی تو اٹھ کر ناپنے لگی گی لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ سوچ میں پڑ گئی تو جل کر راکھ ہو گیا۔ پھر۔۔۔۔۔ اسے مومن کا خیال آیا۔ اور غصے سے منہ لال ہو گیا۔ ”صاف انکار کیوں نہیں کر دیتی تم؟“ اس نے گھور کر جیناں کی طرف دیکھا۔ جیناں مشین

جانے میں لگی رہی۔ پھر آنکھ اٹھائے بغیر کہا۔ ”تم تو قاسی ہی رہے۔“ ”قاسی رہتا تو تم اس قدر لاپرواہ کیوں ہو جاتیں؟“ وہ بولا۔ ”میں تو لاپرواہ نہیں۔“ اس نے سوئی میں دھاگا پروتے ہوئے کہا۔ ”مجھے داب دو۔“ وہ بولا۔ اس کی آواز میں منت کی جھلک تھی۔ ”جواب دو۔ میں یوں انتظار میں گھل گھل کر مرنا نہیں چاہتا۔“ ”اچھا۔“ جیناں نے آہ بھر کر کہا۔ ”تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی۔“ ”جیناں۔۔۔۔۔“ اس کا سر اس رشتیں تکیے پر جا ٹکا۔ ”اے ہے کوئی دیکھ لے گا۔“ وہ بولی۔ ”دیکھ لے۔“ اس نے جیسے نیند میں کہا۔ ”کیس مومن نہ آجائے۔“ جیناں نے سر سرپی طور کہا۔ ”مومن۔۔۔۔۔ اس کے دل پر تیر سا لگا۔ اور وہ اٹھ بیٹھا۔ ”مومن آجائے تو اسے جان سے نہ مار دوں۔“ وہ غرایا۔

اس کے نکاح پر محلے والیوں نے کیا کیا نہ کہا۔ کوئی بولی۔ ”لو۔۔۔۔۔ یہ یوسف زلیخا کا قصہ کی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“ کسی نے کہا۔ ”ابھی نہ جانے کیا کیا دیکھنا پاتی ہے۔ ابھی تیل دیکھو“ اس کی دھار دیکھو۔“

کسی نے کہا۔ ”اے ہے جیناں۔ کیا اسے گود میں کھلائے گی۔ میاں نہ ہوا“ لے پالک ہوا۔ ”ہاں بی۔ بولی“ ”تو چھوڑ اس بات کو بی بی۔ آج کل کے لڑکوں کو گود میں پڑے رہنے کا چڑکا پڑا ہوا۔۔۔۔۔ جو رو کو ماں بنا لیتے ہیں۔ ہاں۔۔۔۔۔“ کوئی کہنے لگی۔ ”خیر چاچی حرام سے تو اچھا ہے کہ نکاح میں۔ کیوں بڑی بی۔ ہے نایہ بات؟ میں سچی کہوں گی۔ ہاں بسن نہ جانے کب سے کئے ہوئے تھے یہ دوسرے۔“

نہ جانے بیاہ کے بعد کیا ہوا انہیں۔۔۔۔۔ جیناں تو گویا گھر گرہتی عورت بن گئی۔ اس کے نشے۔۔۔۔۔ پاجامے عام پاجامے نظر آنے لگے جو محض جسم ڈھانپنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ اور خس کی۔۔۔۔۔ تو گویا اڑی ہی گئی۔ حالانکہ اب بھی وہ خس کا عطر لگاتی تھی۔ اس کے اٹھے اور گرے ہوئے۔۔۔۔۔ میں چنداں فرق نہ رہا۔ البتہ جب کبھی قاسم اس کا پانچپہ اٹھا ہوا دیکھتا تو پھر وہ بے قرار ہو کر اندر چلا جاتا۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ شروع میں وہ اکثر جیناں کے پاس آ بیٹھتا۔ لیکن اب جیناں کا حنائی باتہ شدت سے کام میں لگا رہتا اور اس کی گود بند رہتی۔ اگر کبھی قاسم کا سروباں نک بھی جاتا تو وہ اپنے کام میں یوں مگن بیٹھی رہتی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کبھی چڑ کر کہتی۔ کیا بچوں کی سی باتیں ہیں۔۔۔۔۔؟“ اس پر وہ محسوس کرتا۔ گویا وہ گود کسی اور کے لیے مخصوص ہو چکی ہو اور تھپکنے والا ہاتھ کسی اور کا نظر ہو۔

کئی مرتبہ دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ شک سانپ کی طرح ڈسنے لگا کہ دونوں بیٹھے ہیں۔ وہ اور۔۔۔۔۔ اس کا سر رشتیں تکیے پر ٹکا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا اور واپسی پر جیناں کو

”سنا تم نے۔ اب مومن کا جھگڑا ہے۔ تو بہ۔“ یہ عورت کسی لڑکے کو لپٹے بنا چھوڑے گی
گئی۔ میں کہتی ہوں اس کے سر پر حرام سوار ہے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔“ میں کہتی ہوں، اچھا یا جو میں نے
بذریعہ سینک دیں ذرا۔“ پر چاچی کہاں مومن کہاں جیناں۔ مومن تو اس کے بیٹے سلمان ہے۔“ ”اللہ
تیرا بھلا کرے۔ جسبی چھاتی پر لٹا رکھتی ہو گی تا؟“ اب خالد سے لڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی
ہے۔“ ”نہ جانے وہاں کیا گیل کھلائے گی۔ میں جانوں اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ مرد تو اتو جانے
نہ دیتا۔ کمرے میں بند کر دیتا۔ اچھا نہیں کیا جو اسے جانے دیا۔“ ”بلکہ وہ تو اور بھی آزاد ہو گئی۔“
”سنا ہے چاچی خط آیا ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔ طلاق مانگتی ہے۔“ ”بڑی آئی طلاق مانگتے والی۔“ ”میری ماں
تو۔۔۔۔۔ ساری عمر بٹھار رکھے۔“ ”خیر بی بی یار نے کے بیہ کا مزہ تو پایا۔“ ”میں پوچھتی ہوں اب
سے پھنسائے گی؟ تمہیں کیا معلوم۔ اسی روز سے اپنا مومن غائب ہے۔“ ”جی تو قادی سر جھٹک
پھرتا ہے۔ دنیا کو منہ کیسے دکھائے گا۔“ ”میں کہتی ہوں۔ بس ایک طلاق نہ دے اور جو بی بی چاہے

البتہ ان دونوں جب قاسم کے مال باپ چند دن کے لیے ان کے پاس آئے تو قاسم نے محسوس کیا کہ جیناں وہی پرانی جیناں تھی۔ اس روز جب اماں سے باتیں کر رہا تھا تو جیناں نے آکر اندھیرے میں اس کی کمر پر چٹکی بھری۔ اور جب وہ گھبرا کر کچھ بولنے لگا تو بولی۔ ”چپ“ اور ایک حنائی ہاتھ نے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر اس دن جب وہ ابا کے دیوان خانے میں سویا ہوا تھا، کسی نے اس کے کان میں تنکا چھو کر اسے جگا دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ وہ ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل گئے۔ اور پھر ایک ہلکا سا پیار سا تپھر گال پر پڑا۔ ایک حنائی انگلی اس کے ہونٹوں پر آ رہی۔ ”چپ“ اس معطر اندھیرے میں سے پیاری سی آواز آئی۔ بیشتر اس کے کہ قاسم اسے پکڑ سکتا، وہ جا چکی تھی۔ پھر ایک روز غسل خانے میں جب وہ نہانے لگا تو معاً ”کوئی دروازے کی لوٹ سے نکل کر اس سے چمٹ گیا۔ وہ گھبرا کر چلانے لگا۔ مگر دو حنائی ہاتھوں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ ”چپ“ وہ دیوانہ وار ان حنائی ہاتھوں کو چومنے لگا۔ پھر جب اس نے جیناں کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ منہ پکار کے بولی۔ ”شور مچا دو گی

کرے۔“ ہونہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اپنی فاطمہ بھاری تھی کہ کاغذ خرید لیا ہے۔“

اس واقعہ پر قاسم کی زندگی نے ایک بار پھر پلٹا کھلایا۔ اسے عورت سے نفرت ہو گئی۔ محبت پر اعتبار نہ رہا۔ ”عورت۔۔۔۔۔؟“ وہ دانت پیس کر کہتا۔ ”عورت کیا جانے محبت کے کتے ہیں۔ ناگن صرف ڈسنا جاتی ہے صرف ڈسنا۔ اگر اس نے طلاق لکھ بھیجی تھی تو صرف اس لیے کہ حملہ کے لوگ اسے مستغفرانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور عورتیں صبح و شام اس کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے اور اپنی زندگی از سر نو شروع کرے۔ لیکن جب اس نے سنا کہ جینا نے مومن سے نکاح کر لیا تو وہ اس بظاہر بے تعلقی کے باوجود جو وہ جینا کے متعلق محسوس کرنا چاہتا تھا، تڑپ کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ ہر وقت جینا سے نفرت پیدا کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اسے برا بھلا کہتا تھا، بے وفا فاحشہ سمجھتا۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں تلے ریشمیں معطر گود آ کر کھل جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہیں سر نکا دے۔ وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکے اور وہ تمام دکھ بھول جاتا۔ پھر کسی وقت اس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آکھڑا ہوتا۔ دو ہونٹ کہتے۔ ”چپ“ اگرچہ اس وقت وہ لاجول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا تھا لیکن یہ تصاویر اسے اور بھی پریشان کر دیتیں۔ اور وہ اور بھی کھو جاتا۔ ایک سال کے بعد جب جینا اور مومن محلے میں آئے تو پھر چرچا ہونے لگا۔ محلے والیاں بڑے اشتیاق سے دلن کو دیکھنے لگیں۔ اگرچہ ان کی مبارک باد طعنہ آمیز تھی لیکن مومن کی ماں کو مبارک تو دینا ہی تھا۔

اتفاق کی بات تھی کہ جب مومن اور جینا محلے میں داخل ہوئے، عین اس وقت قاسم گلی میں کھڑا چاچی سے بات کر رہا تھا۔ اس روز وہ ایک سرکاری کام پر ایک دن کے لیے باہر جا رہا تھا اور چاچی سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں چاچی سرکاری کام ہے۔ کل رات کی گاڑی سے لوٹ آؤں گا۔“ پیچھے آہٹ سن کر وہ مڑا تو کیا دیکھتا ہے، جینا کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ بھاگا حتیٰ کے اسٹیشن پر جا کر دم لیا۔

اس روز دن بھر وہ جینا کے بارے میں نہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ دل میں ایک اضطراب سا کھول رہا تھا، مگر وہ تیزی سے کام میں مصروف رہا۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لینے کے لیے بے تاب ہو۔ کام ختم کر کے وہ رات کو گاڑی پر سوار ہو ہی گیا۔ گاڑی میں بہت بھٹرتھی۔ اس گہما گہمی میں وہ قطعی بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ کہاں جا رہا ہے اور وہاں کون آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ محلے کے پاس پہنچا تو ایک بچنے کی آواز آئی۔ ”نن۔“ معا“ وہ دبے پاؤں چلنے لگا۔ گویا ہر آہٹ اس کی دشمن ہو۔ گلی میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ وہی پرانا قاسم تھا۔ دغمتا“ ایک ریشمیں معطر گود اس کی نگاہ تلے جھلکائی۔ دیکھوں تو بھلا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا۔ دل دھڑکنے لگا۔ نگاہ بھٹک کی تیسری کھڑکی پر

جا کر نکلی۔ انگلی سے دبایا تو پٹ کھل گیا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔ معا“ سامنے سے اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ وہ گھبرا کر مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ روشنی ایک حسین چہرے پر جا پڑی۔ ”ہاں وہی۔“ میڑھیوں میں جینا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”تم؟“ وہ غصے سے چلایا۔ ایک ساعت میں اسے سب باتیں یاد آ چکی تھیں۔ اس کا جسم نفرت سے کھولنے لگا تھا۔ ”چپ“ جینا نے منہ پر انگلی رکھ لی۔ قاسم کا جی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو فوج لے۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آئے۔ لیکن اچانک حنائی ہاتھ بڑا۔ ”میں جانتی تھی تم آؤ گے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔“ قاسم کا سر ایک ریشمیں معطر گود پر جا نکا۔ جس کی نیم مدھم گرمی حنائی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اسے تھپکنے لگی۔ قاسم نے دو ایک مرتبہ جوش میں آرائش کی کوشش کی لیکن وہ خوشبودار ریشمیں بدن مدھم گرمی اور حنائی ہاتھ۔۔۔۔۔ اس کا غصہ، آنسو بن کر بہ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھپک رہے تھے۔

”چپ“ جینا منہ پر انگلی رکھے مسکرا رہی تھی۔

پل

آپ پل کو نہیں جانتے۔ بھلا جانیں بھی کیسے جب کہ نہ تو وہاں کوئی شہر آباد ہے۔ اور نہ ہی کوئی گاؤں۔ بس دریا پر ایک عام سا پل بندھا ہے۔ جس پر ریل کی لائن چبھی ہے جو سرحدی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی ہے۔ وہ ایک عام سا پل ہے۔ ایک ایسے غیر معروف سے دریا پر جو دیکھنے میں نالا نظر آتا ہے۔ البتہ اگر غور سے دیکھیں تو پانی کا بہاؤ اتنا گہرائی کا غماز ہے لیکن غور سے دیکھنے کی فرصت بھی ہو۔ جب تک آپ گاڑی کی کھڑکی سے سر نہ نکالتے ہیں، گاڑی پل کے پار جا چکی ہوتی ہے۔

اول تو کوئی پل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ دیکھ بھی پائے تو یہ راز کھلتا کہ پل ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ سٹیشن کے آثار ہی غائب ہیں۔ نہ آہنی جنگلا نہ پلیٹ فارم۔ نہ وہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہے اور نہ کوئی اترتا ہے۔ باتوں کے باوجود ایک اہم سٹیشن ہے۔ یہ اہمیت سیاسی نوعیت کی ہے۔ وہ دو حصوں کا ”سنگم“ ہے۔ گاڑی رکتی ضرور ہے۔ چاہے رکتے ہی چل دے۔ گاڑی وہاں یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آپ محسوس تک نہیں کرتے بفرض محال آپ محسوس بھی کر لیں تو آپ سمجھیں گے گاڑی محض رک گئی ہے، کھڑی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں۔۔۔۔۔ کوئی بات ہو گئی ہے۔ اور پھر آپ زیادہ ضروری امور کے متعلق سوچنے لگتے ہیں۔ میرا مطلب ہے، وہ امور جنہیں آپ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

محبت یہ ہے کہ سٹیشن ایک بوئے جنگلشن کے قریب ہے۔ اس قدر قریب کہ آپ کو گلن بھی نہیں ہوتا کہ ایک سٹیشن دوسرے سٹیشن سے اس قدر قریب ہو سکتا ہے جنگلشن کی افرا تفری کے بعد جب گاڑی چلتی ہے تو آپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جگہ بنانے یا نہ جانے کب تک کھڑے رہنے کا تہیہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پل آتا ہے، گزر جاتا ہے اور آپ کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک اہم سٹیشن گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے اور آپ غیر علاقہ میں داخل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔

پل سے دو فرلانگ دوسرے دو مختصر سے کوادرٹ گال سے گال جوڑے بیٹھے ہیں۔ جیسے تیز جھنڈ میں مرغیاں بیٹھ جایا کرتی ہیں۔ لیکن جنگلشن کی گذشتہ افرا تفری کے اثرات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کو ان کوادرٹوں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ دیکھ بھی لیں تو انہیں کوادرٹ نہیں سمجھتے آپ۔ اور سمجھ بھی لیں تو آپ کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ آباد ہیں اور پل سے متعلق ہیں۔

ان کوادرٹوں میں سٹیشن کے ماسٹر اور نائب رہتے ہیں۔ موجودہ سٹیشن ماسٹر اقبال کو وہاں رہتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ لیکن نائب کو صرف مہینہ گزرا ہو گا۔ اسی طرح چار سال پہلے اقبال نائب ہو کر آیا تھا۔ ان دنوں بس ایک وہ خود اور ایک اس کی ننی بیابتا بیوی برعکس تھی۔ برعکس اس بیوانے میں آکر کس قدر ڈر گئی تھی۔ کہاں سکول کی رونق اور پھر بیابا پر سکینوں کا سنگ اور کہاں یہ ویرانہ۔ لیکن آہستہ آہستہ جی لگ ہی گیا۔ چونکہ پڑوس کا کوادرٹ بچوں سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے مٹر کی پھسیاں دانوں سے۔ پھر ان کی ماں بڑی مفسار تھی۔ اس کے علاوہ دونوں کوادرٹوں کے درمیان ایک کھڑکی تھی جس کی وجہ سے دونوں کنبے ایک گھر نظر آتے تھے۔ چونکہ کھڑکی زمین سے اونچی تھی، اس لیے بچوں کی خاطر دونوں طرف سینٹ کی بیڑھیاں بنی تھیں اور کھڑکی کا پچھلا حصہ سینٹ کی محراب سی بن گیا تھا۔ سب ازراہ مذاق اس کھڑکی کو پل کہا کرتے۔ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک کیونکہ وہ کھڑکی دونوں گھروں کے درمیان پل کا کام دیتی تھی۔

پڑوسیوں کی تبدیلی پر برعکس نے پریشان تو ہو نا ہی تھا لیکن اس کی پریشانی ایسی شدید نہ تھی۔ ایک تو اب اس مقام کے مانوس ہو چکی تھی اور دوسرے اب ان کے دو ننھے منے بچے تھے۔۔۔۔۔ معیدہ اور انور۔

جن کی اوٹ میں مٹے نائب کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ ریل کا بابو تو وہ دکھائی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کا کوئی لڑکا ہو۔ بھرا ہوا جسم۔ سانولا رنگ۔ کندل والے بال اور شرابی آنکھیں۔ جو دور۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھیں۔ خواب آلود آنکھیں۔۔۔۔۔ جیسے کسی اور دنیا میں رہتی ہوں۔ نہ جانے برعکس کو کیا ہوا۔ بڑھ کر جن کا کونا سر کا لیا اور شگاف بنا کر دیکھنے لگی۔

اس روز سلائی کا کام کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ لٹ کھٹک کر ماتھے پر آبڑی۔ دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ کان کا آویزہ یوں لرزاں رہا گویا پل کے نیچے سر سے دریا میں شتی ڈول رہی ہو۔ مشین کی آواز میں ایک نغمہ رقصاں تھا۔ شاید اس لیے کہ نائب اور اس کی ننی نویلی بیوی کو دیکھ کر اسے وہ دن یاد آگئے جب وہ آپ نئی نئی بن پر آئی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

اقبال گاڑی پارک کر کے جلدی جلدی گھر آتا۔ اسے یوں کھوئی کھوئی دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھتا۔ ”کہاں ہو؟“ وہ پوچھتا۔ ”کہیں بھی نہیں۔“ وہ مسکراتی۔ ”لو نموں۔۔۔۔۔“ وہ قریب تر

سُک آتا۔ ”کیس دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ برج۔“ وہ اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے قریب تر کھینچ لیتا۔ ”تم تو یوں کھوئی رہتی ہو جیسے کوئی اکیلا جزیرہ۔“ اگلے سندر میں۔۔۔ ”تو پھر میں کیا کروں؟“ وہ شرما سی جاتی۔ ”اچھا۔“ وہ ہنس کر کہتا۔ ”تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔“ ”کیا؟“ وہ بھولی بن کر پوچھتی۔ ”اس ایسے جزیرے کو کھے کر کنارے لگانا پڑے گا اور کیا۔ چھوڑو بھی ناب یہ کام۔“ وہ اس کے ہاتھ سے کپڑا یا سوئٹر چھین کر پرے پھینک دیتا۔ کھویا کے بے تکلف ہاتھ پتوار بن جاتے اور ناؤ ڈولنے لگتی۔ ڈو لٹی ڈو لٹی نہ جانے کس کنارے کی طرف بہہ نکلتی۔۔۔۔۔ ”زن۔۔۔۔۔!“ گاڑی پل سے گزر جاتی۔ نور مسافروں کو شبہ نہیں نہ ہوتا کہ دو سرحدیں مل رہی ہیں۔

”تو یہ ہے نیا نائب۔“ برج نے اقبال سے کہا۔

”تم نے دیکھا ہے اسے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ وہ مشین چلاتے ہوئے بولی۔ ”سٹیشن کی طرف سے آ رہا تھا۔ ریل گاڑی تو دکھائی نہیں۔ کھڑیا لے بال۔ سانولا رنگ۔ کھوٹی کھوٹی نگاہیں۔“ ”ہاں۔“ اقبال مسکرایا۔ ”وہی شاعر تھا۔ نیا نیا ہے نا۔ آپ ہی بن جائے گا۔ یابو بنتے دیر لگتی ہے کیا؟“

”عجیب سی جوڑی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”کیوں۔۔۔؟“

”اس کی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔“

”کیا ہے۔ اسے۔۔۔۔۔ جنتی تو نہیں؟“

”لو نہوں ابھی تو پچی ہے۔ بنے گی کیا۔ بالکل لڑکی ہے وہ تو۔“

”تو اس میں عجیب بات کیا ہوئی؟“

”عجیب تو کچھ نہیں۔ ویسے بات کر رہی ہوں۔ لڑکی کو دیکھو تو گلابی پنڈے کی چوکی بھری ہے

اور میاں۔۔۔۔۔ جیسے دور نہ جانے کون سی نگری میں بھٹک رہا ہو۔۔۔۔۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔۔۔۔۔ بھلاں متی نے کتبہ جوڑا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”تمہاری تو عادت ہے برج۔ تمہیں کوئی جوڑی، جوڑی معلوم ہی نہیں دیتی۔ یاد ہے مجھے کہا کرتی تھی تم۔۔۔۔۔ آپ کو تو ہر وقت کنارے لگانے کی ہی فکر رہتی ہے۔ کبھی جزیرے کو اپنی جگہ ڈولنے بھی دیا کیجئے۔ پگلی اس کو شادی کہتے ہیں۔ شادی پل ہے پل۔ دو مختلف علاقے جوڑنے والا پل۔ جیسے تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”میں۔۔۔۔۔ وہ شرما گئی۔“

”ہاں۔ تم بھی تو برج۔۔۔ میرے دل کے زخموں کو جوڑ دیتی ہو تا۔“

”لگے بھرانے۔۔۔۔۔“ وہ ہنسی۔

”نشادی اور ہے ہی کیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا۔ ایک دوسرے کو بھرانہ۔ اسی بندھن کا

”اچھا بندھن ہے۔“ وہ ہونٹ نکال کر بولی۔ ”کیس میاں حاضر اور بیوی کو اس کا پتہ نہیں۔
کیس بیوی حاضر پر میاں نہ جانے کہاں۔“

”گلی۔“ وہ قریب تر ہو بیٹھا۔ ”اگر دونوں غیر حاضر ہوں تو بات کیسے چلے۔“ اس نے بات چلاتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایک بھی حاضر نہ ہو تو۔۔۔۔۔ چھوڑو بھی۔“ کوہ اپنا آپ چھڑا کر بولی۔

”اونہوں۔ حاضر ہوتا ہی پڑے گا۔“ وہ از سر نو پاس ہو بیٹھا۔

”ہائے میرے اللہ۔ ایسی حاضری سے تو غیر حاضری ہی بھلی۔“

”بمبج۔“ وہ اس کے کان سے منہ لگا کر بولا۔ ”تم میری زندگی کے دو بھئی بانیوں پر ایک پل ہو۔ نہ جانے کہاں رہتی ہو تم۔ پاس ہوتے ہوئے بھی اتنی دور۔۔۔۔۔ دور۔“

”دور رہنے والوں کو پ کیا جانیں۔“ اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں قریب لانے کے لیے مجھے اتنی دور سے آنا پڑتا ہے۔“ وہ ہونٹ قریب تر لاتے ہوئے کہنے لگا۔

”کون آتا ہے۔“ وہ دلی زبان سے گویا اپنے آپ سے بولی۔

”میں جو آتا ہوں۔“ اس کے ہونٹ بھیج گئے۔

”خود آنے کے لیے نہیں، دوجے کو صرف اپنے پاس بلانے کے لیے۔“ وہ پیچھے سرک کر گئی۔

لیکن اس کی آواز گاڑی کے شور میں دب گئی۔ جو نہ جانے کس لانے کے لیے آ رہی تھی۔ جا رہی تھی۔ سڑک پر گاڑی کے پہلوں تلے بھاڑا تھا۔ نعرہ کہہ رہا تھا کہ ابراہیم مر رہا تھا۔

اس واقعہ کے بعد ان کے گھر میں نئے پڑوسیوں کی بات چل نکلتی۔ جب کبھی وہ اٹھتے بیٹھتے اور

یہ وہ شخص ہے جو کہ "آپ" نے "آپ" سے کہا ہے۔

دکتر

نام کامل نظر، نظر، لکھنؤ، لکھنؤ

دکٹر کا "جوانی" سے بڑھنے کا

”نگل۔“ وہ ہنسا۔ ”جو چل پڑے وہ پہنچ ہی جاتا ہے کبھی نہ کبھی۔“

۷ ”تم“ وہ چلایا۔ ”تم اور ایسی بات پہلے تو..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“
”کیوں؟“

”اُمی۔۔۔ پاؤ۔“ سعیدہ نائب کو آتے دیکھ کر چلائی۔ لیکن برج نے اس کی بات نہ سنی۔

البتہ نائب کھڑا حیرانی سے برجیس کو دیکھ رہا تھا۔

”ہائے میرے اللہ۔“ وہ دھمتا ”نائب کو دیکھ کر چلائی۔ اور پیچھے ہٹی۔“

”ہائے میرے اللہ۔“ باورچی خانے سے مدھم سی آواز سنائی دی۔

”ہائے میرے اللہ۔۔۔۔۔ ہائے میرے اللہ۔“ گاڑی شور مچاتی ہوئی غیر علاقہ میں داخل ہو گئی۔

دور

”یہ سراسر جہنم کا قصور ہے۔ تاحق سہیزب کو تکلیف ہوتی ہے۔“ بیکم غصے میں چلائی۔

”شیش باسٹر نے بغور اس کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر بولا۔

”لیکن میڈم۔ کیا آپ وہی صاحبہ ہیں جو اس روز غلطی سے پریم نگر کی رہی اور ہو گئی تھیں؟“

”نہیں سیں۔“ وہ چلائی۔ ”آپ کا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا؟ یہ صریحا“

”اسٹیک ہے۔ میں سپرنٹنڈنٹ کو لکھوں گی۔“ اور وہ ہاتھ کا بڑا جھپٹائی ہوئی ہارنگل گئی۔

”ڈولش لٹ۔“ شیش باسٹر نے بچھے ہوئے سگار کے کش لینے شروع کر دیئے۔

”جی ہاں جی ہاں۔“ نہما پنڈ نے اپنی عینک کو ناک کی چونچ پر رکھ کر اوپر سے دیکھا۔

”کہہ ریا ہوں۔۔۔۔۔“

”لا حول ولا قوت۔“ ٹکٹ کلکٹر واٹر می میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں۔“ نہما پنڈ بڑبڑایا۔ ”کہہ ریا ہوں کوئی ثبوت نہیں کہ یہ وہی شریعتی تھیں۔

”اوہ مسٹر نہما پنڈ۔“ شیش باسٹر بولا۔

[illegible]

”آب و ہول“ کیمین میں ہنسنا۔ ”ٹیشن ماسٹر صاحب آپ جانیں ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا عورتوں کو راس آئے ہے۔ جیادہ تر عورتیں لوٹیں ہی نہیں ہیں وہاں سے۔“

”زیٹ از اسٹ۔“ گارڈ نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”وہاں کا کلائی میٹ لیڈیز کو سوٹ کرتا ہے۔ جیسی وہاں کا آبیڈی نوے پر سنٹ زانہ ہے۔“

"مسٹر نمائندہ۔۔۔۔۔ جس میں بات یہ ہے کہ یہ ایک انپارٹ جکشن ہے۔" شیخین ماسٹر چلایا۔

”نڑ میٹل۔۔۔۔؟ ہاں ہاں نڑ میٹل بھی۔“

”رائیٹ۔ ٹرمینل بھی ہے اور جنکشن بھی۔“

”اپنی ہاؤس“ گارڈ پزیر لیا۔۔۔۔۔ ”یہ ہے ضرور۔“

”جی ہاں۔ اور پریم فکر سے بھی۔ بسھی۔“

جی ہاں، جی ہاں۔ نمبر 3 سے پریم نگر کو چلتی ہے۔ نما پلندہ بڑھادیا۔

”اونو۔ نمبر چار سے چتا ہے مثل تھری اپ۔“ گارڈ چلایا۔

”جی ہاں۔ یہی کہہ رہا تھا میں شل تھری اپ۔“ نما پلجند نے معذرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

”لا حول ولا قوة۔“ ٹکٹ کلکرنے منہ بنا کر کہا۔

”نو نو۔“ گارڈ اٹھ بیٹھا۔ ”کوچن یہ ہے کہ لوگ بھول کر پریم مگر ہی کیڑا ڈاؤر ہوتے ہیں۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہی تو ثبوت ہے کہ ناظم صاحب کا کوئی قصور نہیں، لوگوں کا ہے۔۔۔۔۔ لوگوں کا۔“ ٹکٹ کلنٹر مسکرا دیا۔

”ویٹ از اٹ پریم نگر کا پہاڑی علاقہ گرین ہے۔ کھوبصورت اور عقیل پوڑست ہی

”لیکن حضرات سوال یہ ہے کہ جو گاڑی کرائتی سے آتی ہے وہ سیدھی عقل پر کیوں نہ چلی جائے۔ رن تھرو۔۔۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔“

”جی ہاں، جی ہاں۔“ نما پنچہ بیڑا دیا اور پھر چونک کر بولا۔ ”لیکن میں کہہ دیا ہوں.....“

”سلی۔“ لہڈی ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات نہیں چلے گی۔“ ٹینٹ کے

لے صرف ایک راستہ ہے۔ صرف ایک۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن راستے تو وہ ہیں۔“ نما پلخند بڑبڑایا۔ ”دور اہل و راستے جی۔“

”یہاں سنسن۔“ وہ بولی۔ ”آئی مین کرائی سے گاڑی پہلے یہاں آئے۔ پھر وہی گاڑی پریم نے۔“

”لیکو۔ محترمہ۔۔۔۔۔ لوں ہو جائے تو پھر ریجر مگر حائے گا کون؟“ مسٹر احمد داخل ہوتے ہوئے

۷۰

”واٹ۔۔۔؟“ شیخین ماسٹر چلایا۔

”غلطی سے جانا اس فکر کو اور بھی دلچسپ بناتا ہے سٹیشن ماسٹر صاحب۔“ امجد مسکرایا۔

”اونہوں۔“ اس بات سے ہمیں کوئی کسر نہ تھی۔ مسٹر امجد۔ مطلب ہے کہ ہم بیخمنٹ چاہتا ہے بیخمنٹ۔

”لیکن صاحب سوال یہ ہے کہ جو مسافر نگر میں جانا نہیں چاہتے۔“ ٹکٹ کلکٹر بولا۔

”جی ہاں۔ یہی کہہ رہا تھا میں۔“ نہا پلخند نے اپنی عینک سنواری۔

”وہ وہاں نہ اتریں۔ سرکار کا راج ہے مہاراج۔ جبر دُستی نہیں۔“ کیہن میں بولا۔

”لا حول ولا قوۃ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔“ ٹکٹ کلکٹر کا منہ لال ہو گیا۔

”نہیں ہو سکتا رول نمبر 92 کے مطابق وہ بریک جرنی کر سکتے ہیں۔ لڈاؤ ٹنک: ہتھ میں زراعت کی آٹوں۔“ لڈی ٹنک چیکر مسٹر احمد کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔

”استغفر اللہ۔“ ٹکٹ کلکرنے والی جھاڑ کر کہا۔ ”کیا حماقت ہے۔“

”جی ہاں۔“ تمہا پچھد بڑ بڑایا۔ ”رول نمبر 29-اون۔“

”حضرت آپ کو لہڈی ٹکٹ چیکر کو متنبہ کرنا چاہئے۔ ریلوے مینڈ ہو کر وہ مسافروں کو گمراہ کرتی ہے۔“ ٹکٹ کلکس نے کہا۔

”گمراہ کرتی ہے؟“ سٹیشن ماسٹر نے سر کھجلا کر دہرایا۔

”جی ہاں جیسے آپ کو کمپین کرنے والی بیگم نے کہا تھا۔ ایل۔ٹی۔ سی نے اسے غلط اطلاع دے کر رکھایا ورنہ وہ کبھی پریم نگر کیرڈ اور نہ ہوتی۔“

”لیکن۔۔۔ اس سے کیا ہو گا؟“ نہا پلخند نے عینک سنوار کر کہا۔

”ہمارے پاس ایسے بیسیوں ثبوت ہیں۔“ ٹکٹ کلکٹر کا معنی انداز سے مسکراتے لگا۔

”اس بات پر ایل۔ئی۔سی کو انام ملنا چاہئے اور کیا۔۔۔؟“ کیبن مین بولا۔

”جی ہاں۔“ نما پُختہ ہوا۔ ”لیکن انعام۔۔۔“

”لاحول ولا قوۃ“ ٹکٹ ٹکٹ کرنے شہانے ہلاتے ہوئے کہہ

”اس لیے کہ وہ ریلوے کی انکم زیادہ کرتی ہے۔“ کیبن میں چلایا۔

”انکم کا کیا سوال ہے یہاں؟“

”آئی۔ سی۔“ گارڈ بولا۔ ”ہی از رائیٹ۔ فرض کرو ایک پیسنجر غلطی سے پریم نگر جاتا ہے۔“

وہاں ہم اسے چارج کڑے گا۔ تین روپیہ بھڑوہ واپس دوڑا ہوا آئے گا۔ ڈیڑھ روپیہ۔ اب اسے پھر نیا ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔ ”دوڑا ہوا عقیل پوز پر انا نہ ٹکٹ نہیں چلے گا۔ زیٹ ازل۔ چھ روپیہ اس فیروے گا۔ پیو ڈاکم۔“

”انکم نہیں“ یہ دھوکا ہے۔ مسافروں کے ساتھ دھوکہ ”کنٹ کنکٹر چلایا۔“

”جی ہاں۔ روپیہ روپیہ ہے مہاراج۔ دھن ہے مہاراج دھن۔“ نہا پنجد متاثر ہو کر بڑبڑانے

کتابخانه

”لیکن پبلک کولوشنا.....“

”پر سوال اے ہے کہ ہم پبلک بینڈ ہیں یا ریلوے۔“

”ویٹ از اشد ویٹ از اشد“ مرڈو چلایا۔ ”ریلوے نے صاف بول دیا ہے۔ ٹریول

لاش-۴۹

”نان سینس۔“ سٹیشن ماسٹر غصے سے چلایا۔ ”یہاں ہلکا بھاری کا سوال نہیں، انکم اور خرچ کا سوال ہے۔ ہمارا ریپوٹیشن خراب ہو رہا ہے۔ چاہے ہیسنجر غلطی سے پریم ٹکیر کیڑا اور ہو جائیں یا عقل پور۔ ہمارا کنسرن نہیں۔ لیکن ہمارا ریپوٹیشن خراب نہ ہو۔ اتنے بڑے جنکشن کا ریپوٹیشن خراب نہیں ہونا چاہئے۔ آج کل سب سے بڑی کوالیفیکیشن گڈ ریپوٹیشن ہے۔“

”یہی میں کہہ رہا تھا حضرت لیڈی ٹکٹ چیکر کی رپوٹیشن اچھی نہیں۔“ ٹکٹ کلکٹر نے جھرجھری لی۔

”اوڈیم اٹ۔۔۔۔۔ جیٹل میں ہمیں روز شکایتیں موصول ہوتی ہیں۔ اس کو بند ہونا چاہئے۔

عین اس وقت پروفیسر نجمی داخل ہوئے۔ ”اے صاحب۔ یعنی یعنی میجر انڈیا میں

ہونہ۔۔۔۔۔ پر وہ۔۔۔۔۔ مجرا منڈ بس شادی نہ کرتا۔ بڑے سکھی رہو گے۔“

”لیکن فوجی تمہیں کیوں نہ سوجھی یہ بات“ آج سے پانچ سال پہلے۔“

”اپنی کمزوریاں ہر کسی کو پہچانی ہوتی ہیں نہ۔“

”فیروزہ میری کمزوری ہے۔“^{۱۸}

”پانچ سال پہلے تو وہ تمہارا پریم نگر تھی۔ اور اب جب سے وہ پریم نگر مٹی ہے“ اور بھی پیاری

ہو گئی ہے۔ اس کمرے میں یوں سرگرداں پھر رہے ہو جیسے یہ صحرا ہو۔“

”کیا کیا؟“ پروفیسر رک گیا اور دھم سے آرام کرسی میں بیٹھ گیا۔

”مَن سِنس۔ یعنی تمہارے نزدیک ٹھلنا محبت کی دلیل ہے۔۔۔ ویش اٹ۔۔۔“ وہ

جمنجھلایا۔ ”کیا بے معنی کرسی ہے۔“

”آرام کر سی جو ہوئی۔“ امجد مسکرایا۔

”ہائیں؟“ پروفیسر جھٹکا کر بولا۔

”میرا مطلب ہے یہ کرسی صرف اس کے لیے با معنی ہے جو آرام کرنا چاہتا ہو۔“

ٹرورن۔۔۔۔۔ ٹرورن۔ کنٹی جی۔ پروفیسر کبیرا کراٹھ بیٹل۔ ”یہ کیسی کنٹی ہے؟“

”کھبرائے نہیں۔“ شیخن ماسٹر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ اور پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ ”دو“

منٹ میں آپ یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”اوہ۔“ پروفیسر جونکا۔ ”تو میں ریسیو کر آؤں۔ امجد تم چائے منگوا لو۔ اتنی دور سے آرہی

ہے۔ اتنی دور سے۔^{۴۰}

”جی ہاں۔۔۔ ہیں؟“ نہا لچندرک گیا۔ ”یعنی اپنے آپ کو ریسیو کرنے جارہے ہیں۔“

”نہیں مینس۔“ وہ گھورنے لگا۔ ”بیگم کو۔۔۔۔۔ بیگم کو۔“

”لوہ۔“ ”نہا چکند نے آہ بھری۔“

”سوری کیٹ از آؤٹ آف دی بیگ۔“ گارڈ دروازے سے چلایا۔ ”صاحب و فدا از بیوی

عمر بھر کڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”کیوں۔۔۔؟“ امجد نے پوچھا۔

وہ خود بھی بیٹھ رہتا ہے۔ کھانڈ کو بھی بٹھا رکھا ہے۔ کبھی اس کی وینٹگ روم میں انتظار کرتا

تازگی دیتا ہے تازگی۔" وہ ہنس۔

آپ کا مطلب ہے پروفیسر یہاں بیٹھے تازگی پیدا کر رہے تھے۔ ان کی تازگی نے تو گھنٹہ بھر

میں نے مجھے باسی بنا رکھا ہے۔" امجد نے شانے ہلائے۔

بے چارہ گھوڑا دور اہانچا رہا۔“

”تو یہ قصور کس کا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”گھوڑے کا اور کس کا۔ دو سرا پالہ بناؤں؟“

”بس جی آپ کی قلعی کھل چکی ہے اب۔۔۔“ اس نے ترچھی نظر سے گھور کر لاڈ سے

—

”کیا۔۔۔۔۔ میری قلعی؟“

”جی ہاں۔ بہت بنا کرتے تھے۔ میں۔۔۔۔ میں مس امین کو نہیں جانتا۔“ وہ لعل اتارتے

ہوئے بولی۔

”ہمیں نہیں۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔“ پروفیسر پریشانی سے بولا۔

”جی ہاں ائمہ میرے میں ملی ہوگی نہ۔“ وہ اور بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”لا حول ولا قوۃ۔ آخریات کیا ہے؟“

”بات کیا ہوئی تھی۔ بس وہی ایک بات۔ بات بات پر پوچھتی تھی۔ مسٹر جی کو کیوں نہ لائیں

مسٹر نجمی کو ضرور لائیے گا آپ۔ میں ان کے افسانوں کو بہت اڑماڑ کرتی ہوں۔ ہونہ۔۔۔۔

ما تیرے۔“

”الاحول ولا قوۃ۔“ پروفیسر نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا۔

”اونہوں۔ یہ شیطان لا حول پڑھنے سے نہ جائے گا۔“ وہ بولی۔

”لیکن فیروزہ.....“

”اور پھر۔۔۔۔۔ آپ بڑی خوش قسمت ہیں مسز جمی۔ آپ ایسے قاتل رائٹر کی بیوی

— سر کھالیا میرا چڑیل نے۔ ”

”اوه۔“ پروفیسر مسکرائے۔ ”عجیب معاملہ ہے۔“

کمرے میں چار آدمی آگئے۔ اور وہ دونوں چپ ہو گئے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ گجڑی والے پٹھان نے دستا لے امارتے ہوئے کہا۔ ”پریم نگر، خاک نگر“

دھول اڑتی ہے دھول۔“

”آپ پریم نگر سے آئے ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”جانتا تو نہیں تھا لیکن جا پہنچا۔ پھر وہی ٹائیس ٹائیس فٹ۔ سنا تھا بڑا اچھا شہر ہے لیکن خاک۔

رتیں ہی عورتیں ہیں۔“

”اچھا جی۔“ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”عورتیں۔“

”اور مرد۔۔۔۔۔ اکا دکا مرد۔ بوکھلایا ہوا۔ جیسے شیش محل میں جاٹ۔“

”اچھا جی۔“ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”سب عورتیں۔“

تیسری میز پر بیٹھا ہوا سردار بولا۔ ”بس جی پریم نگر کو جانے والی گاڑی کی صرف ایک پہچان ہے، صرف ایک۔“

”وہ کیا؟“ بنگلی بابو نے بیڑی کو سلگاتے ہوئے شوق سے پوچھا۔

”آپ پریم نگر نہیں جانا چاہتے؟“

”اونہوں۔“ بنگلی بابو نے سر ہلایا۔ ”بالکل نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ بالکل نہیں۔“

”تو صاحب اس گاڑی پر نہ بیٹھیں جس کے ساتھ دو انجن لگے ہوں۔ ایک آگے، ایک پیچھے۔“

”دو انجن۔ ایک آگے ایک پیچھے۔“ بنگلی نے یوں دہرایا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

”پہاڑی علاقہ ہے۔ ایک انجن سے کام نہیں چلتا۔“ سردار بولا۔

”پہاڑی علاقہ۔“ بنگلی بابو نے دہرایا۔ ”ہل۔۔۔۔۔“

”کھن کھول کر سن لو بیگم۔“ پروفیسر نے جھک کر فیروزہ کے کان میں کہا۔ ”دو انجن۔ آخر ہمیں کتنی بار کرائتی سے عقل پور آتا ہو گا۔“

”رورن۔۔۔۔۔ رورن۔“ گھنٹی کی آواز آئی۔ اور وہ سب اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی باہر نکل گئے۔

”بس ایک پیالہ اور۔۔۔۔۔ تھینک یو۔“ فیروزہ بولی۔

”لیکن گاڑی۔“ پروفیسر بڑبڑایا۔

”ابھی بہت وقت ہے۔ پانچ منٹ رکے گی یہاں۔“ وہ کراہی۔

”سٹیشن ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ سٹیشن ماسٹر صاحب۔“ نما پلندہ گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ ”وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”وٹ از دی ٹریل؟“ گاڑی دروازے میں کھڑا ہو کر غور سے نما پلندہ کو دیکھنے لگا۔

”سپرٹنڈنٹ۔۔۔۔۔ سپرٹنڈنٹ۔“ نما پلندہ چلایا۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔ وہ آئے ہیں۔“

”کیا کہا؟“ سٹیشن ماسٹر نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔ وہ آئے ہیں۔ ڈاکوٹن میں۔۔۔۔۔ سپرٹنڈنٹ۔“

”گڈ لارڈ۔“

”میں ان سے ملوں گا۔“ پروفیسر اٹھ بیٹھا۔ ”میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ انتظام میں خرابی

ہے۔ اور پنجر کو خواہ مخواہ کو فت ہوتی ہے۔“

”اونہوں۔۔۔۔۔ وہ نہ مل سکیں گے۔ اونہوں۔۔۔۔۔ بہت گزربیشن ہے۔“ کیمین مین نے

داخل ہو کر کہا۔ ”سیلون کا دروازہ بند ہے۔“

”نہن سس۔“ سٹیشن ماسٹر چلایا۔

”جی ہاں، جی ہاں۔“ نما پلندہ بڑبڑایا۔ ”وہی نہن سس۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ ٹکٹ کلرک بھاگا بھاگا آیا۔ ”ضرور کوئی غلط فہمی ہے۔“

”ڈیلیٹ۔۔۔۔۔ بات کیا ہے؟“ سٹیشن ماسٹر غصے میں بولا۔

”حضرت آرڈر یہ ہے کہ ان کی سیلون عقل پور کی جانے والی گاڑی سے لگادی جائے۔“

”جی ہاں۔“ نما پلندہ بولا۔ ”عقل پور کا دورہ کر کے وہ یہاں آئیں گے۔“

”آپ نے سنا۔“ امجد نے داخل ہو کر کہا۔ ”لیڈی ٹکٹ چیکر کو پریم نگر کا سٹیشن ماسٹر بنا دیا گیا ہے۔“

”نہن سس۔“ سٹیشن ماسٹر چلایا۔

”ابھی سپرٹنڈنٹ صاحب کا حکم ملا ہے ابھی۔ ایل۔ ٹی سی ابھی بوگی میں ہے۔“ ٹکٹ کلرک چلایا۔

”کون سی بوگی میں؟“ سٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ نما پلندہ بولا۔ ”سپرٹنڈنٹ کی بوگی میں۔“

”ہیونز۔“ پروفیسر چلایا۔ ”بیگم تم چلو، میں ابھی آیا۔ مسٹر امجد فیروزہ کو لے چلے۔“

”شوق سے۔“ امجد فیروزہ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”جلدی آنا پروفیسر۔ گاڑی چلنے والی ہے۔“

”وٹ از آل ویری سٹریٹ۔“ گارڈ ہنسا۔

”ول ول۔“ سٹیشن ماسٹر بولا۔ ”مسٹر سبین مین ان کی بوگی عقل پور سے لگانے کا انتظام کرو۔

اچھا تو گڈ بائی پروفیسر۔“ وہ پروفیسر سے مخاطب ہوا۔

”رائیٹ۔“ پروفیسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سولانگ جیشل مین۔۔۔۔۔ سولانگ۔“ اور

وہ دو انجن دو انجن بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

”پروفیسر کہاں ہے سٹیشن ماسٹر صاحب؟“ امجد دوڑتا ہوا آیا۔ ”وہاں گاڑی چلنے والی ہے اور

ان کا پتہ نہیں۔“

”پروفیسر تو چلا گیا۔“ سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔۔۔ خود۔“

”کہاں؟“ امجد چلایا۔ ”لو عقل پور کی گاڑی تو چل بھی پڑی۔“ امجد نے کوک سن کر کہا۔

۴۲

”لا حول ولا قوۃ کیا مصیبت ہے۔ اب بیگم عقیل پور جا پہنچے گی اور میاں پریم نگر۔“ امجد ہنسنے

۱۶۱

”ڈیلیٹ آف آل۔“ سٹیشن ماسٹر بڑھایا۔

”بالکل گزربزیشن ہے ٹیشن ماسٹر صاحب۔۔۔۔“ کیبن میں بھاگتا ہوا آیا۔ ”وہ بوگی۔۔۔۔۔“

”خدا خیر کسی نے غلط کاٹنا موڑ دیا اور۔۔۔ اور۔۔۔“

”وہ بوگی پریم نکر والی تھری اپ سے لگ گئی۔“

”گڈ لارڈ۔“ شیش ماسٹر چلایا۔ ”اب کیا ہو گا؟“

”اب۔۔۔ جی۔“ نما پخند بیڑوانے لگا۔ ”یعنی میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ مرو ہے تو واپس

یہاں آجائے گا۔ اور اگر عورت ہے تو.....“

”وہ کون؟“ امجد نے پوچھا۔

”سپرٹنڈنٹ۔۔۔۔۔ جی ہاں سپرٹنڈنٹ۔“ ”نہا چاند بولا۔

”سٹ اپ۔“ شیخ ماسٹر جی گروا۔ ”نہیں سہ۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہی کہہ رہا تھا میں۔۔۔۔۔ میں مینس ہے پھر تو شٹ اپ۔ مطلب ہے کچھ

نہیں کہا جاسکتا!“

میاں کی مرضی

”توبہ۔۔۔ اس گھر میں کوئی کسی کے لئے بھی۔ یہاں تو بس انہیں کی چلتی ہے۔ چاہے کوئی چیخ چیخ کر مرجائے۔ انہیں اپنی مرضی سے کام۔“ سعیدہ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے چلائی۔ اور پھر حشمت کی مستفسرانہ نگاہ کو دیکھ کر بولی۔ ”کہتے ہیں فرنی ضرور ہوگی کل کھانے پر۔ اور ٹکڑے۔ ٹکڑے۔ تو آخر ٹکڑے ہی ہیں۔ چاہے ذیل روٹی کے ہی ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ نہ سنیں گے کسی کی۔ بس لے لیا مزہ پوچھنے کا۔۔۔۔؟ میں تو اس گھر کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ مجھ سے کیا چھپا ہے۔۔۔۔ ابھی تو کل ہی ان کی منہ چڑھی کارونا ختم ہوا اور آج دعوت کا بھنگڑا لا کھڑا کیا۔ اب کوئی کیا کرے۔ اور وہ چیل۔۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔۔ گھر میں کھرام چار کھا تھا اس نے۔ گئی ہے تو آرام کا سانس لیا ہے۔ دن بھر کبھی بیچے، کبھی اوپر۔ گھر کی دیواریں بھی کانپ اٹھی تھیں۔۔۔۔۔ اب ایک مینہ تو آرام سے کٹے گا۔“

سعیدہ نے اپنا وہ پہلا تار کر دووازے پر لٹکادیا اور ہنڈیا کی چوٹی اتار کر بولی۔ ”حشمت ذرا سا بیٹی تو دے۔ دیکھ تو بالکل ہی سوکھ گئی ہے۔ نہ جانے کہاں سے گوشت لے آتا ہے یہ رہیما۔ اللہ مارا کٹنے میں نہیں آتا۔“ پانی کا گلاس بے کراستہ ہنڈیا میں چار ایک چھینے دیئے اور چمچ ہلانے لگی۔

”ایک مہینے کے لئے گئی ہے کیا؟“ شہمت نے کہہ کر اسے از سر نو چھیڑ دیا۔

”کیوں۔۔۔؟“ سعیدہ چونکی۔ ”ایک مہینہ زیادہ ہے کیا۔۔۔؟ ایمان سے کہنا حشمت۔“

ایسے لپھن تو نے دیکھے ہیں کسی کے۔ آخر ہمارے زمانے میں بھی پڑھا کرتی تھی لڑکیاں۔ میں نے بھی پوری سلت جماعتیں کی ہیں۔ پر ہم کو تو باتیں بنانا نہ آیا۔ کہیں آئینہ دیکھا جا رہا ہے۔ اب بال بنائے جا رہے ہیں۔ اب اس کھڑکی میں سے لٹک رہی ہے۔ پھر اس مندر سے جھانکا جا رہا ہے۔ دوپٹہ نکلتا نہیں سر پر۔ کبھی لو پر کبھی نیچے۔ اوھر لٹک، اوھر ٹٹک۔ تو یہ ہے۔“

”توبہ بی بی آج کل کی لڑکیاں۔“ شہمت نے داد طلب نگاہ سے دیکھا۔

حشمت بھی گرم ہو گئی۔ ”آخر کب تک رہو گی چپ۔ جب کسی کے ساتھ.....“

بلا تا نہیں۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔ اور کیا بولے؟“

”بس اور کیا کتا تھا۔ بات بات پر بچی بچی کر رہے تھے۔“

”ہائے ری حشمت باپ تو آپ اندھا ہو رہا ہے۔ اب کوئی کیا کرے اور وہ چھوڑی۔ توبہ کس قدر پکی ہے۔ بال پن آیا ہی نہیں کبھی۔ میں تو دو سال سے یہی حالت دیکھ رہی ہوں۔ تمیں یاد ہے، پچھلے سال جب اس نے کہیں سے سن پایا تھا کہ اسلم کی بات ہو رہی ہے۔ توبہ۔۔۔۔۔! لڑکی نے پورا ہفتہ منہ سجائے رکھا اور میرے منہ پر تو صاف جتا دیا، میں دیکھوں گی۔ میرے متعلق کون ایسی دیکسی باتیں کرتا ہے۔ دو کوڑی کا آدمی میرے لیے رہ گیا ہے کیا؟ پر انشا اللہ دو کوڑی کا ہی ملے گا۔“

”میں کہتی ہوں اسلم نہیں تو اور سسی، رشتوں کا کیا کال ہے۔ بی بی۔۔۔۔۔ وہ ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے۔“ حشمت بات سمجھے بغیر بڑبڑاتی۔

”کیوں اسلم کو کیا ہے۔ کوئی لولا لجا ہے کیا۔ اللہ رکھے پڑھا لکھا ہے۔ اور پھر ہوا بھی اپنا قہر۔ اس کے لیے اس سے بہتر رشتہ ملے گا کمال۔۔۔۔۔؟ اور وہ ڈپٹی صاحب۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہے۔ اللہ رکھے لڑکا ایم اے میں ہے۔ پر تو جانتی ہے نا۔۔۔۔۔“ سعیدہ نے ایک معنی خیز نگاہ سے دیکھا اور پھر ہاتھ چلا کر بولی۔ ”ہائے ری۔۔۔۔۔ تیری سمجھ کو کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ ایمان سے کیو۔ یہ لڑکی گھر بسائے گی کیا۔ تو میں کیوں آؤں اس بات میں۔ مجھے اپنی ناک چوٹی کی لاج نہیں کیا۔۔۔۔۔ ہیں؟“

”نہ نہ بی بی۔ تجھے کیا پڑی۔ تیری بلا سے۔ پر مصیبت تو یہ ہے کہ ایک بار انکار کرنے کے بعد وہ کب اسلم کی بات ماننے لگے۔“

”اللہ تیرا بھلا کرے۔ یہی تو مصیبت ہے۔“

”پھر ہو گا کیا؟“

”ہو نا کیا ہے۔ بس وہی ہو گا جو ہوا کرتا ہے اس گھر میں۔ ان کی مرضی اور کیا۔ یہاں کون سنتا ہے کسی کی؟“

”آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہئے تمہیں۔ تم کیا برا چاہو گی اس کا۔ تم تو بلکہ لڑکی کی بھلائی ہی سوچتی ہو نا۔“

”ہائے حشمت میرا تو جی ہی ایسا برا ہے کہ کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اپنے دل کو کیا کروں۔ کسی دشمن کو بھی نہ دے ایسا دل۔ نہ جانے لوگ کسی کی برائی کیسے کرتے ہیں۔ ہم سے تو نہ ہو سکی یہ بات۔“

”پر بی بی۔ یوں نہ بنے گی بات۔ تم ان سے بات تو کرو۔“

”اچھا تو جو کہتی ہے تو کہہ دیکھوں گی میں۔۔۔۔۔“

”نہ میں مجبور نہیں کرتی بی بی۔ تیری اپنی مرضی ہے۔ نہیں مانتے تو تیری بلا سے = دفع کر۔“

”اچھا تو دیکھ تو سہی۔“ سعیدہ بولی۔ اور پھر چولہے کی طرف منہ پھیر کر مسکراہٹ بھیجنے لگی۔

”ایں کوئی ان جانا تبسم خواہ خواہ اس پر چھائے جا رہا تھا۔ گوشت بھونٹے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے اس کی بغل میں کچھ پھڑپھڑا رہا ہو۔ قیض تنگ ہوئی جا رہی تھی۔ اور بدن پر چیونٹیاں چل رہی تھیں۔ نہ جانے وہ راز کیا تھا جو یوں اس کے بدن میں لہرس لینے لگا تھا جسے وہ اپنی رازدان حشمت سے تو کیا اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔“

پکانے سے فارغ ہو کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ ہل ہٹائے۔ غاڑہ مل کر کاہل کی دھار لگائی اور پھر نیا چٹا ہوا دوپٹہ شانوں پر ڈال انتظار میں بیٹھ گئی۔

”میاں کے سامنے کھانا جن کر سعیدہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔“

”بہت دیر ہو گئی آج۔“ وہ بولی۔

”ہیں۔۔۔۔۔؟“ خان صاحب چونک کر بولے۔ ”ہاں کچھ کام تھا۔“ انہوں نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

”کچھ اچھی بھی بنی ہے کچنار؟“ سعیدہ خواہ خواہ مسکرائی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ اچھی ہے۔“

”آج کل تو ملتی ہی نہیں۔ میں نے حشمت کو سبزی منڈی بھیج کر منگوائی ہے۔ میں نے کہا وہ ایک وقفہ تو پکالوں۔ آپ کو پسند جو ہوگی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ ہاں۔“ انہوں نے ہڈی چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”پانی۔“

”توبہ دو دن سے گھرویراں پڑا ہے۔“ سعیدہ نے پانی دیتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہا۔

”ہوں۔۔۔۔۔؟“ ان کے ماتھے پر تیوری بن گئی۔

”خالہ جو چلی گئی ہے۔ توبہ اکیلا بھی کوئی نہ ہو۔“

”ہاں۔ اس کی ٹانگیں اصرار کر رہی تھیں نا۔ یہ عورتیں۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔!“

”اللہ رکھے اس سال دسویں کرے گی۔ اب تو جوان ہو گئی ہے۔ آپ کو فکر بھی ہے اس کی۔“

”ابھی پچھ ہے۔ دیکھا جائے گا۔“ وہ بھرے ہوئے منہ سے مشکل سے بولے۔

”واہ میں کیا یہ کہتی ہوں کہ ابھی کر دو شلوی۔“ سعیدہ نے لاڈ سے کہا۔ ”پر نامزد تو کر دینا چاہئے۔ کوئی کھانا پیتا شریف خاندان ہو۔ آج کل لائق لڑکا تو ملتا نہیں۔ لوگ پہلے ہی سے بات چیت ملے کر لیتے ہیں۔ ورنہ شلوی کی جلدی ہی کیا ہے۔“

”کننے والی بات بھی ہو۔“ وہ روئی روئی آواز میں بولی۔ ”وہ تو سب یہ بات چھپائے بیٹھے ہیں۔“

”اچھا بابا تمہاری مرضی ہی سہی۔“ وہ مسکرائی۔ دو بڑی بڑی بانوں نے اسے گھیر لیا۔ ”بڑی گستاخ ہوتی جاتی ہے۔“ وہ مسکرائے۔ ”ہونہہ گستاخ۔“ وہ بڑھپوانے لگی۔ ”اتنی فرماں بردار تو ہوں۔“ اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا۔

ہر مرتبہ جب میں بینک سے ملتا تو مجھے محسوس ہو گا گویا ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔ اس کے انداز میں کچھ ایسا ناپاں تھا جو اکثر یگانگی بے نیازی میں بدل جاتا تھا۔ لیکن وہ اسے خوب پھبتاتا تھا۔ اب وہ معصومتی سے گردن موڑ کر کہتی۔ ”کسے۔ آئیے۔ آگئے آپ۔“ اس وقت اسے یہ قطعی

عین اس وقت زبردست گرج کی آواز سنائی دی اور ہوا زور سے چلنے لگی۔

”راستہ بھول گئے۔ راستہ بھول گئے۔ راستہ بھول گئے۔“ ہر جھاڑی میں اس کی بات گونجنے لگی۔ ”بھول گئے۔“ بادل گر جا۔

بڑھے نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ پھر انگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اوہرا نکھ اٹھائی۔ دیکھتا ہوں کہ پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک قطعہ نما مکان کھڑا ہے۔ مکان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ کاش گڑھ کے راستے میں کوئی ایسا مکان نہ تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ واقعی میں راستہ بھول چکا ہوں۔

میں گھوڑے سے اترا۔ اور بڑھے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ مکان ایک وسیع و عریض گرویران ٹانک چندی قلعہ ہے۔ میدان پر پتھر میں ”الصدق“ کندہ تھا۔ ”تمہارے آقا ناراض تو نہ ہوں گے؟“ میں نے بڑھے سے پوچھا۔ ”نہیں۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”خوش۔“

”پھر وہ گھوڑا لے کر چلا گیا اور میں تن تنہا وہاں کھڑا رہ گیا۔ عین اسی وقت بلائی منزل میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک بقی روشن ہو گئی۔ کھڑکی میں دہلی پتلی او اس حسینہ آکھڑی ہوئی گویا کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

”آئیے۔“ بڑھے نے واپس آ کر مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

اب میرے تمام شبہات مٹ چکے تھے۔ بلکہ میں خوش تھا کہ رات کاٹنے کے لیے ایک محفوظ جگہ مل گئی۔ دو ایک اندھیرے کمروں کے بعد زینے سے ہوتے ہوئے ہم دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں میں نے حسینہ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک وسیع کمرہ تھا جس کا ایک حصہ باریک پردے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ بڑھا مجھے اس پردے کے پیچھے لے گیا۔ اور پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ کمرے کے بڑے حصے میں ایک مدھم سی بقی جل رہی تھی۔ پلنگ اور پلنگ پوش دونوں پرانی وضع کے تھے مگر تھے دونوں ہی قیمتی۔ بچھونے پر گرد و غبار کی تہہ جھی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ بڑھے کا آقا مسمان نواز تھا لیکن اسے رکھ رکھاؤ کا طریقہ مطلقاً نہ آتا تھا۔ اس غبار آلود پلنگ پر سونا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے مڑ کر بڑھے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ بڑھے کی اس غلت پر مجھے حیرانی ہوئی۔ مایوس ہو کر پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ تمام کمرہ گرد آلود تھا۔ گویا برسوں سے کسی نے جھاڑا نہ ہو۔ بستر کے علاوہ کمرے کا سارا فرنیچر بے حد پرانا تھا۔ اگرچہ تھا قیمتی۔ فرش پر کشمیری قالین بچے ہوئے تھے۔ دو ایک چوکیاں جو یہاں وہاں رکھی تھیں۔ بہت بھاری اور بھری تھیں پر لے کوئے میں ککڑی کا جالی دار پردہ کھڑا تھا۔ جس کے پاس ہی دیوار پر ایک عجیب سی شکل کا کلاک لٹکا ہوا تھا۔ جس

کے پنڈولم کی رفتار اس قدر ست تھی کہ اس کے چلنے کی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ شمع دان پر ایک چراگتہ رکھا ہوا تھا جس پر جلی اور خوش خط قلم سے ”بیگم آصف الدولہ“ لکھا تھا۔ پاس ہی ایک کیلنڈر لٹکا ہوا تھا جس پر دسمبر کی تاریخ لگی ہوئی تھی۔ دسمبر۔ میں نے حیرانی سے اسے دوبارہ دیکھا۔ اس دن تو جون کی گیارہ تھی۔

بائیں میں نے دیکھا۔ وہی حسینہ چپ چاپ چوکی پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں 31 دسمبر کو قطعی بھول گیا۔ حسینہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ کمرے میں مدھم آہ تیرنے لگی۔ اس کی آنکھیں موٹی تھیں اور جسم لچک دار۔ اگرچہ لباس پرانی وضع کا تھا لیکن اس لباس میں وہ کس قدر بیاداری لگتی تھی۔ نہ جانے بے چاری کو کیا دکھ تھا کہ اس قدر اواس تھی۔

باہر دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ ”سعیدہ۔“

حسینہ نے اپنا سر اٹھایا۔ ”اسفند۔“ اس کا چہرہ خوشی سے چمکا۔

ایک خوش رو جوان کمرہ میں داخل ہوا۔ سعیدہ اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

”تم آگئے اسفند۔“

”ہاں میں آ گیا۔“

”میں جانتی تھی کہ تم آؤ گے۔“

”تمہارے میاں؟“

”اوہ۔“ وہ گنگنائی۔

”کیوں؟“

”چلے گئے۔“

”اوہ۔“ جوان مسکرایا۔

”دونوں چوکی پر بیٹھ گئے۔ جوان نے اپنی مرصع پگڑی اتار کر رکھ دی۔

”سعیدہ۔“ جوان نے آہ بھری۔

”اسفند۔“

”اوہ سعیدہ۔“

”کمرہ میں دو میسم آہیں تیرنے لگیں۔“

”اگر وہ آگئے تو؟“

”ایسا نہ کہو۔“ سعیدہ نے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی۔ جوان نے اس کو چوم لیا۔

”تم میری ہو؟“

”اوہ۔“ کمرہ میں دو آہیں گونجیں۔ مدھم اداس آہیں۔

”یہ پگڑی؟“ آصف الدولہ نے چوکی سے نوجوان کی پگڑی اٹھا کر حیرانی سے کہا۔

”بیگم بے پرواہی سے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔“

”بیگم۔۔۔ کوئی آیا تھا۔؟“

”نہیں تو۔“ وہ وہیں سے بولی۔

“!-----”

”آصف الدولہ نے کمرہ میں چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں لکڑی کے پردے پر جم

گئیں۔ کمرہ کے ہر کونہ سے آپیں ستائی دینے لگیں۔“

”آپ کو شک ہے کیا؟“ بیگم نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

”نہیں تو۔“

“?——/”

آصف الدولہ پردہ کی طرف بڑھا۔ بیگم نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اگر وہاں کوئی نہ ہو“

Figure 1 is a line graph illustrating the percentage of the total sample for various age groups over time. The x-axis represents years from 1950 to 2000, and the y-axis represents the percentage of the total sample, ranging from 0 to 100. The age groups are: 0-14, 15-24, 25-34, 35-44, 45-54, 55-64, 65-74, and 75+. The graph shows a general trend of decreasing percentages for younger age groups and increasing percentages for older age groups over time.

”تو؟“ وہ رک گیا۔

بیگم شمع دان سے وہ گتہ اٹھا لائی جس پر بیگم آصف الدولہ لکھا ہوا تھا اور اسے یوں پھاڑ دیا کہ

ر آصف الدولہ الگ الگ ہو گئے۔ ”تو کہہ کر اس نے وہ ٹکڑے الگ الگ میاں کو دکھادیئے۔

آپ نہایت متانت سے باہر نکل گئی۔ اور باہر دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔

"!-----03!"

”ہوں۔“ کمرے میں اواسی آہیں گونجنے لگیں۔ آصف الدولہ بے تابانہ اوہرا اوہر ٹھٹھاتا

رہا۔ اس کا چہرہ ہلکی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”آؤ۔“ بیگم نے آہستہ سے پکارا۔

”ہوں۔“ وہ چونک پڑا۔ اور پھر اس کی چوکی پر بیٹھ گیا جو اس کو نے میں اندھیرے میں پڑی

تھی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑانے لگا۔ ”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو۔۔۔۔۔؟“

”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو۔۔۔؟“ وہ کمرہ میں ہلکی ہلکی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ گویا وہ تانین اور

کلاک باری باری اسے دھرا رہے تھے۔

”بیگم کہاں ہیں؟“ ایک بار عب نگرد ہم آواز آئی۔

”بڑے کمرے میں حضور۔“

”اس وقت؟“

”جی۔“

”اچھا تم جاؤ۔“

پھر ایک مدھم مگر گہری آہ کی آواز آئی جو کافی دیر تک میرے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ پھر کوئی

پروردانے لگا۔

”وہ بے آرام ہوگی۔ کل ہو جائے گی اطلاع ہمارے آنے کی۔ لیکن۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ اس

سے دور رہنا کتنا مشکل ہے۔“

پھر بڑے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں چونک پڑے۔ ”کون ہے؟“ وہ

بولی۔

“ ”

”اوہ۔“ کمرہ میں آہ تیرنے لگی۔ دونوں خوف سے بھوت بن گئے۔ سعیدہ نے گھبرا کر ادھر

ادھر دیکھا۔ پھر مسکرا کر جالی دار پردے کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ پردے کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

”بیگم ہم ہیں۔“ پھر دستک ہوئی۔

سعدہ نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ”آپ۔۔۔؟ اس وقت۔۔۔؟“

”ہاں اس وقت۔ آرام کر رہی تھیں کیا؟“

”آپ آگئے۔“

”ہاں تم سے دور رہنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے یکم۔“

ڈر کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن حلق میں آواز نہ تھی۔ میں بھاگا اور نہ جانے کیسے ٹھوکریں کھاتا ہوا سیڑھیوں میں جا پہنچا۔ وہاں وہی بڑھالا نین اٹھائے سڑک کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ دروازہ پر میرا گھوڑا کھڑا تھا۔

”چلے۔“ اس نے مجھے گھوڑا پکارتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں چپ چاپ پگڈنڈی کی طرف چل دیے۔

میرے دائیں بائیں چاروں طرف سے مدھم اور مدھم آوازیں آرہی تھیں۔
 ”اب ہم آزاد ہیں۔ بیگم آزاد ہیں۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب کو آزاد کرا دیں۔ سب
 قیدیوں کو آزاد کرو۔ قیدیوں کو آزاد کرو۔“

”میں نے جی پر آصف الدولہ کھڑا گنتا رہا تھا۔“ سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ قیدیوں کو۔ تم آزاد ہو۔۔۔ آزاد۔“ خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ ”بھوت۔“

”بھوت۔“ پڑھا چلایا اور اپنی بلوریں آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اس کا چہرہ ڈر سے بھیانک ہو گیا۔ اور وہ کانپ کانپ کر گر پڑا۔ لالین گل ہو گئی۔

”میں نے فوراً“ نارچ جلائی۔ گیند نڈی ویران پڑی تھی۔ وہاں نہ بڑھا تھا اور نہ اس کی لائین۔ میں نے نارچ کی روشنی اپنے گرد چاروں طرف پھینکی۔ ارد گرد کسی مکان کا نام و نشان نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، جہازوں کا ایک وسیع پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا۔

سائے دور دو ایک میل پر کاش گڑھ کی مسجد کے گنبد صبح کے دھندلکے میں جھلکا رہے تھے۔

”آزاد۔۔۔۔۔“ کوئی موذن مینار پر کھڑا چلا رہا تھا۔ ”آزاد۔
 نہ جانے کیا ہوا مجھے۔ دفعتاً میرے دل کا دور دور ہو گیا۔ اطمینان سا پیدا ہو گیا۔ ایسے محسوس
 ہونے لگے جیسے وہ تمام زنجیریں کٹ گئی ہوں جو مجھے جکڑے ہوئے تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ کاش کڑھ کو جانا ہے کار ہے۔ نہ جانے کیوں۔ حقیقت حل جانے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ میں نے گھوڑے کا منہ واپس بھور گھٹ کی طرف موڑ دیا اور اسے ایزنگا دی۔

کئی ایک سال کے بعد مجھے پہلی مرتبہ کشمیر جانا پڑا۔ پہاڑوں میں پھرتے پھرتے ایک دن میں حسن واہی کی طرف جا نکلا۔ راہ میں ایک ویران سے دروازے پر جو نظر پڑی تو میں حُسن۔ دروازے کے پتھر پر ”الصدف“ کتبہ تھا۔

میں نے مکان کی طرف دیکھا۔ اُف۔۔۔۔۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نکشائی گویا

”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو۔۔۔۔۔“ اس کا چہرہ ایک ساعت کے لیے نہ جانے خوف یا غصہ سے چمکا۔ وہ اٹھ بیٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ چاپ آہستہ سے بیٹھ گیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ پروڑایا جیسے کوئی خوف ناک فیصلہ کر چکا ہو۔

”اب آہی جاؤ۔“ یتیم باہر سے بولی۔ ”آؤ بھی نہ۔“

نوجوان لکڑی کے پرودے سے باہر نکل آیا۔ بیگم نے اسے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔
 آصف الدولہ نے شکستوں سے اسے دیکھا۔ لیکن مرجھائے رکھا۔ پھر وہ بڑبڑایا۔
 ”کوئی ہے۔۔۔ خدمت گار ہے۔ خدمت گار۔ جاؤ ہمارے لیے حمام تیار کرو اور بیگم کو
 یہاں بھیج دو۔“ ان لفظوں کو کہتے ہوئے آصف الدولہ کے ماتھے پر کرب کی ایک لہریدا ہوئی۔ اور
 اس کی روح میں ڈوب گئی۔ ایک ساعت کے لیے اس کا چہرہ لافیت سے بھیانک ہو گیا۔
 نوجوان پہلے تو ذرا اور حیرانی سے ٹھٹھا لیکن پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ میں پہنچ کر
 اس نے بیگم کی طرف پر معنی نگاہ ڈالی لیکن سعیدہ نے منہ موڑ لیا اور اندر آگئی۔
 کمرہ میں عرصہ تک خاموشی چھائی رہی۔ کراہ زوہ خاموشی۔

”تم آگئیں سعیدہ۔“ آصف شوق سے اٹھ بیٹھا۔
 بیگم کی آواز میں شرمساری کی جھلک تھی۔
 ”منعوم کیوں ہو۔ آویں۔“ آصف بولا۔ ”بیگم تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“
 ”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ پریشانی کی وجہ سے بیگم کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔
 کمرہ میں ایک قہقہہ گونجا۔ ”یہ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔ کیا مذاق کر رہی ہو
 سعیدہ؟“

”مجھے افسوس ہے۔“ سعیدہ گنگنائی۔
 ”الٹا ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے تم پر شک کیا۔ ہمیں معاف کر دو سعیدہ۔“ اور وہ دونوں آپس
 میں لپٹ گئے۔

انہیں تھلے میں دیکھنا مجھے گوارہ نہ تھا۔ میں نے جھٹ آنکھیں پچی کر لیں۔ لیکن وہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ وہ عورت کس قدر چالاک تھی اور وہ مرد سب کچھ جاننے کے باوجود۔۔۔۔۔ سارا قصہ ہی عجیب تھا۔

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ انگریٹھی پر ایک کی بجائے دو دیئے جل رہے تھے۔ دونوں شعلے ابھر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ شعلے بہت بلند ہو گئے اور اوپر جا کر یوں خم کھا کر مل گئے کہ ایک عراب بن گئی۔

گلے میں پھندہ بن گئی۔ بالکل وہی۔ وہی الہدف جہاں میں نے وہ رات بسر کی تھی۔ وہی بیڑھیاں، وہی دروازہ اور چوبارہ۔ وہی ”الہدف“ جو اس رات بحور مندر سے کاش گڑھ جانے والی ویران پکڑنڈی پر آگیا تھا۔

وہ قلعہ نما مکان ویران پڑا تھا۔ صرف چار دیواری کھڑی تھی۔ چھتیں بوسیدہ ہو کر گر گئی تھیں۔

”یہ مکان کس کا ہے؟“ میں نے ایک میرے سے پوچھا جو مجمعہ کو اڑ میں رہتا تھا۔

”معلوم نہیں جناب۔“ وہ بولا۔ ”یہ تو برسوں سے یونہی ویران پڑا ہے۔“

عین اس وقت وہ بڑھا عیسائی وہاں آگیا جو پڑوس میں رہتا تھا۔

”یہ مکان؟“ اس نے کھانتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

”یہاں یہی۔“

”یہ مکان کسی نواب صاحب کا تھا۔“

”اب کیا اس کا کوئی وارث نہیں؟“

”اونہوں۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”مکان پر بجلی کوندی اور سب مر گئے۔ ایک قیامت پیا ہو

گئی تھی یہاں اس روز۔ کوئی ساٹھ سال ہوئے ہوں گے۔ صاحب ساٹھ سال۔ میرا مکان پاس ہی ہے وہاں۔ ہاں وہ رات 31 دسمبر کی رات تھی۔ ہم نئے سال کی خوشی میں لگے ہوئے تھے کہ نواب صاحب کا سارا کنبہ تباہ ہو گیا۔“

”تباہ ہو گیا۔“ میں نے دہرایا۔

”ہاں جب سے یہ محل نما مکان ویران پڑا ہے۔“

صاحب ساری رات نہ جانے کیا کیا چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ کبھی کوئی آزاد آزاد چیختا ہے۔ کبھی بیگم بیگم اور کبھی قیدیوں کو آزاد کر دو۔ ”میرا بولا۔“

”اس نواب کا کیا نام تھا؟ بڑے میاں تمہیں یاد ہے کیا؟“ میں نے شوق سے مہوت ہو کر

پوچھا۔

ایک منٹ کے لے بڑھا خاموش رہا۔

”ہاں ایسا ہی تھا کچھ۔ نواب دولا۔۔۔۔ آصف دولا۔“

”آصف الدولہ۔“ حیرانی سے میری چیخ نکل گئی۔

”آزاد کر دو۔“ مکان سے کوئی پرگاڑ چیتی ہوئی اڑی۔۔۔۔ ”آزاد کر دو۔“

راں ٹیاں

”ہائیں۔۔۔۔!“ پھول دابر لینگے والے نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا۔ ”ج؟“

”ہاں۔“ بڑھے نے داڑھی جھاڑ کر کہا۔ ”سب کار کھ رکھاؤ اکیلی کرے ہے وہ بدرائیں۔“

”گھر میں کوئی نہیں کیا؟“

”بھی کھیت پر رہیں ہیں۔ بھائی، باپو چاچا۔۔۔۔ ساری بستی میں چار ایک مرد ہوں گے۔

ویسے تو آتے جاتے رہتے ہیں ہفتے میں ایک بار۔“

”اچھا۔“ نوجوان ہنسا۔۔۔۔ ”معلوم ہوتا ہے انہیں کوئی ملا نہیں۔“

بڑھا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”میں یہ ران ٹیاں ہے۔۔۔۔ ران ٹیاں سمجھے۔۔۔۔؟ وہ پھر ہنسنے لگا۔

اپنے چودھری کا گھر سونے سے بھرا ہے۔ پریوں سمجھو جیسے مندر میں مورتی۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ تھک اٹھا کر دیکھے۔ لو وہ ریا کنواں۔ درختوں کے اس جھنڈ میں ہے۔ پی لو پانی جا کر اس جھنڈ میں اللہ بلی۔ یہ کہہ کر بڑھا نڈی پر اتر گیا۔

”بدرائیں۔۔۔۔!“ نوجوان مسکرا دیا۔ لنگا سنوار کر مونچھوں کو تلو دیتے ہوئے زیر لب بولا۔

”ران ٹیاں کی بدرائیں۔“

”ران ٹیاں۔ ہو اور ران ٹیاں آں آں۔“

دور کہیں سے پہاڑی کی تان سنائی دی۔

”جس جاں ٹیاں، اوس نہ ماں ٹیاں۔ جس ماں ٹیاں۔ ان جائزیاں۔“

”ران ٹیاں۔ ہو اور ران ٹیاں۔ آں آں۔“

چناب کے شمال مغرب میں چلے جاؤ تو چن وال سے آگے درختوں کی تعداد کم ہو جاتی اور قد

پھوٹا۔ درختوں کے جھنڈ اور گاؤں سرک سرک کے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ زمین پتھریلی ہوتی جاتی ہے

اور مٹی کا رنگ لاکھا۔ یہ علاقہ کچھی کا ہے جس کے عین وسط میں ران ٹیاں کا گاؤں آباد ہے۔

گاؤں کے ارد گرد خود رو گلابڑی کی جھاڑیاں دیکھ کر یقین نہیں پڑا کہ اس زمین میں کاشت کرنے کے لیے اس قدر مشقت کی ضرورت پڑتی ہوگی، لیکن وہاں کے مردوں کو دیکھ کر اجنبی راہ گیر ایک ساعت کے لیے رک جاتے ہیں۔ اونچا لہاؤں، ابھری چھاتی، فراخ شانے، پٹھوں میں موروثی جدوجہد کا تاؤ، آنکھ میں رد عمل کی جھلک۔۔۔۔۔ شاید کامیابی۔ اور عورتوں کو دیکھ کر بھی دیکھتے انہیں۔ چونکہ وہ پردہ و پردہ نہیں جانتیں، لیکن وہی تاؤ، قد و قامت۔ شاہانہ چال۔ بڑا آنکھیں جو شرما کر کسی کو دعوت دینے کے فن سے بیگانہ ہیں اور بھرا بھرا منیاں جسم گھبرا کر یا سٹ کر راہ گیری کی توجہ اٹھانے سے بے نیاز ہے ان کی آنکھ چھلکی ہوئی ہونے کے باوجود جھلکتی نہیں۔ سرخ ہونے کے باوجود گل شرم سے تھمتاتے نہیں۔ شاید راس ٹیاں کے مردوں نے ان کے نولانی پہلو کو عروں دیکھا ہو۔ لیکن اجنبی۔۔۔۔۔ اجنبی کو تو وہ یوں دیکھتی ہیں جیسے سڑک پر گڑا ہوا کھمبہ۔ شاید اسی لیے اس علاقے کی عورتوں کو راس ٹیاں کہتے ہیں۔ بہر حال پنجابی کی عورتیں واقعی راس ٹیاں ہیں اور راس ٹیاں کی ہر عورت ملکہ۔

وہ سرمہ، سیندور اور اخروٹ کے چھلکے کی شوقین ہیں۔ رنگ دار کپڑوں کی دلداد اور خوشبو۔۔۔۔۔ خوشبو سے توا نیز عشق ہے عشق۔ حتیٰ کہ لوگ ابالے پانی بغیر نماتی نہیں۔ شاید اسی لیے انہیں راس ٹیاں کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نفیس مزاجی کے باوجود ان کے انداز میں نسائی نمائش نہیں، دعوت نہیں۔ جیسے مندر ہو، دورتی ہو، پوجا کا سامان ہو، سیس نولنے کی آگیاں ہو۔ شاید ان کا ”عورت“ کو چھپائے رکھنا تلاش پر مائل کرنے کا انوکھا انداز ہو۔ لیکن راس ٹیاں کے مرد تلاشی دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں جستجو کی بے تابی نہیں بلکہ پالینے کا شہ ہے۔ وہ عموماً اپنی زمین پر رہتی ہیں۔ انہیں اس پتھریلی زمین کو تسخیر کرنے کا شوق ہے اور اپنی زمینیں مگر سنگین راس ٹیاں پر بھروسہ ہے۔

قاسو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آیا تھا۔ ویسے تو پہلی پر سوار ہو کر رات رات میں سو سو میل کا سفر کرنا اس کا شغل تھا، لیکن عموماً پو پھوٹے سے پہلے وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جاتا تھا۔ جاکھڑاں کے گرد و نواح میں کون تھا جو قاسو اور بلی کو نہ جانتا تھا۔ لیکن وہ سب اس کے متعلق اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بہر حال ہر کوئی کو شش کرنا کہ قاسو کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرے۔ آدھی رات کو لوگ بلی کا ہناتا سنتے، ٹھٹھک جاتے اور پھر معاہدات ٹالنے کے لیے کوئی موضوع چھیڑ دیتے۔ پو پھوٹے وقت ہل چلا تے ہوئے کسان قاسو کی تان سن پاتے تو دوسری جانب منہ موڑ کر شدت سے کام میں مصروف ہو جاتے۔ ”تا تا۔۔۔۔۔ تا تا“ چلتے ہوئے بیلوں کو ہانکنا شروع کر دیتے۔ عورتیں معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ڈر کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتیں اور

بالاخر مسکرا کر وہی بلوہنے میں مصروف ہو جاتیں۔

اس روز قاسو اور بلی نوسار کی جانب آئے۔ پھیلی پورہ کے پاس جہاں سے نوسار کو ڈنڈی نکل جاتی ہے، قاسو نے بلی کو موڑنے کے لیے لگام کھینچی لیکن خلاف معمول بلی اڑ کر کھڑا ہو گیا۔ قاسو نے دوسری مرتبہ اسے موڑا تو وہ بدک کر رک گیا۔ قاسو نے غصے میں اڑ لگائی۔ تو بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا۔ قاسو نے اسے گردن پر تھپکی دی اور بولا۔ ”اچھا بیبا۔ تیری مرضی نہیں تو نہ سہی۔ آج قاسو بلی کی مرضی پر چلے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے لگام ہاتھ سے پھینک دی اور بلی ہوا ہو گیا۔ اندھیرے میں قاسو کو معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بلی اسے واپس لے آئے گا۔ اس لیے وہ بے پروائی سے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ وہ راس ٹیاں آچپے۔ بلی رک گیا اور قاسو نے گڑی سر تپے رکھی اور سو گیا۔ شام کو وہ جاگا تو اسے بڑی شدت کی پیاس لگی تھی۔ پانی پینے کے لیے خشک درختوں کے اس ویران جھنڈے سے باہر نکلا تو اس بڑھے سے ملاقات ہو گئی۔

”راس ٹیاں۔۔۔۔۔ ہو راس ٹیاں۔“

”کن جاں ٹیاں نے کن ماں ٹیاں۔“

پانی پینے کے بعد مونچھ مروڑتا ہوا وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

قاسو یوڑھی سے ہوتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچا۔ ”چودھری۔“ اس نے آواز دی۔ ”کون ہے؟“ بدراس نے سرسری طور پر آواز دی اور چرخہ کاتنے میں لگی رہی۔ قاسو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید سفید بھرے ہوئے ہاتھ میں تاگا اور حرکت میں بے نام سی چلک۔۔۔۔۔ نہایت کا پتہ دے رہے تھے۔ سر اٹھائے بغیر بدراس نے دوپٹے کو سر کا کرتا ہوا ہانپ لیا اور بولی۔ ”کون ہے؟“

”پیاس لگی ہے۔“ قاسو درازے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ اٹھ بیٹھی۔ ”لہی پیو گے ویریا دودھ؟“

”لہی۔“ قاسو نے اس کے ہاتھ کی چوڑیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ ویر۔“ بدراس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیڑھی ادھر سر کا دی اور گڑوا اٹھا چائی کے قریب جا بیٹھی۔ اس نے اتنی بڑی چائی کو یوں اٹھا لیا گیا وہ تنکوں کی بنی ہو۔ ”بیٹھا گراؤں یا نمک۔ یوں ویر؟“ نہیں نہیں۔ نمک نہیں۔“ وہ چونک کر بولا۔ اجنبی کی آواز میں اضطراب کی جھلک پا کر اس نے آنکھ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹٹکی پاندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بات پر بدراس کے ہاتھ پر تیوری پڑ گئی۔ ”بیٹھا ڈال دوں؟“ وہ منہ موڑ کر بولی۔ ”نہیں۔“ قاسو نے جواب دیا۔ ”ایسے ہی دے دے۔“ بدراس نے منہ موڑے بغیر گڑوا ادھر پڑھا دیا۔ دو ایک ساعت وہ یونہی گڑوا لیے کھڑی رہی۔ لیکن اجنبی نے گڑوا نہ پکڑا۔ بدراس نے مڑ کر دیکھا وہ حریف

نگاہوں سے اس کے کڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ ماتھے کی تیوری اتر گئی۔ ”لے دیر لسی۔“ وہ بولی۔ گزوا دے کر وہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور آنکھ پچا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ گزروے کے کنارے کی اوٹ لے کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔

”پر دیکھی ہو ویر؟“ بدر راں نے سرسری طور پر پوچھا۔

”کیس دور جاتا ہے؟“

”نہیں، نہیں۔“ اوہر ہی کلام تھا۔

”راں ٹیاں میں“

”ہاں ہاں۔ یہاں پاس ہی اوہر۔“

”اب روٹی کھا کر ہی جانا ویر۔“

”روٹی۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔ مجھے جلدی ہے۔“ غٹاٹ لسی پی کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”یہ لو۔ اس نے گزوا بردھایا۔ وہ بیٹھی رہی۔ غالباً“ وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ گزوا زمین پر رکھ دے لیکن اسے منتظر دیکھ کر بدر راں کو اٹھنا ہی پڑا۔

گزوا پکڑتے ہوئے اس نے آخری مرتبہ اس کے کڑوں پر نگاہ ڈالی۔

”پسند ہیں ویر؟“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکا۔

وہ کڑے اتارنے لگی۔ ”یہ کڑے۔۔۔۔۔ میری طرف سے اپنی گھروالی کو دے دینا۔ میری

بھابھی کو۔“

وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔ ”تکلیف نہ کرو۔ کڑوں کی کیا کمی ہے۔ گھروالی بھی ہو۔“

”کمی نہیں ویر تو اس کلام کا فائدہ؟“

”کون سا کلام؟“

”میری مائو تو یہ کلام چھوڑ دو۔“

وہ پھر ہنسا۔ ”ہم باکھڑاں والے دان نہیں لیتے۔ ہاتھ کا مکایا کھاتے ہیں۔“ اس نے بازو دکھاتے

ہوئے کہا۔

”اسے ہاتھ کا مکایا نہیں کہتے ویر۔“

”اپنا اپنا کلام ہے۔ اپنی اپنی بولی۔ تجھے زیادہ فکر ہے تو لا پلا دے نمک والی لسی۔“ اس نے معنی

خیز انداز سے کہا۔ ”پھر تو تسلی ہو جائے گی۔“

بدر راں کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ ”میں راں ڈاں ہوں ویر۔ ہم تسلی نہیں چاہتے، تسلی

دیتے ہیں ہم۔ میں نے تجھے دیر کہا ہے، میں پھر بھی لحاظ کروں گی تیرا راں ٹیاں میں۔ اور کسی نے تجھے دیر نہیں کہا۔ ٹھہر ذرا۔۔۔۔۔ اوہر آ۔“ اس نے قاسو کو لٹکارا۔ وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بدر راں نے صندوق کھولا۔ ”یہ دیکھ۔۔۔۔۔ یہ چو ٹیاں۔ چوک۔ ہنسی تعویذ۔“ اور اس نے کڑے اور ہار اتار کر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ پھر جلدی جلدی قفل لگا چابی طاقتور میں رکھ کر بولی۔ ”یہاں ہو گی چابی۔ اندر والے صندوق سب کھلے ہیں۔ دروازے کھلے ہوں گے۔ میں وہاں سوٹی ہوں۔ اس پٹنگ پر۔۔۔۔۔ اکیلی جب تیرا جی چاہے۔ آجاؤ ویر۔ صرف جاتے ہوئے مجھے جگانا۔ پھر اگر تو گٹھڑی باہر لے جائے تو تیری اور اگر تو یہاں آنے سے پہلے کسی اور جگہ یہ کلام کرے تو اپنے باپ کا نہ ہو گا۔ سنا تو ہے؟“

”عورت کے ساتھ شرط باندھوں۔“ وہ ہنسا۔

”عورت۔۔۔۔۔“ وہ ہنسی۔ ”یہ راں ٹیاں ہے ویر۔ راں ٹیاں۔“

”راں ٹیاں۔۔۔۔۔ ہو راں ٹیاں۔“

دور کسی کے گانے کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔ جیسے کسی نے اس کی مردانگی کو لٹکارا ہو۔

بدر راں نے سر اٹھایا اور یوں تن کر کھڑی ہو گئی جیسے لڑائی کا ڈھول سن کر کوئی سورما۔ ”جب تیرا جی چاہے آجاؤ۔“

دیوار پھانسنے سے پہلے اسے خیال آیا۔ بھلا آزماؤں تو سی۔ کیا وہ سچ کہتی تھی۔ کیا واقعی دروازہ کھلا ہے اور وہ دروازے کی طرف چلا۔

اف کس قدر اندھیری ہے یہ رات۔ اس نے سوچا۔ آخر عورت ہے نہ مسکرا کر اس نے پٹ پر انگلی کا دباؤ دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہوں۔۔۔۔۔ کتا ہو گا۔ کتا۔۔۔۔۔ اوہ پھر مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ آہٹ کرنے کے پلوجو کوئی آواز نہ آئی۔ اونہوں۔۔۔۔۔ اس نے سر ہلایا۔ طاقتور پر دیا ٹٹمار ہا تھا۔ پٹنگ پر چادر لپیٹے وہ سو رہی تھی۔ اس کے علاوہ مکان خالی پڑا تھا۔ دیئے کے پاس صندوق کی چابی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔

گٹھڑی پاندھ کر وہ بدر راں کے سرہانے آکھڑا ہوا۔ فضول ہے آرام کرنا۔۔۔۔۔ اس نے سوچا۔ جگہ بھی دوں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ ”معا“ اسے خیال آیا کہ وہ کس قدر نڈر تھی۔ ورنہ یوں بے فکر گھری نیند میں پڑے رہتا آسان کلام نہیں۔

”قاسو نے بدر راں کی باتیں کلائی پکڑ کر اسے ہلایا۔ بدر راں نے کروٹ بدلی لیکن اس کی آنکھ نہ ملی۔ دوبارہ قاسو کے جھنجھوڑنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ساعت کے لیے جوں کی توں ہی رہی۔ پھر اس نے لپک کر دائیں ہاتھ سے قاسو کی کلائی پکڑ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”اب اگر

تو کلائی چھڑوالے تو وہ گھڑی تیری ہے۔“

وہ ہنس پڑا اور بے پرواہی سے ہاتھ چھڑانے کے لیے جھٹکا دیا۔ لیکن بدراں کی گرفت اور بھی آہنی ہو گئی۔ ابھی وہ دوسرا جھٹکا دینے کی سوچ رہا تھا کہ بدراں نے کلائی مروڑ کر اسے چارپائی پر گرا لیا۔ ”آرام سے بیٹھ کر دیر۔“ وہ بولی۔ ”لے اب چھڑا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کلائی پکڑ کر کہا۔

قاسو غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن بدراں کی گرفت ہلا کی تھی۔

ایک بار پھر وہ چلائی۔ قاسو نے دوسرے ہاتھ سے سے پکڑنے کی کوشش کی اس بات پر وہ بھوکے شیر کی طرح اٹھ بیٹھی۔ ”افسوس ہے کہ میں نے تجھے دیر کہا ہے ورنہ.....“ اس نے قاسو کو دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لکرایا۔

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش کھڑا رہا۔

”میں تو تجھے آزما رہا تھا۔“ قاسو نے اپنا انداز بدلا۔

”تو آزاد کھل۔“ وہ اکڑ کر بولی۔

”تو نے مجھے دیر کہا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”ورنہ.....“

بیلی کے ہنسنے کی آواز سن کر وہ چونکا۔ ”اچھا میں جاتا ہوں۔“

”تو دے پہلے۔“ وہ مسکرائی۔

”اومٹو۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مجھ سے نبھایا نہ جائے گا۔“

”اچھا۔“ وہ سوچ کر بولی۔ ”نہ سہی۔“

”اوسر نہ آؤں گا کبھی رات ریاں کو۔“

”تو دودھ پی کر جا۔“

”ضروری ہے کیا؟“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یا تو دل دے یا دودھ پی کر جا۔ یہاں کی ریت ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بیٹھ گیا۔ ”لا دودھ۔“

بدراں اٹھ کر کاڑھنی کی طرف چلی۔ ڈول میں دودھ ڈالا۔ پھر اندر جا کر شکر تلاش کرنے لگی۔

شکر کے علاوہ وہ دودھ میں سبز سافوف گھول کر لے آئی۔

قاسو نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

”اومٹو۔ زہر نہیں۔“ وہ بولی۔ ”دیر کو زہر نہیں دیتے۔“

”اچھا رات ٹی۔“ وہ بولا۔ ”جو چاہے دے دے اب کیا ہے۔ اور غٹا غٹ پی گیا اور پھر۔“

”اللہ نبلی۔“ کہہ کر وہ صحن کے اندر مہرے میں غائب ہو گیا۔

جا کھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے۔ پھر دبی دبی باتیں شروع ہو گئیں۔ کسی نے کہا۔

”میں کتنی ہوں تم نے سنا کچھ؟ اب تو بیلی ساری ساری رات گلیوں میں ہنستا رہتا ہے۔“ کوئی بولی۔

”اچھا نہ ہو گا۔ اللہ مارا۔“ تیسری نے کہا۔ ”اوں۔۔۔۔۔ اچھا نہ ہو گا۔ بھلا چنگا پھرتا ہے۔“

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ پھر کوئی بول اٹھتا۔

”اوں۔۔۔۔۔ یہ تو بیلی چلا رہی ہے۔ صبح سویرے پو پھونے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر

دارے میں جا کر چہ گوئیاں کرتے۔“ چھوڑ دیا اپنا کام۔ بھی اللہ ہی جانے۔ کہتے ہیں رات بھر پیر

جیلانی کے روضہ پر سویا تھا۔“ بس یہ تو پتے کی کسی تو نے۔ امی بڑی کرامت والے ہیں وہ۔

ہر جگہ قاسو کی بات چھڑ جاتی۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر چل نکلتا۔ قاسو کے

متعلق پہلے جس قدر چپ رہتے تھے وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے

اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو۔ یا شاید اسے یہ شکایت تھی

کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی۔

”لیکن آخر تھا کیا اس دودھ میں؟“ ماجو نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ قاسو نے آہ بھر کر کہا۔ ”جب سے بدن میں جان نہیں بہت نہیں رہی۔

”بہت نہیں رہی؟“

”ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے۔“ وہ زہر خند ہنسی ہنسا۔

”کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟“

”اس سے بھی بدتر۔“ قاسو نے شرم سے سر جھکا لیا۔

”قاسو۔۔۔۔۔؟“ ماجو حقیقت حال جان کر چلا یا۔

”ہاں ماجو۔“ قاسو یوں خاموش ہو گیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔ کیا تم نے اس پر ہاتھ.....“

”اومٹو۔“ وہ بولا۔ ”میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا۔“

”پر کیوں؟“

”پتہ نہیں۔“

”تعجب ہے۔ تمہیں ایسا بنا دینے سے اسے کیا ملا۔ حرام زادی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔

”پوچھو اس سے۔ کتا ہے تجھے لینے آیا ہوں۔“ وہ ہنسی۔
”تجھے۔“

”ہاں۔“

”حرام خور۔۔۔۔۔“ دتے نے اس کی گردن پر ایک دی۔ اور وہ چکر اکر بدراں کے پاؤں میں آگرا۔

”پاگل ہے کوئی۔“ وہ بولی۔

”خون پی لوں گا اس کا۔۔۔۔۔ میں۔“ دتا ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

ماجو بدراں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ اور یوں اس کا دامن کھینچنے لگا گویا پتھر ماں سے پناہ مانگ رہا ہو۔ ”دتے۔“ بدراں چلائی۔ ”تو کچھ نہ کہہ اسے۔ میں کر لوں گی ٹھیک۔۔۔۔۔ دتے۔“ وہ پھر چیخی لیکن دتے نے ایک اور لگائی اسے اور وہ چیخا۔ ”راں ڈی۔“ ماجو نے اعلان یہ اس سے پناہ مانگی۔ ”رہنے دے بہادری تو۔“ وہ دتے کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”تو جا۔“ اس نے دتے کو دروازے کی طرف دھکیلا اور خود رسی لے کر ماجو کو باندھنے لگی۔

یہ دیکھ کر دتا ہنسا۔ بولا۔ ”اچھا جیسے تیری خوشی۔“

”کہتی جو ہوں پاگل ہے کوئی۔۔۔۔۔ سر پھرا۔“

دتا ہنسا اور باہر نکل گیا۔

اسے بندھا ہوا دیکھ کر بدراں کی ہنسی نکل گئی۔ ”مجھے لے جانے کا خط نہیں گیا۔“

”اب تو باندھ دیا ہے مجھے تو نے۔“ ماجو بولا۔ ”بندھے ہوئے کو باندھنے میں بڑی بہادری

ہے۔“ اس نے دکھلاوے کی محبت جتائی۔

”اوہ۔“ وہ ہنسی اور اسے کھولنے لگی۔ ”اچھا۔ اگر میں سو گٹھ لیتی اسے تو کیا ہوتا؟ اس نے

ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

”بے ہوش ہو جاتی تو۔“

”پھر؟“

”پھر میں گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا تجھے۔“

”سچ۔“ وہ بولی۔ ”پھر؟“

”پھر۔۔۔۔۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”بس۔“ لیکن عین اس وقت اسے سو جھی۔ ”تو نے میرے بھائی کو

نہ جانے کیا پلا دیا ہے۔ اس میں ہمت نہیں رہی۔ اب سارا گاؤں دشمن ہے۔ ہم کیا کریں۔“

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”تو اس کا بھائی ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”جب سے قاسو نے کام چھوڑا ہے۔ سبھی دشمن ہو رہے ہیں۔“

”میں وہاں چلی جاتی۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوتا؟“ وہ بولی۔

”پھر۔۔۔۔۔ پھر ہمیں کیا پروا تھی۔“ وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔ ”تو چلی جاتی تو کسی کو ہم پر ہنسنے کی

جرات نہ ہوتی۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی۔ ”کیا اس ڈبیہ کو سو گٹھ لیتی تو واقعی بے ہوش ہو جاتی۔“ اس نے ڈبیہ

سے کھیلنے ہوئے کما اور کھیل ہی کھیل میں اسے کھول کر ناک کے قریب لا کر بولی۔ ”دیکھوں۔۔۔۔۔

بائے میں نہیں دیکھتی۔“ وہ رک گئی۔ ”بائے بے ہوش ہو گئی تو تم لے جاؤ گے۔۔۔۔۔ لے جاؤ گے نا؟

وہ ہنسی۔ ماجو خاموش بیٹھا رہا۔

”تج سیو ہے۔“ اس نے ڈبیہ کو ناک کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ ”اوئی۔“ ایک چیخ سی

سنائی اور بدراں دھڑام سے ماجو کے پاؤں پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ماجو حیران کھڑا دیکھ رہا تھا۔

دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ کہیں کوئی گارہا تھا۔

”راں ڈیاں۔۔۔۔۔ ہو ران ڈیاں۔“

”کن جاں ڈیاں تے کن ملن ڈیاں۔“

”راں ڈیاں۔۔۔۔۔!“

وہ اس جگہ کیوں پڑا ہے۔ دفعتاً اس کی توجہ اپنی طرف مبذول ہو گئی لیکن میں؟ میں کون ہوں۔۔۔۔؟ وہ سوچنے لگا۔ اسے خیال نہیں پڑتا تھا کہ وہ کون ہے۔ عجیب بات تھی کہ اسے اپنی ذات کے متعلق واضح طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔

پاوم۔۔۔۔۔ پاوم۔۔۔۔۔ دور موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

پاوم۔۔۔۔۔ وہ پھر اٹھ بیٹھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ آواز مانوس تھی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں حرکت ہوئی۔ ریڈیو۔۔۔۔۔ ہاں۔ ہاں وہ خوشی سے چلایا۔ وہ ریڈیو کا سیٹ ٹھیک کر رہا تھا اور اس روز جلد ہی گھر سے آگیا تھا۔ نقش کیرئیر میں اس کا کھانا تھا۔ ہائیں۔۔۔۔۔ وہ دایاں ہاتھ دیکھ کر بولا۔ روٹی کا ڈبہ کہاں گیا۔ وہ لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اور آپ ہی آپ بغیر کوشش کیے یوں تیرنے لگا جیسے اندھیرے کے سمندر میں وہ ایک ناؤ ہے۔

دور تک نقش کیرئیر کا نشان نہ تھا۔

گھوں گھوں۔۔۔۔۔ دور سے کوئی چیز چینی ہوئی آ رہی تھی۔ سیاہ ڈراؤنی چیز۔

”اوہ ملٹری کی لاری۔“ سمجھے بغیر وہ ڈر کر درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

موٹر میں بندوقیں تانے ہوئے سپاہی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ فسادات کے دن تھے اور اسے محتاط رہنا چاہئے۔ اس احساس پر چاروں طرف سے سیاہ سائے اس کی طرف لپکنے لگے۔ اس نے بایاں پہلو مڑا۔ گرپان۔۔۔۔۔؟ اس کی گرپان کہاں تھی۔ روٹی کا ڈبہ اور گرپان۔ اب وہ گرپان کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔

دفعتاً وہ رکا۔ سامنے سرخ توپ زمین میں گڑی تھی۔ اس کی پیشانی پر پلینہ آگیا۔ ”اوہ یہ تو پیڑول پمپ ہے۔“ وہ اس کی طرف غور سے دیکھ کر گنگنایا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ کچھ بھی یاد نہ پڑتا تھا۔ چیزیں نئی نئی دکھ رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اسے ان چیزوں سے دور کا تعلق نہ ہو۔

اس پیڑول پمپ سے تو میں روز گزرا کرتا تھا۔ روز۔۔۔۔۔ کھانے کا ڈبہ اور گرپان اٹھائے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ہاں وہ سب دکانیں بند کر رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔ اور چھاپے خانے کا وہ مزدور کھڑا تھا۔ کھڑا گھور رہا تھا۔ میراجی چاہتا تھا۔ میں مزدور سے پوچھوں۔ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ لیکن اس کے ماتھے پر تیوری کیوں تھی؟ دفعتاً وہ سب مجھے گھورنے لگے۔ اور پھر ایک سیاہ ڈراؤنی شکل لپکی اور۔۔۔۔۔ میرے پہلو میں بجلی سی چبکی۔ معاً اس نے پہلو میں دردناک ٹیس محسوس کی۔

”پھر کیا ہوا؟“ اس نے بھد مشکل سوچنے کی کوشش کی۔ دھندلا۔۔۔۔۔ دھندلا۔

اندھیرا۔۔۔۔۔ وہ سب دور بھاگ رہے تھے۔ جیسے میں بھوت بن گیا تھا۔ بھوت۔۔۔۔۔ اور میں انہیں

گھور اندھیرا

امر سنگھ نے آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اندھیرے کے یہ در در بہ انباروں تلے اسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے جسم کو اٹھا نہیں سکتا جیسے اسے اپنے جسم پر قدرت نہ رہی ہو۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

نہ دیکھنے کے باوجود وہ محسوس کرنے لگا کہ پوجھل اندھیرے کے بادل اس کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ اندھیرے کے بڑے بڑے بھیاں تک نکرے پگڈنڈوں کی طرح پر پھر پھڑکتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ اور گدھوں کی طرح اس کے ارد گرد اٹھتے ہوئے جا رہے تھے۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

تاریک اندھیرے کا ایک کلباڑا اس کی طرف بڑھا۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک خنٹیں لگی۔ وردے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

ہائیں۔۔۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔ بوجھ کے اس کی طرف بڑھا۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک خنٹیں لگی۔ وردے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

ہائیں۔۔۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔ بوجھ کے اس کے بے نام سے احساس کے باوجود وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے سپرنگ لگے ہوں۔ اس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ خود بھی سیاہ بادل کے ٹکڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ سیال متحرک کڈا۔ یہ بات اس کے لیے حیران کن تھی۔ اس کا نچلا دھڑیوں لہرا رہا تھا جیسے الگنی پر لٹکا ہوا کپڑا ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ امر سنگھ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرا دھندلا ہوا جا رہا تھا۔ اس دھندلے میں سیاہ فرش کی ایک لکیر دور تک جا رہی تھی جس پر یہاں وہاں سیاہ ستون سے کھڑے تھے۔ جن کے سرے پر زور سے گولے ٹنگے ہوئے تھے۔ جن سے زور زور سا دھواں نکل رہا تھا۔ ستونوں کے پیچھے دھندلے دھندلے پردے لٹک رہے تھے جن پر مکانات کے مبہم نقوش دکھائی دے رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ مانوس تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور۔

”کچھ بھی نہیں۔ اوہ۔“ امر سنگھ کھوسا گیا۔ ”اور میں‘ میں۔۔۔۔۔“

”تم۔ تم۔۔۔۔۔“ اس نے اس کے کیسوں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دفعتاً گہبرا کر چلانے لگا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ میں کرشن عمر نہیں جاؤں گا۔ اس دن بھی میں وہاں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔“

”ٹھہرو۔“ سڑک پر کھڑا ہوا سپاہی چلایا۔ ”ٹھہرو۔“
کوچوان نے چونک کر لگام ڈھونڈنی شروع کر دی۔ لیکن ٹانگہ رکنے سے پہلے ہی سپاہی اوپر
چڑھ آیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ سپاہی نے حکمانہ انداز سے پوچھا۔
 ”میں۔“ کوچران بولا۔ ”میں کہاں جا رہا ہوں۔۔۔ کیوں باوجود جی؟ اس نے امر سنگھ سے
 پوچھا۔

۴۶
امرنگھ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ”میں‘ میں‘ یعنی ہم۔۔۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔
”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ سپاہی آپ ہی گفتگو کرنے لگا۔ ”لیکن مجھے ضرور وہاں پہنچنا چاہیے۔ ورنہ وہ سب بھوک سے مرجائیں گے۔۔۔۔۔ اودھ۔۔۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے جانا ہے۔“ مجھے انہیں بچانا ہے۔ مگر۔۔۔۔۔ کہاں جانا ہے۔ کہاں جانا ہے مجھے؟“ ”تھانے جانا ہو گا۔“ کوچوان بولا۔

”ہاں ہاں۔“ امر سنگھ خواہ مخواہ بول پڑا۔

”مجھے کہاں جانا ہے؟ سنتری نے امر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا۔“ بولو ورنہ وہ سب بھوکے مر جائیں گے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے؟“ کو جوان نے آہ بھری۔ ”کیا فرق پڑتا ہے؟“
 ”نہیں نہیں۔“ سفتزی چلایا۔ ”نکو نہیں۔ وہاں گیوں نہیں ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے
 ہیں۔“

”میں تھانے میں رپورٹ کرنے آ رہا تھا۔ ادھر سے نہ جاؤ، وہ بولے۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔
بے وقوف مجھے رپورٹ کرنی تھی۔ ورنہ وہ سب بھوکے مر جاتے۔“
”پھر؟“ امر سنگھ بولا۔

”پھر چتوئوں سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اور پھر اندھیرا۔ گھپ اندھیرا۔ اور وہ ہنس رہے تھے۔ بے وقوف انہیں معلوم نہ تھا کہ مجھے ضروری طور پر جانا ہے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ میں

ان کو سمجھوں گا۔ مل لیں۔ بغیر وارنٹ کے، پشکری نہ لگائی تو میراثام، میراثام..... لیکن میراثام

کیا ہے؟ میراثام..... بتاؤ۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ کہاں جانا ہے مجھے۔ اور میراثام۔ کیا نام

ہے میرا۔ کون ہوں میں؟ بولو۔۔۔۔۔ نہیں بتاتے۔ اچھا میں تمہارا چالان کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تانکے سے اتر گیا اور چلانے لگا۔ "ٹھہرو۔ ٹھہرو۔"

”کوئی نہیں سنا۔ کوئی نہیں۔“ وہ چلانے لگی۔ ”انہوں نے بھی کچھ نہیں سنا تھا۔۔۔“

”سروار جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ نہیں، نہیں۔ میرا نام تو کوشلیا ہے۔ یہ دیکھ لو۔ یہ کھائی پر

”امر تر۔“ ایک بھاری اور بھیانک آواز آئی۔ ”امر تر۔۔۔۔۔“

امر سنگھ نے گھبرا کر دیکھا۔ گاڑی کے پائیدان کے پاس بڑا کٹا ہوا سروانٹ نکال رہا تھا۔

امرنگہ کھبر آگیا۔

گاڑی سے ایک عورت نے سر نکالا۔ اس کی چھتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ جس سے ایک بچہ لڑکا
 ہوا تھا۔ عورت نے اپنی چھتیاں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”موتیرا۔۔۔“

امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر بولا۔ ”امر تر۔“ اور پھر ڈر کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔

دبے کی دیواریں سرخ چھینٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نیچے لو کی پھپھڑوں میں گوشت کی کٹھڑیاں رکھی تھیں۔ امرنگھ سہم کرا ایک طرف ہو گیا۔

سیٹ پر پڑے کئے ہوئے مرنے آنکھیں کھول دیں۔ امرنگھ کو کھڑا دیکھ کر اس کی آنکھیں اور بھی اہل آئیں۔ ”نہیں۔ نہیں۔ میں مسلمان نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی قسم۔“

سیٹ پر لڑھکتا ہوا وہ بیچے گرا اور پائیدان سے پلیٹ فارم پر جا پڑا۔
 ”الحمد للہ“ بائیں طرف کے دھیر سے ایک بزرگمانہ آواز آئی۔ ”الحمد للہ۔ اشدان

دفترا "ایک شور بلند وہا گوشت کی ٹھنڈیاں حرکت کرنے لگیں۔ اعضاء میں جنبش ہوئی۔"
"میری ٹانگ۔ میری ٹانگ۔"

”خدا کے لیے مجھے مار دو۔ مجھے مار دو۔“

”پاکستان۔۔۔!“

”پاکستان۔“ باہر پلٹ فارم سے آواز گونجی۔ امرنگھ سسم کر باہر کی طرف بھاگا۔
پلٹ فارم پر انسانی اعضاء ریگ رہے تھے۔ کئے ہوئے سر رہو کے گیندوں کی طرح لڑھک

رہے تھے۔

”پاکستان۔“ کتا ہوا سر گردن کے بل کھڑا ہو کر چلایا۔ ”ہا ہا ہا۔“ وہ بھانک تفتہ چاروں

طرف گونجنے لگا۔ کٹے ہوئے سر کی آنکھوں سے موتی ڈھلک آئے۔
کٹے ہوئے بازوؤں والا بڑھا مسکرا دیا۔ ”پاکستان۔“ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی۔

”الحمد للہ۔“ قریب ہی کوئی زیر لب بولا۔ ”الحمد للہ ہم پہنچ گئے۔“

”پہنچ گئے؟“ جوان عورت ہنسی۔ ”پہنچ گئے۔“ اس قہقہے میں طنز گونج رہا تھا۔

”شکر ہے۔“ بڑھیا بولی جو کہنیوں کے بل رینگ رہی تھی۔ اور پھر تھک کر منہ کے بل گر پڑی۔

امر سنگھ نے منہ موڑ لیا۔ ارے اس کے ساتھ کوہوان کھڑا تھا۔ ”کوہوان۔۔۔“ وہ بولا۔

الحمد لله ہم پہنچ گئے۔“

اشهد ان لا اله الا الله

امرنگھ نے ایک جست بھری اور فضا میں تیرنے لگا۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور دور۔۔۔۔۔
جہاں شاہ عالمی نہ ہو۔ امرتسر نہ ہو۔ کچھ بھی نہ ہو۔ دور۔ دور۔ جہاں وہ آوازیں نہ پہنچ سکیں۔ وہ
آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم پڑتی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کسی نامعلوم اثر سے بھیگی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی
بوندریں پڑ رہی تھیں۔ دور افق کے قریب بجلی چمکتی اور پھر گر اندھیرا چھا جاتا۔ نیچے زمین گویا سسنان
پڑی تھی۔ کبھی کبھی مدھم سی آوازیں سنائی دیتیں جو کبھی تیز ہوتی جاتیں۔ پھر ایک جھج، پھر خاموشی چھا
جاتی۔ اور خاموشی کے پس منظر پر کراہیں اور سسکیاں۔ اور پھر وہی جھج۔ اور پھر آوازیں اور
سرگوشیاں۔

”دینا۔ دینا۔“

”آگ۔ آگ۔“

”میں مسلمان ہوں۔ دھرم کی قسم۔ میں مسلمان ہوں۔“

”پاکستان۔۔۔۔۔ بابا بابا بابا۔۔۔۔۔!“

”راولپنڈی۔ امرتسر۔ شاہ عالمی۔۔۔۔۔!“

”مجھے پاس نہیں لگی۔ نمی نہیں۔ بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹوں سے ٹکڑی سی زہنی لٹک

پڑیں۔“ ”بابا۔ بابا۔“

بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکا تھا۔ لیکن وہ آوازیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ جیسے اتفاقاً اس کا پیچھا کر
رہی ہوں۔ بار کر امرنگھ نے آنکھیں بند کر لیں اور دھڑام سے نیچے آگرا۔

چاروں طرف کھیت لہرا رہے تھے جن میں مویشی چر رہے تھے۔ جن کے پاس ہی بیسیوں
مویشی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیٹ پھولے ہوئے تھے جیسے کھا کھا کر گر پڑے ہوں۔ ادھر
دھندلے میں گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا شیشہ تھا جس میں دیا غنما رہا تھا۔ دور
کہیں کتے رو رہے تھے۔ ادھر سڑک کے کنارے گدھ اور چیلین پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ اتنے
گدھ۔۔۔۔۔ اتنے گدھ اس نے عمر بھر ایک جگہ نہ دیکھے تھے۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے ٹرک کھڑے
تھے۔

وہ پھسل کر سڑک کی طرف چل دیا اور گدھوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لیکن گدھ جوں کے توں
بیٹھے رہے۔ کبھی کبھار کوئی سرکتا تو یوں محسوس ہوتا کہ اس میں جنبش کی ہمت نہیں۔ وہ پر پھڑپھڑاتا
مگر اس کا جسم حرکت نہ کرتا۔ ان کے پاؤں میں گلابی گٹنڑیاں سی پڑی تھیں۔ ان کی چوٹیں رنگی
ہوئی تھیں۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی طبیعت متلائے لگی۔

اور وہ شیشہ کی طرف چل دیا۔

اس نے شیشہ کا دروازہ کھولا۔ تاک پر دیا غنما رہا تھا۔ ویسے کی مدھم روشنی چاروں طرف پڑ
رہی تھی۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی ویرانی جو بنگارے کے عقب میں آتی ہے۔ اور
اہت تاک خاموشی کو جنم دیتی ہے۔ ایسی خاموشی جس میں سے بچوں اور سسکیوں کی بو آتی ہے۔

امرنگھ گھبرا کر باہر نکل رہا تھا کہ دروازے کی اوٹ سے بچہ نکل آیا۔ ”وہ چھو رہی ہے۔“
بچے نے تٹکا کر کہا۔ ”چھو رہی ہے۔ جاگی نہیں۔ جاگتی نہیں۔“
”سورہی ہے۔“ امرنگھ نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں۔ وہ بولی۔“ وہ ”اس نے فرش کے درمیان انگلی سے اشارہ کیا۔

فرش پر وہ پڑی تھی بازو اور ٹانگیں پھیلائے، لیکن کپڑے۔ امرنگھ نے آنکھیں ملیں۔ سفید
نم، سرے بال۔ سرخ رنگ جیسے ہولی کھیل کر سو گئی ہے۔ اس کی نیلی سوجی ہوئی چھاتیاں لٹک رہی
تھیں۔

”چھو رہی ہے۔“ بچی چلائی۔ پھر وہ بھاگی بھاگی اس کی طرف گئی۔ ”ای امی دیکھا۔ وہ چھو رہی
ہے۔ بیل ہے امی۔ ہاں۔“

”بیمار۔“ امرنگھ نے آہ بھری۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”ڈاکو آئے تھے۔ لیکن انہوں نے امی کو ڈاکوؤں سے بچالیا۔ ہاں وہ بڑے
اجنبی تھے۔ وہ کہتے تھے امی ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے امی کو ماس کی۔

”مائش۔۔۔۔۔؟“ اس نے ایک بار پھر نور سے عورت کی طرف دیکھا۔

”وہ سب امی کے پٹے پر ماس کرتے رہے۔“ وہ بولی۔ ”وہ کہتے تھے امی اچھی ہو کر سو گئی
ہے۔ وہ بہت اچھے تھے۔“

امرنگھ نے محسوس کیا گویا عورت کے ہونٹوں پر تبسم آ رہا ہے۔ مگر بھرا تبسم۔ ”وہ واسل
لو لینے گئے ہیں۔“ بچی نے کہا۔

”اوہ۔“ امرنگھ کا سر پکڑنے لگا۔ اس اجالے سے تو باہر کا اندھیرا ہی اچھا تھا۔ اور اس معصوم بچی کی
مٹی بھالی باتوں سے تو سڑک کے گدھوں کی خاموش حقیقت بیانی کہیں قابل برداشت تھی۔ امرنگھ
گھبرا کر باہر نکل آیا۔

”ای۔ امی۔“ اندر سے بچی کی آواز آرہی تھی۔ لیکن وہ دور بھاگا جا رہا تھا۔ دور۔۔۔۔۔ دور۔
بائیں۔۔۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔ سامنے سڑک پر موتی دوڑا جا رہا تھا۔ ٹانگے میں کوچوان سر
ٹھامے بیٹھا ہوا تھا۔

”موتی۔ موتی۔“ وہ چلایا اور پھر تانگے کے پیچھے بھاگا۔ اور لپک کر سیٹ پر جا بیٹھا۔ کوچوان اپنی ہی دھن میں بیٹھا رہا۔ اسے امرنگھ کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔ البتہ موتی مسرت سے ہنسنایا۔ اور پھر نہ جانے کیوں سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں ہوا لیا۔

کھیت ویران پڑے تھے۔ یہاں وہاں مویشی پکی ہوئی گھریوں کے خوشوں پر منہ مار رہے تھے۔ میدانوں میں کتے موتی کو دیکھ کر بھونکنے کی کوشش کرتے لیکن ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی اور جسم میں حرکت نہ ہوتی۔ مرغیاں زمین پر پٹھی ہوئی آنتوں کو پاؤں سے رول رہی تھیں۔ بستیوں پر سنانا چھایا ہوا تھا۔

دفعۃً ”موتی رک گیا۔ اس کے رکنے سے امرنگھ تانگے کے نیچے پھسل گیا۔

کوچوان نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”نہیں نہیں۔ بیٹے ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے۔ نہیں جائیں گے۔“ لیکن موتی کھڑا رہا۔ دو ایک ساعت کے بعد کوچوان پھر سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ امرنگھ تیرتا ہوا گاؤں میں جا پہنچا۔

حویلی کے صدر دروازے پر دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اپنا منہ نکالا اور امرنگھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں شک ہے کیا؟ شک ہے تو آکر دیکھ لو۔ آؤ۔“ اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔ میں نے کسی مسلمان کو پناہ نہیں دی۔ سنا تم نے۔ جاؤ دوڑ جاؤ یہاں سے۔ بد معاش۔ کیسے۔“ دراز قد آدمی دوڑ کر حویلی میں گھس گیا اور پھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

”آہ۔ آہ۔“ اندر سے آواز آئی۔ ”میرا سر۔ میرا سر۔ مجھ کو پکڑو۔ نہیں نہیں۔ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔“

”کوئی“ ”بھگلمان“ نہیں۔“ بچے کی آواز آئی۔ ”وہ چھیدہ کے بابا ہیں۔ بھگلمان تو نہیں۔ وہ بڑے اچھے ہیں۔ چھیدہ میری پھنسی کے بابا۔“ پھر بچے کی ایک لمبی چیخ سنائی دی۔ اور پھر مکان پر سنانا چھا گیا۔

دفعۃً ”امرننگھ کو خیال سا آیا اور وہ تانگے کی طرف بھاگا۔

اس نے کوچوان کو جھنجھوڑا۔ ”بھاگ جاؤ۔“ وہ بولا۔ ”تم کرشن نگر آگئے ہو۔“ موتی نے چیخ ماری اور تڑپ کر ساز توڑ کر بھاگ نکلا۔

”موتی موتی۔“ کوچوان چلایا مگر موتی جا چکا تھا۔ کوچوان نے فیض کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

”میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟“ امرنگھ چلایا۔ ”چلے جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”کہاں؟“ کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”پاکستان۔“

”پاکستان۔۔۔۔۔ بابا بابا۔“ فضا سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھا۔ ”موتی۔“ وہ زیر لب گنگنایا۔ ”میرا ساتھی۔“

”ساتھی۔“ اندھیرے سے آواز آئی۔ اور سو بے ہوئے جسم والی عورت ریختی ہوئی سامنے آ گئی۔ ”ساتھی۔“ ”وہ ہنسی۔“ ”جھوٹ جھوٹ۔“ وہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔

جیسے جیسے وہ تماشہ ہو۔۔۔۔۔ ”ساتھی۔“ ”وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے بازو اکڑ گئے۔ گردن مڑ گئی۔

”چھیدہ چھیدہ۔“ حویلی سے معصوم بچہ نکل آیا۔ تمہارے بابا یہاں ہیں۔ یہاں۔۔۔۔۔ ”دفعۃً اس کی نگاہ امرنگھ پر پڑی۔

”نہیں نہیں۔ وہ بھگلمان نہیں۔ وہ تو چھیدہ کے بابا ہیں۔“

”چپ۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”چپ۔“ امی چھو رہی ہے۔ چھو رہی ہے۔ وہ بڑے اچھے تھے۔ انہوں نے امی کو ماس کی اور امی اچھی ہو کر چھو گئی۔“

”کوچوان۔۔۔۔۔ کوچوان۔“ امرنگھ نے اسے گھسیٹا۔ ”آؤ آؤ بھاگ چلیں۔“ اور وہ دونوں بھاگنے لگے۔

”لیکن کہاں؟ کہاں۔۔۔۔۔؟“ کوچوان نے بھاگتے ہوئے امرنگھ کی طرف دیکھا۔

”کہاں؟“ امرنگھ نے دہرایا اور دفعۃً رک گیا۔

اس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ راستہ روکے کھڑی تھی وہ۔

”مجھے مار دو۔“ وہ چلائی۔ ”مار دو مجھے۔“ اس نے امرنگھ سے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ مجھے مار دو۔“

اس کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹھک گئے۔

”تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی؟“ امرنگھ چلایا۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ مجھے قتل کرو لیکن میں پاکستان نہ جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ تمہیں اپنے گرد کی قسم۔ مجھے قتل کر دو۔ مار دو۔ میرا جینا بے کار ہے۔

بے کار۔“

”وہ کہاں ہیں وہ دونوں؟“ وہ کہنے لگی۔ ”میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کھیت میں وہ

دونوں کریانوں سے لڑ رہے تھے۔ بھائی بھائی لڑ رہے تھے میرے لیے۔" وہ خاموش ہو گئی اور ایک فخر سے اوھر اوھر دیکھنے لگی۔

"وہ کون؟" امرنگھ نے پوچھا۔

"وہی جو ہمارے گھر آئے تھے۔" جوان عورت نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے نہ جاننے پر شکایت کر رہی ہو۔

"انہوں نے میرے پانچوں بھائی شہید کر دیے۔ اور پھر اماں کی طرف بڑھے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دوپٹہ اتار پھینکا اور اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے مار دو۔ مجھے۔ میں مسلمان ہوں۔ میں کافروں کے منہ پر تھوکتی ہوں۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ رک گئے۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ یہ سب تمہارا مال ہے۔ سب اور۔ یہ۔۔۔ اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ یہ میرا حصہ ہے۔ یہ کہہ کر وہ گھٹیا تو چھوٹا بیچے آ رہا تھا۔" ٹھہرو۔" جن سنگھ بولا۔

"اے مجھے دے دو۔"

"بے وقوف۔" بڑا چلایا۔

"جوڑ میرا ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن وہ مال۔" بڑے نے کہا۔

"تھو۔" چھوٹے نے تھوک دیا۔ "میں اس پر تھوکتا ہوں۔"

بڑے نے گھونسا مارا۔ چھوٹے نے کپان نکال لی۔ اور وہ دونوں کریانوں سے لڑنے لگے۔ اور میں یہاں بیٹھی دیکھتی رہی۔ اور وہ لڑتے رہے میری خاطر۔

"پھر؟" امرنگھ بولا۔

"پھر سڑک پر موٹر رکی اور میں اٹھ کر بھاگی۔ اور وہ لڑتے رہے میرے لیے۔ لڑتے رہے۔ انہوں نے میرے بہن بھائی قتل کر دیے۔ گھر تباہ کر دیا۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ اور۔ اور۔۔۔ وہ اف وہ پاکستان کافر ہی اس نے کہا تھا، آؤ میں تمہیں کیپ پھنچا دوں۔ اور۔ اور۔۔۔ میں پاکستان میں پہنچ کر لٹ گئی۔ پاکستان پہنچ کر لٹ گئی۔ نہیں نہیں۔ میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ مار دو مجھے۔"

کھیت میں دو کئی ہوئی سیریاں لڑھکنے لگیں۔

"وہ میری ہے۔" چھوٹا سر بڑے سے ٹکرایا۔

"میری۔" بڑا چلایا۔ اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

"بھاگو۔ بھاگو۔" امرنگھ چلایا۔

"کہاں؟" کوچوان نے اپنے ارد گرد حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔" حسین عورت چلائی۔ "پاکستان میں جا کر لٹنے سے یہاں مرجانا بہتر ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ جھوٹ ہے۔ یہاں نہ ٹھہرو۔ یہاں نہ رکو۔" نہ جانے نیار عورت کہاں سے آکر شور مچانے لگی۔ "یہ دیکھو۔ میری کلائی پر۔ ہندی۔ گلتا میرا نام یہ دیکھو۔" اس نے امرنگھ کی طرف کلائی بڑھادی۔ اس نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ وہ مجھے چاہتا تھا۔ وہ میرا بڑوسی تھا۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیس والا مسلمان۔۔۔ بابا بابا مسلمان۔ بابا بابا۔۔۔!"

وہ ہنسی۔ ڈھیر خند ہنسی۔۔۔ "سب جھوٹ۔ کوئی مسلمان نہیں۔ کوئی ہندو نہیں۔ سکھ نہیں۔ یہاں درندے بستے ہیں۔ درندے۔"

"پاگل نہ بنو۔" امرنگھ چلایا۔ "بھاگ چلو۔ بھاگ چلو۔"

"کہاں؟" کوچوان نے سراٹھایا۔

"جہاں انسان بستے ہوں۔" وہ بولا۔

"انسان۔" دوسری عورت ہنسی۔ "انسان کہاں ہیں؟ کہاں۔۔۔ کہیں بھی نہیں۔"

"اوہ۔" کوچوان نے پھر سر تھام لیا۔

"میں بھاگوں گی نہیں۔" نیار عورت چلائی۔ "نہیں۔ مجھے جنم دینا ہے۔ انسان کو جنم دینا ہے۔ میں جنم دوں گی۔" اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"جنم دینا ہے۔" دوسری عورت نے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں میں نے۔۔۔ تم نے، ہم نے۔"

"خدا کرے۔" کوچوان بولا۔

"کہا۔۔۔" دوسری عورت کھلکھلا کر ہنسی۔ "کاش کہ وہ کچھ کر سکتا۔۔۔"

ناش۔۔۔!"

"میں کروں گی۔ میں۔" نیار چلائی۔ "انسان۔۔۔ انسان۔"

"کس نے پکارا۔؟ کون ہے۔۔۔؟" اس گھور اندھیرے میں؟ لنگوٹی والا لاٹھی پکڑے

نہ جانے کہاں سے آگیا۔ "کون؟"

"انسان۔" لنگوٹی والے نے آہ بھری۔

"تم کون ہو؟" نیار نے پوچھا۔

”انسان-----انسان-----انسان-----انسان-----!“

نوازش سے پوچھے تو وہ منہ مٹھ کر مڑنے لگے گا۔ اس کی آنکھ میں میلی سی چمک لہرائے گی۔ "نہتا" اپنی حیثیت بھول کر اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگے گا لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی بات کا جواب نہیں دے گا اور جواب میں کچھ کہے گا بھی تو اسے اصل بات سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ "پھر کیا ہو گا؟" وہ مسکرائے گا۔ "رات کو جاگنا پڑتا ہے تو کیا ہوا۔ اپنے لئے کچھ مشکل نہیں۔ ہم نے تو راتیں آنکھوں میں گزاری ہیں۔ ہاں کیا پوچھتے ہو اپنی بات۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہو نہ۔"

دیکھتے ہیں۔ اس کی بغض مٹولتے ہیں۔ زبان کا رنگ دیکھتے ہیں۔ ٹونٹیاں لگاتے ہیں۔ دو ایک سوال پوچھتے ہیں اور پھر نیک لگا کر نرس کو ہدایت دینے کے بعد اپنا بکس اٹھا کر باہر نکل جاتے ہیں۔
 باہر برآمدے میں بڑی بیگم، آسیہ اور امجد ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ”ڈاکٹر صاحب! بڑی بیگم انہیں دیکھ کر کہتی ہیں۔“ آج پھر ڈاکٹر صاحب۔“ اور آسیہ خوف سے آنکھیں جھپکنے لگتی ہے۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر صاحب یوں سوچ میں پڑ جاتے ہیں جیسے اس واقعہ کا پھر سے جائزہ لے رہے ہوں۔ ایک ساعت کے بعد وہ سر اٹھاتے ہیں۔ ”ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں۔ ابھی شاک کا اثر نہیں گہلا۔ میں کل پھر آؤں گا۔ خدا حافظ۔“
 صرف تین کردار اس واقعہ سے متعلق اہم تھے۔ پاؤڈر سے تھپی ہوئی ایک معصوم گزیا، ایک بے جان کدرا گڈا اور بالاخر ایک جیتا جاگتا لوکیل مونچھ والا میلا سا ڈرائیور۔

گزیا بالکل دسکی ہی تھی جیسے مال روڈ پر چلتی پھرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ وہ پاؤڈر سے اس حد تک تھپی ہوئی تھی جیسے مال روڈ کی گزیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر بھی سرخی کی ایک تہ چڑھی رہتی تاکہ آتے جاتے لوگ انہیں نظر انداز نہ کر سکیں۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہونٹوں کو سرخ کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے اور راہ چلتے لوگ کیوں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ چپ چاپ موٹر سے باہر نکلتی۔ ایک وقفہ بھرے انداز سے ادھر ادھر دیکھتی۔ راہ پتوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ناک نفرت سے سکرتی اور پھر چپ چاپ شاپنگ میں مصروف ہو جاتی۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ سفید چہرے کے پس منظر اس کے ہونٹ خطرے کا نشان بنے ہوئے ہیں اور راہ گیروں کو عورت اور خطرہ دونوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ سوچتی بھی کیوں۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شوہر صاحب جائیداد تھے۔ بنگلہ تھا۔ سازو سامان تھا۔ موٹر تھی۔ میز پر کھانا خود بخود لگ جاتا تھا۔ پرس یوں روپے لگتا جیسے الہ دین کا جن تابع فرمان ہو۔ اسے تو صرف یہی تکلیف تھی کہ راہ چلتے لوگ اور وہ بھی عام سے لوگ اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ پاؤڈر تو وہ صرف اس لئے لگاتی تھی کہ جلد نرم رہے۔ کابل کی دھار اس لئے کھینچتی تھی کہ بینائی تیز ہو۔ اور ہونٹوں پر سرخی۔۔۔۔۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بات کی وجہ بیان کی جائے۔ چاہے کسی وجہ سے لگاتی تھی۔ بس لگاتی تھی۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ جس میں دوسروں کو دخل دینے کا حق نہ تھا۔ مال روڈ کی اس گزیا کے دل میں کسی کے خلاف بغض یا نفرت نہیں تھی۔ الٹا اسے تو ان پر ترس آتا تھا۔ اور بازاروں میں گھومنے والے عوام کی حالت پر اسے سچے دل سے افسوس ہوتا تھا کہ دیکھنے کے علاوہ انہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ کپڑے پہنے کا ڈھنگ نہیں اور چلنے پھرنے میں ان کی حرکات کس قدر بھدی ہوتی ہیں۔

سماجی گزیا ہونے کے علاوہ فطری طور پر بھی ایک گزیا تھی۔ سماجی زندگی نے تو اس پر صرف رنگ و روغن کیا تھا اور جیتے جاگتے میلے عوام سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ خوب صورت تھی جیسے کہ فطری گزیاں ہوتی ہیں۔ مگر وہ خوب صورتی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی۔ گزیا خانے نے اس کی جذبات منجمد کر رکھے تھے۔ اور اسے ایسی حسین ساکن جھیل بنا دیا تھا جس میں سطحی لہروں کے علاوہ کوئی مدد جزر پیدا نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں بہت سی گزیاں عملی کیسوں میں رہتی تھیں۔ وہ سب مقررہ وقت پر چلتی پھرتیں۔ مقررہ وقت پر موزوں باتیں کرتیں۔ مقررہ وقت پر باہر جاتیں اور مقررہ وقت پر اپنے اپنے کیسوں میں پڑ کر سو جاتی تھیں۔ ان کی ہر بات مناسب طور پر عمل میں آتی تھی۔ مناسب اور موزوں فقرے انہیں اذہر کر دیے جاتے تھے۔ اور مناسب اور موزوں حالت میں وہ انہیں دہرا دیتی تھیں۔

اس گزیا سے چند قدموں کے فاصلے پر جیتے جاگتے انسان بھی رہتے تھے۔ مگر اصول کے مطابق ان کی طرف غور سے دیکھنا مناسب نہ تھا۔ ہیرالوگ۔۔۔۔۔ چوکیدار لوگ اور خدمت گار کیا اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں غور سے دیکھا جائے۔ ان سے تو صرف خدمت کروائی جاسکتی ہے۔ نوکروں کو چھوڑیے، یہاں تو عزیز واقارب کو بھی غور سے دیکھنا لگتا تھا۔ غور سے دیکھنا تو ایک غیر مندرجہ فعل ہے جو دخل در معقولات کے مترادف ہے۔ گزیا گھر میں تو دیکھنے کی بجائے دکھائی دینے کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور وہ سب اس کو شش میں لگے رہتے تھے کہ اچھے اور پیارے نظر آئیں۔

بچپن ہی سے فوضیہ کو گزیا گھر کے اصولوں کی پوری تعلیم دی گئی تھی۔ صبح سویرے اسے نہلایا دھلایا جاتا۔ اور اس کے بال بنا کر رین لگا کر منہ پر پاؤڈر سرخی جما کر تیار کر دیا جاتا۔ پھر وہ اپنے جیسی ایک گلابی گزیا بغل میں دبا کر باغ میں جانیٹھتی۔ زمین پر نہیں، پچہ گاڑی میں۔ یا بیڈ کی اس کرسی پر جو اس کے لئے بنائی گئی تھی۔ زمین پر تو خدمت گاروں کے بچے کھیلا کرتے تھے۔ پھر اس زمین پر وہ کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ البتہ تیزی کی طرح وہ باغ میں ادھر ادھر دوڑ سکتی تھی۔ یا مہمانوں کے آنے پر ڈرائنگ روم میں موٹر کی طرح چل پھر سکتی تھی۔

ڈرائنگ روم کے لئے اسے چند ایک خوب صورت جملے سکھا دیئے گئے تھے۔ مزاج اچھے ہیں۔ تھینک یو۔ آپ کو نظم سناؤں۔ کیسے اچھے ہیں آپ۔ ڈیڈی، می اور شب بخیر۔۔۔۔۔ جیسے خوب صورت جملے۔ ڈرائنگ روم پر ہی کیا موقوف تھا۔ ان کا تو سارا گھر ایک ڈرائنگ روم تھا۔ سارا دن وہ ڈرائنگ روم میں رہتی اور پھر رات پڑتی تو وہیں ایک کونے میں اسے ایک ریشمیں کیس میں احتیاط سے رکھ دیا جاتا۔

پھر وہ جوان ہو گئی۔ لیکن اس کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہ ہوا۔ اگرچہ جسم میں عجیب و غریب قسم کے اضافے ہو گئے۔ سیدھے خطوط ٹھوم کر گولائیاں اختیار کر گئے۔ اعضاء پھول گئے۔ کندہ رنگ پر سفیدی نے یورش کر دی اور سفیدی میں سرخی کی جھلک پیدا ہو گئی۔ بال بنانے کا سائل بدل گیا۔ کپڑوں کی وضع قطع بالکل تبدیل ہو گئی۔ ان سکہ بند جملوں میں اضافہ ہو گیا جو فتنہ میں استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم بہت وسیع ہو گیا اور اس میں بہت سے اور گہرائے بھی شامل ہو گئے اور بہت سے نئے اجلے گدے اس کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ اس کی مسکراہٹوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس کی حرکات میں لے پیدا ہو گئی۔ لیکن ان تمام فروغی باتوں کے باوجود اس کی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی واقعہ نہ ہوئی۔ خوش فکرتوں کے پھولوں کے علاوہ جو اس نیلی جھیل میں آگئے تھے، اس کی زندگی وہی ساکن جھیل ہی رہی۔ گویا وہ کسی رنگ دار کیلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ہو۔

پھر جلد ہی ایک نیا سکدار گڈا ان کے ڈرائنگ روم میں آ پہنچا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں سے فوضیہ کو ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذت بھی محسوس ہوتی۔ پھر اس گڈے نے تنہائی میں اس سے عجیب باتیں کرنی شروع کیں۔ ایسے ہی فوضیہ نے ڈرائنگ روم میں کبھی نہ سنے تھے۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے اس سکدار گڈے کے آنے سے ایک نئی انوکھی کھڑکی کھل گئی ہو جس سے ایک انوکھی دنیا کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔

اگر چند ماہ کے اندر اندر فوضیہ کی فرخ سے شادی نہ ہو جاتی اور اسے مزید سکدار گڈوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ نہ تو فرخ کی باتوں میں کوئی انوکھی خصوصیت تھی اور نہ اس کی نگاہوں میں کوئی انفرادیت۔ اس کے وہ ہنسے بظاہر نہ ہونے کے باوجود بے حد پرانے اور سکہ بند تھے اور اس کی نگاہیں بھی صرف دکھانے کی تھیں، دیکھنے کی نہیں جنہیں فرخ نے مسلسل عشق سے اپنا رکھا تھا۔ لیکن فوضیہ کو ان تفصیلات کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ انوکھے پن کا وہ سراب درحقیقت اس لئے تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ حرکت جو وہ محسوس کرنے لگی تھی، محض سطحی تھی۔ اگر فرخ کی جگہ کوئی اور گڈا ان دنوں اس سے آتا تو بھی فوضیہ کے احساسات وہی ہوتے۔

شادی کے بعد بھی فوضیہ کی زندگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ ایک گڑیا گھر سے نکل کر دوسرے میں چلی گئی۔ جہاں ویسے ہی رہتیں پر وہ لنگ رہے تھے۔ ویسے ہی شوکیں رکھے ہوئے تھے۔ ویسا ہی باغیچہ تھا اور ویسے ہی لوگ تھے بلکہ شادی کے بعد تو وہ بالکل گڑیا بن کر رہ گئی۔ اس کے رکھوالوں میں فرخ کا اضافہ ہو گیا جو صبح شام اس کے لئے دروازے کھولتا۔ کرسیاں کھینچتا، جگہ باتا،

کوٹ پہنتا۔ اس کا پرس اٹھاتا اور مسکرا کر ڈرائنگ کمنے کے لئے ہر وقت تیار کرتا۔ اس کے علاوہ اب یہ بیگم فوضیہ بن گئی تھی۔ گو فرخ اسے فزی کہا کرتا تھا اور وہ اپنی فزی کو یوں رکھتا جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور اگر احتیاط نہ کی تو ٹوٹ جائے گی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زیادہ احتیاط سے ٹوٹنے کی صلاحیت اور بڑھ جاتی ہے۔

فرخ کے گھر میں پہلی مرتبہ فوضیہ نے نوازش کو دیکھا۔ لیکن اس کے لئے تو وہ محض شو فرقا، نوازش نہیں۔ اس نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا اور اسے اس بات کا علم نہ ہوا تھا کہ وہ جسم کا دبلا پتلا ہے۔ اس کا قد بے حد موزوں ہے۔ چھاتی چوڑی ہے اور اس کی نوکیلی مونچھیں اور متبسم آنکھیں بے حد شریر ہیں۔

عام طور پر فوضیہ کو نوازش سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت فرخ خود وہاں موجود ہوتا تھا۔ البتہ جب کبھی اسے جائیداد کے انتظامات کے سلسلے میں کراچی جانا پڑتا اور فوضیہ سفید بنگلے میں اکیلی رہ جاتی تو اسے نوازش کو بلانا پڑتا تھا۔ باہر پورج میں بچوں کے بل کھڑے اسے چلاتے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی پالتو کوئل تو ہو، تو ہو کی رٹ لگا رہی ہے۔

نوازش اس کی آواز سن کر اطمینان سے سگریٹ کے چند آخری کش لگاتا اور پھر اور کوٹ شانوں پر ڈال کر سینی بجاتا ہوا بیگم صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر سیدھا گیراج کی طرف چل دیتا۔ اس نے بھی بیگم سے پوچھنے کی تکلیف نہ کی تھی۔ ”کیا حکم ہے حضور؟“ نہ ہی کبھی اس نے اسے حضور کہا تھا۔ گیراج سے گاڑی نکال کر وہ پورج میں لاکھڑا کرتا اور پھر چپ چاپ سگریٹ پیٹے ہوئے انتظار کرتا۔

نوازش فطری طور پر موٹر ڈرائیور تھا۔ اس کے کردار میں استغنا کا عنصر حاوی تھا۔ چلتا یوں تھا جیسے بادلوں کا دیوتا زمین پر آگیا ہو۔ یوں موٹر چلاتا تھا جیسے وہ اس کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے۔ حرکت اور رفتار کے سلسلے میں اس کی ذہنیت خانہ بدوش کی سی تھی۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کا ڈرائیور ہے۔ اس کے برعکس وہ سمجھتا تھا کہ وہ موٹر کا ڈرائیور ہے جو اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔

جیسی تو نوازش کی شخصیت میں ”جی حضور“ کی جھلک تک نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت چمک لراتی۔ ہونٹوں پر ایک فلمی دھن کھیلتی۔ اور گردن کے زاویے سے لا پرواہی نمایاں رہتی۔ اس نے کبھی بیگم کو غور سے نہ دیکھا تھا۔ اور نہ اسے اہمیت دی تھی۔ اس کے نزدیک وہ عورت نہیں بلکہ صرف صاحبہ تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی وہ مسکراہٹ نہ چمکی تھی جو عورتوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں جھلک آتی تھی۔

ممکن ہے فوضیہ نے دل میں شعوری طور پر اس کا اعتراف کے بغیر نوازش کی بے چودائی کو محسوس کیا ہو مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ ایک نوکر کے متعلق سوچنا اس کے نزدیک مناسب نہ تھا۔ صرف ایک بار اس نے نوازش کے خلاف غصہ محسوس کی تھا۔ اس روز اس کے احساسات مجروح ہو گئے تھے۔ اس کی توہین ہو گئی ہو اور وہ آدھ گھٹنے تک بل کھاتی رہی تھی۔

ان دنوں فوضیہ نے موٹر چلانے کی مشق شروع کر رکھی تھی۔ اس روز ایک ویران سڑک پر خود موٹر چلا رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر نوازش بیٹھا اپنی ہی دھن میں مونچھ مروڑ رہا تھا۔ موٹر پر ایک تانگے کے آجانے سے دو فٹاً "فوضیہ کے ہاتھ کانپے۔ موٹر نے جھٹکا کھایا۔ فوراً دو بھد بھد سے بازو اس کے گرد حائل ہو گئے اور اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر نوازش کے بازوؤں کا بوجھ پڑ گیا اور اس کا جسم گرفت میں آ گیا۔ "بیگم ساحبہ" نوازش نے اسے ڈانٹا۔ اور دھکا دے کر فوضیہ کو پرے دروازے میں دھکیل دیا اور خود اس کی جگہ لے لی۔ اور بات کئے بغیر موٹر چلانا شروع کر دیا۔ پھر یہی نہیں وہ یوں بے پروائی سے ایک فلمی دھن گنگنا تے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہی نہ ہو۔

وہ پہلا روز تھا جب فوضیہ نے محسوس کیا کہ وہ بیگم صاحبہ نہ تھی بلکہ ایک لڑیا تھی جسے ایک بد تمیز نوکر نے زمین پر پھینک دیا تھا۔

اس کے بعد فوضیہ نے پہلی مرتبہ غور سے نوازش کی طرف دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ وہ نوازش تھا، شوفر نہیں۔ "تکثید تذبذب ہے۔" اس نے دل میں کہا تھا۔ اس کے بعد فوضیہ اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش میں کھو گئی تھی۔

انہیں دنوں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ ہجوم جلوس کی صورت میں سڑکوں پر گشت لگاتا تھا اور ایک مخصوص فرقے کے خلاف احرے لگائے جاتے تھے۔ رات کے وقت شور و غل بلند ہوتا۔ اشتعال انگیز نعروں کی آوازیں آتیں اور پھر پکڑ لو، پکڑ لو کا ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ اگرچہ نہ تو فرقہ اس مخصوص فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور نہ فوضیہ اور انہیں اس سلسلے میں کوئی خدشہ نہ تھا۔ پھر بھی ان دونوں کو عوام کی اس بد تمیزی پر غصہ آتا تھا۔ فرقہ شور و غل سن کر غصے سے بھوت بن جاتا۔ ”جنگلی۔“ وہ دانت بھینچ کر کہتا۔ ”انہیں گولی سے ختم کر دینا چاہئے۔ بد تمیز دیوانے۔۔۔۔۔!“ لیکن رات کے وقت جب کبھی آوازیں بہت قریب آ جاتیں تو وہ غصے کا اظہار کرنا بھول جاتا اور خوف سے کانپنے لگتا۔ ”یہ کیا حماقت ہے۔ فوضی ادھر آ جاؤ۔ اور ادھر دیکھو۔ اگر یہ لوگ جنگلی کی طرف آ جائیں تو ہم ادھر سے نوکروں کے کوراز رز کی طرف چلے جائیں گے۔ وہ جگہ محفوظ ہے۔ تمہیں سیکم۔ ان ناپایوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ان کا مطلب تو لوٹنا ہے۔ لوٹنا۔ مذہب تو محض دکھلاوا ہے۔“ کہنے۔ ”وہ زیر

سب کہتا کہ کوئی سن نہ لے۔ فوضیہ حیران ہوتی تھی کہ صبح کے وقت فرخ اس قدر غصہ دکھاتا ہے لیکن رات کو چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتا ہے۔ بہر حال وہ معمولی سی حیرانی محسوس کرتی اور اسے بھول جاتی۔ کیونکہ اسے خود فساد یوں کے خلاف غصہ آتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ان اصولوں سے منحرف ہو رہے تھے جن کے تحت فوضیہ کو تربیت دی گئی تھی۔

پھر فرخ کو کراچی سے ایک ضروری بلاوا آگیا۔ جانے سے پہلے اس نے نوفیہ کو ہدایات دیں۔
 ”نزی ان شریسٹوں کی قطعی پروا نہ کرنا۔ یہ ذلیل لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ سمجھیں۔۔۔۔۔
 اگر ضرورت پڑے تو پولیس کو فون کر دینا اور اگر وہ بنگلے میں آداخل ہوں۔ اول تو ان کی جرات نہیں
 ہو سکتی، لیکن ایسا ہو ہی جائے تو تم نوکروں کے کوارٹروں میں چلی جانا۔ میں انہیں ہدایات دے جاؤں
 گا اور چونکیدار اور شو فرمیں بنگلے میں کونے والے کمرے میں سوئیں گے۔ سمجھیں ڈارلنگ۔“

فرخ کے جانے کے بعد اسی رات ہجوم کاشور خوجان کر فوجیہ جاگ پڑی۔ اور گھبرا کر اس نے پلانا شروع کر دیا۔ ”چوکیدار“ چوکیدار۔ ”ہجوم کاشور قریب آ گیا۔ وہ گھبرا گئی۔ اس حد تک گھبرا گئی کہ وہ تمام اصول بھول گئی۔ ”نوازش۔۔۔۔۔ نوازش۔“ اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام پکارا۔

شائوں پر بے پروائی سے کوٹ ڈالے نوازش ایک شان استغنا سے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ ”نوازش۔۔۔۔۔ نوازش۔“ وہ چلانے لگی۔ ”وہ۔۔۔۔۔ وہ آ رہے ہیں۔ وہ۔“ چلاؤ نہیں بیگم صاحبہ۔“ اس نے درشتی سے ڈانٹا۔ ”اگر انہوں نے آواز سن لی تو.....“ اس کی ڈانٹ سے وہ بوکھلائی۔ لیکن نجوم کا شور قریب تر آچکا تھا۔ اس لئے اس کا غصہ دُر میں تبدیل ہو گیا۔ ”وہ آ رہے ہیں۔ وہ آ رہے ہیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔“ وہ ٹیلی فون کی طرف بھاگی۔ نوازش اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ”چپ کرو بیگم صاحبہ وہ سن لیں گے۔“ وہ غرایا۔ اس ساکن نیلی جھیل میں پہلی مرتبہ ایک طوفان ابل آیا۔ گویا ایک بہت بڑی بلونی اس کے نیلے پانی کو بلونے لگی تھی۔

غصے میں اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑائے۔ اور ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھی۔ نوازش نے باب شان استغنا سے سگریٹ سلا گیا۔ اسے مٹھی میں تھام کر حقہ کی طرح دوکش لگائے اور پھر کھلے دروازے میں جا کر کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہجوم سفید بنگلے میں داخل ہو گیا۔ ان کے نعروں سے خواب گاہ میں بھی ہولناکی چھڑی مارتی تھی۔ نواز شریف کو دروازے میں بے خبری سے دیکھ کر بیگم نے ایک جست عقبی دروازے کی طرف لے لی۔ ”میں نوکروں کے کوارٹروں میں۔“ ابھی اس کے منہ سے پورا جملہ نہ نکلا تھا کہ نواز شریف نے کہا: ”اس بچے کی طرح اٹھالیا اور بستر پر دے مارا۔“ ”چپکے سے پڑی رہو بیگم۔“ وہ غصے سے بولا۔

ہی نہ ہوں۔ تمدن کے دیوتا کی رودغنی مسکرائیٹیں اور بھی دل آویز ہو گئیں۔ جیسے وہ کبھی دھندلی پڑی ہی نہ ہوں۔ کسدار گڈا اور دانے کھوتا رہا، معصوم گڑیا خوب صورت اور ساکن نیلی جھیل میں رنگ دار پھلی کی طرح تیرتی رہی۔ چھ ماہ گزر گئے۔

اگلے روز وہ اس میل میں سوار ہو گئے جسے پتھر پر اس تپا کن چلوٹے سے دوچار ہونا تھا۔ سیکنڈ کلاس کے چھوٹے ڈبے میں سارا دن کندار گذرے کی نگاہیں گڑیا کے گرد گھومتی رہیں۔ اور روغنی گڑیا کا تبسم چلتا رہا۔ پھر وہ لیٹ گئے۔ سیکنڈ کلاس کے سپرنٹ انڈس تھکے لگے۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ وہ جاگ پڑی۔ سامنے سرخ شعلے لپک رہے تھے۔ ان شعلوں نے فرخ کو پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کا چہرہ موت کی گرفت میں بھیانک ہو رہا تھا۔ فوضیہ نے کوشش کی کہ وہ چیخ مار کر جاگ پڑے۔ وہ اسے خواب سمجھتی تھی۔ مگر اس کے حلق میں گویا آواز نہ تھی۔ شعلے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر دفعتاً ”دھڑام“ سے گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوازش اس کی طرف لپکا۔ ”نوازش“ اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

مال، بھائی، بہن اور نرس کی موجودگی کے باوجود اب وہ اکیلی اس سفید بنگلے میں سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ سارا دن وہ گزیا گھر اس کے گرد قائم رہتا ہے۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے بسی سے اس کی طرف یوں دیکھتے ہیں، گویا منتیں کر رہے ہوں۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا انگلیاں اٹھائے اسے خبردار کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب رات پڑتی ہے تو وہ چیخ کر جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی نگاہوں تلے ایک لٹا پنا جان بکھرا ہوتا ہے۔ گزیا گھر کے کدے نیلی جھیل کے خوفناک طوفان میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجتے ہیں۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت اوندھے پڑے ہوتے ہیں۔ اور تہذیب و تمدن کے دیوتا شرم سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور وہ چیخ مار کر پکارتی ہے۔ ”نوازش۔۔۔۔۔ نوازش۔۔۔۔۔“ اس کی پکار سن کر بڑی یتیم کادل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے سفید بنگلہ محل کے محرابوں سے گر کر غلام گردش میں آ پڑا ہو۔ اور آسہ گھبرا کر آنکھ بند کر لیتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جیسے

ہجوم باہر نکل گیا۔ جنگل پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ نوازش نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔ اور پھر فوضیہ کی طرف دیکھ کر بغیر بولا۔ ”تم سے جو کہا ہے، یقیناً کہ جب تک میں یہاں ہوں، کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ضرورت ہو تو مجھے بلا لیتا۔ کڈی لگاؤ۔“ اس کی آواز میں تحکم تھا۔ انداز میں استغنا تھا۔ فوضیہ اس کی بات سن کر یوں کڈی لگانے کے لئے انہی جیسے دھنچکا ”یقیناً“ سے باندی بن گئی ہو۔ پھر دیر تک وہ چارپائی پر پڑی رہی جیسے پتھر کے بغیر ناؤ سا کین سمندر پر بہنے جا رہی ہو۔

فرخ کی واپس پر فوضہ کو یاد بھی نہ تھا کہ اس شب کیا واقعہ ہوا تھا۔ اس لئے فرخ کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ باقی رہا نوازش۔۔۔۔۔ لیکن وہ کسی نوازش کو نہیں جانتی تھی۔ البتہ وہ شوفر۔۔۔۔۔ مگر اب اسے موٹر میں بیٹھنے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر شوفر کون۔۔۔۔۔ کیسا شوفر۔۔۔۔۔؟

چھ ماہ گزر گئے۔ اصول اور قاعدوں کے بت اپنی اپنی جگہوں پر براجمان رہے جیسے کبھی گربے

دودھیا سویرا

شہر سے دور گرینڈ ٹریفک روڈ کے کنارے پر درختوں کے جھنڈے کے نیچے وہ ایک مختصر سا قبرستان تھا۔ اس میں صرف بیس عجیبی قبریں تھیں۔ جن میں بیشتر کچی تھیں۔ پختہ قبروں میں صرف دو یا تین نئی معلوم ہوتی تھیں اور ان میں سے ایک سفید ٹائیلوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس مختصر قبرستان کے غریب کنارے پر ایک مسجد تھی۔ جس کے باہر چوڑا سا بیٹا ہوا تھا۔ مشرقی کنارے کے سڑک کے پاس بس سٹینڈ کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کے پاس ایک کچے کمرے میں چائے کا شال تھا۔ قبروں پر درختوں کے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ اور قریب ہی پہاڑی نالہ جو جانی کے نام سے مشہور تھا شور مچاتا ہوا ابہرہ رہا تھا۔ ان ٹنڈ منڈ درختوں تلے قبرستان میں وہ چاروں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔

پتلا دلا نوجوان منہ میں پائپ دبائے پتلوں کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اضطراب بھرے انداز سے سوکھے پتوں پر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رک جاتا اور ایک نظر غور سے قبروں کی طرف دیکھتا۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا۔ پائپ اور کوٹ کی اوپر والی جیب پر جھانکتا۔ پھر وہ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک لمبی آہ بھر کر پھر سے اضطراب بھرے انداز سے ٹہلنے لگتا۔

مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص درخت سے ٹیک لگائے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جاذب نظر آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے ڈرتا ہو کہ انہیں کھولا تو اس کا راز فاش ہو جائے گا۔ اس کے ماتھے پر کرب بھری تیوری چڑھی ہوئی تھی جیسے بند ہونٹوں کی وجہ سے دل کا تمام تر دکھ سمٹ کر پیشانی پر آگیا ہو۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد شدت جذبات سے جھرجھری سے لیتا اور پھر چونک کر مڑتا اور غور سے قبروں کی طرف حسرت سے دیکھتا اور اس کے گالوں پر ایک آنسوؤں ڈھلک آتا جسے چھپانے کے لئے وہ پھر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔

گھٹے ہوئے جسم کا نوجوان کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک بڑے سے پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ آنکھیں گویا انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ چھاتی تنی ہوئی جیسے اسے سانس لینے میں بھی لذت محسوس ہو رہی ہو۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی۔ ایک بے نام سی انبساط۔ اور چپ چاپ گویا بے تعلقی سے قبروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آ جاتی۔ اور اس کے چہرے پر دودھیا سوراخیل جاتا۔

مسجد کے چوترے پر اچکن میں ملبوس ایک پاکیزہ صورت معمر آدمی دوزانو بیٹھا زیر لب خشوع سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

قبرستان کے پیچھے شمال میں دور ٹیلے پر ایک گاؤں کے چند مکانات شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اور اس سے پرے شہر کے مینار اور فلک بوس عمارتوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

دفعۃً "سارے آسمان پر بدلیاں چھا گئیں اور بوندیں پڑنے لگیں اور وہ چاروں قبرستان سے بس سینڈ کے مختصر سے چائے خانے کی طرف بھاگے۔ چائے خانے کا کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ جس میں صرف ایک لمبا بیچ، ایک کرسی اور ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ سب دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مونچھ والے نے کوئی بات کرنے کی غرض سے پتلے دیلے نوجوان سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ کتنے مضطرب ہیں آپ بھائی صاحب۔"

"مضطرب۔" پتلے دیلے نوجوان نے دہرایا۔ "نہیں۔ نہیں۔" وہ اضطراب بھرے انداز میں چلایا۔ "میں مضطرب تو نہیں۔ میری زندگی اس قدر گریباں ہے کہ آپ؟" وہ بولا۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اپنی کتھانے لگا۔

"مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ جوانمردی کا شکار ہو گئی۔ اور آج اس قبرستان میں مٹی کے ڈھیر تلے بے بس پڑی ہے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، میں خوش ہوں۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں اس سحر سے نکل آیا ہوں۔ اف کس قیامت کا سحر تھا۔ جیسے کسی نے جادو کر رکھا ہو۔ ہاں وہ جادوگر ہی تھی۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اور ان جانے میں مجھے ہوئے پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

کھدر پوش نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زیر لب بولا۔ "آپ کو اس سے محبت ہوگی؟" "محبت۔" پتلا دیلا نوجوان چلایا۔ "مجھے معلوم نہیں لیکن محبت ایسی تو نہیں ہوتی۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ تو ایک مثبت جذبہ ہے جو اطمینان اور تسکین کا باعث ہوتا ہے۔" پھر وہ یوں بولنے لگا جیسے دیر سے منتظر تھا کہ کوئی اسے چھیڑے۔ "اور یہ..... تو ایک بیماری تھی۔ ہاں بیماری۔ ایک ایسی بیماری جس کے تحت مریض خود چاہتا ہے کہ وہ شفا یاب نہ ہو۔ اور ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ

مرض بڑھتا جائے، دو اکر نے کے باوجود بڑھتا جائے۔"

"عجیب بات ہے۔" اچکن پوش بزرگ نے سر اٹھا کر پہلی مرتبہ دیلے پتلے مضطرب نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بس سینڈ کے اس مختصر سے چائے خانے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں کراہ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ دیلا پتلا نوجوان لمبی آہ بھر کر آپ ہی آپ یوں بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ "جیسے اسے دوسرے اصحاب کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو۔" ہاں عجیب۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ کس قدر جاذبیت تھی اس میں۔ تو یہ ہے۔" اس نے جھرجھری لی۔ "اس میں نمائش نہیں تھی۔ خزا نہیں تھا۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح اس کے ہونٹ بونے کی طرح کھلتے ملتے نہیں تھے۔ اس کی آنکھیں ڈولتی نہیں تھیں۔ اس کی بھنوس تنقی سنتی نہیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں متبسم اشارے نہیں جھلکتے تھے۔ اسے دیکھ کر پیار کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں میں گر کر رو پڑیں۔ وہ لڑکی نہیں تھی، نیار عورت تھی۔۔۔۔ نیار عورت۔ اس پر لڑکی پن کبھی نہیں آیا تھا، کبھی نہیں۔ وہ پیدائشی نیار تھی۔ اس میں ایک عجیب سی آن تھی۔ عجیب سی تمکنت۔۔۔۔ ایک ایسا احساس جیسے کہ وہ تمام کائنات کا محور ہو، مرکز ہو۔ اف۔۔۔۔!" پتلے دیلے نوجوان نے یوں لمبی سانس لی جیسے اس کے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں۔ "اس کے روہرو اپنی شخصیت شل ہو جاتی تھی۔ اپنی آرزوئیں گویا مفقود ہو جاتی تھیں۔ جی چاہتا تھا، وہی کریں جو وہ چاہتی ہے۔ جی چاہتا تھا، وہ احکام جاری کرے اور ہم تعمیل کریں۔ عجیب عورت تھی وہ۔۔۔۔ عجیب۔" وہ پھر اپنے خیالات میں کھو کر چپ ہو گیا۔

باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ دور جاتی ندی بین کر رہی تھی۔ کمرے میں اچکن پوش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کھدر پوش غور سے میز کی طرف گھور رہا تھا اور موٹھوں والا اوھیز عمر کا شخص ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی دیوار کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جلدو۔" دیلا پتلا نوجوان بولا۔ "اس نے مجھ پر بچپن سے ہی جادو کر رکھا تھا۔ اور۔۔۔۔ اور جب میں نے ہوش سنبھالا، میں اس کے پیچھے پیچھے گودے کتے کی طرح پھرتا رہتا تھا۔ جہاں بھی وہ باقی، میں اس کے پیچھے جاتا۔ وہ کسی سے ملنے کے لئے گھر کے اندر چل جاتی تو میں دلیزیر بیٹھ جاتا اور انتظار کیا کرتا کہ کب وہ باہر نکلے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل سکوں۔ وہ چوبارے میں بیٹھ کر سویرا ہوتی تو میں اس کے سامنے چوکی یا پتھر پر بیٹھ رہتا۔ وہ ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوتی تو میں دیوار کے

"پھر۔۔۔ پتا دیا تو جوان چونکا۔ "پُر۔۔۔" اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا قصہ بیان کر رہا تھا۔ "اوہ۔۔۔۔۔ ہاں۔" وہ چلایا۔ "پھر کیا ہوتا تھا۔ وہی ہونا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اور کیا ہو

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔ ”پھر اس کی مسکراہٹ کا وہ زاردارانہ رنگ گویا اس کی آنکھوں سے رس رس کر بنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کی ہر حرکت اسی رنگ میں شریابور ہو گئی

صاحب ہم نے حفاظتی تدابیر سوچ لیں اور میرے چاروں یار گھر کے چاروں طرف چوکنے بیٹھے رہے کہ کوئی چال ہو تو مکان پر دھوا بول دیں اور میں مکان کے اندر چلا گیا۔ اس رات پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا۔ وہ بے حد خوب صورت تھی۔ شہزادی سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ لیکن خوب صورتی کیا چیز ہے بھائی صاحب۔ سارا کھیل تو طبیعت کا ہے۔ وہ صرف دو ایک منٹ میرے پاس ٹھہری اور پھر شہزادی کو میرے حوالے کر کے آپ چلی گئی۔ اور بھائی صاحب اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا اس لڑکی پر۔ وہ تو بالکل رام ہو چکی تھی رام۔ پھر ہم اکثر وہاں ملنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ملانے کے بعد وہ اپنا تقاضہ شروع کر دے گی۔ لیکن میرے شک بالکل ختم ہو گئے۔ اس کی نگاہوں اور انداز میں ہلاکی آن تھی۔ آن اور بے تعلقی۔ وہ میرے پاس صرف دو ایک منٹ کے لئے ٹھہرتی تھی، لیکن جب میں وہاں جاتا اور جب وہاں سے لوٹتا تو وہ آتی ضرور اور ہنس کر مجھ سے کہتی۔ تم آگئے۔۔۔۔۔ تم جا رہے ہو۔ پھر کب آؤ گے؟ وہ ہمیشہ مجھے تم کہا کرتی تھی۔ عجب عورت تھی وہ۔ ہاں بھائی صاحب۔۔۔۔۔! وہ آہ بھر کر بولا۔ ”چار ایک ماہ تک ہم ملتے رہے۔ لیکن پھر اپنی طبیعت آگئی۔ جیسے ہمیشہ اپنا طریقہ ہے۔“ وہ ہنس۔ ”اور پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔“

کوئی چھ ماہ کے بعد ایک روز جب اپنی اسی بیٹھک میں میں ایک نئی لڑکی پھنسا کر لایا ہوا تھا تو نہ جانے کس نے مزاحیہ فاش کر دیا۔ اور لڑکی کے رشتہ دار پولیس لے کر وہاں آگئے۔ اب وہ آدھی رات کے وقت نیچے میرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور اوپر میں سخت گھبرایا ہوا ہوں۔ بدنامی اور رسوائی کے ڈر سے لڑکی کو ادھر ادھر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سارے محلے دار اپنے دشمن تھے۔ کرتا کیا۔۔۔۔۔ عجیب مصیبت میں گرفتار تھا کہ دھم سے وہ کوشا پھاند کر میرے گھر میں اتر آئی اور آتے ہی بولی۔ تم چلے جاؤ گی۔ وہاں اس کمرے میں۔۔۔۔۔ میں سنبھال لوں گی۔ اس وقت اس نے عجیب سی پوشاک پہن رکھی تھی۔ ساری اور بندھی اور نہ جانے کیا کیا۔ حالانکہ وہ ساری نہیں باندھتی تھی۔ بال بھی عجیب سے بنا رکھے تھے۔ پچانی ہی نہیں جاتی۔ غالباً ”وہ جان بوجھ کر بھیس بدل کر آئی تھی۔“ اف۔۔۔۔۔ ”اس نے آہ بھری۔“ بڑی دلیر عورت تھی وہ دلیری سے اس نے باہر کا صدر دروازہ کھولا اور سب کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا ہے؟“ وہ بولی۔ میرے میاں خود گھر پر نہیں ہیں۔ میں ان کی بیٹیم ہوں۔“ اسے یوں کھڑا دیکھ کر پولیس والے اور ان کے ساتھی چوہوں کی طرح دبک کر چلے گئے اور میں صاف بچ گیا۔۔۔۔۔ صاف۔

اسی روز جب وہ مجھ سے اکیلے میں ملی تو اس کے لئے میرے دل میں شدید جذبہ تھا۔ میں نے اس سے کہا ”اگر تمہارے خاوند کو معلوم ہو گیا تو۔۔۔۔۔ بڑی دلیری کی ہے تم نے۔“ ”تم میری فکر نہ کرو۔“ وہ بڑی آن سے بولی۔ ”اپنی بات کرو تم۔“ اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے دل

میں اس کے لئے محبت کا ایک طوفان سا چل رہا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ لپک کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ لیکن وہ تڑپ کر باہر نکل گئی۔ ”میرا احسان اتار رہے ہو؟“ وہ بولی۔ ”اونہوں۔۔۔۔۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہماری ملاقات تھی۔“

پھر میں نے اس بیٹھک میں اپنا قیام چھوڑ دیا اور پھر جب میں نے کل ناگہانہ کہ وہ انتقال کر گئی ہے تو میں غم سے پاگل ہو گیا۔ اور آج اس کی قبر پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میری واحد محبوب تھی۔ اور جیسے وہ قبر سے نکل کر کہے گی۔ ”تم۔۔۔۔۔ تم میرا فکر نہ کرو۔ جاؤ گھر جاؤ۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

دیر تک کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی۔ پتلا دھلا نوجوان ویسے ہی ٹھوڑی ہاتھوں میں رکھ رہی پستی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کھدر پوش میز کو انگلی سے بجھا رہا تھا۔ اور اچکن پوش معمر آدمی زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ ”اور۔۔۔۔۔ اور آپ؟“ دھلا پتلا نوجوان چونک کر بولا۔ ”آپ کیسے آئے ہیں؟ یہاں آپ کا کون عزیز فوت ہو گیا ہے؟“ وہ اچکن پوش اور کھدر پوش دونوں اصحاب میں سے نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔

کھدر پوش مسکرایا۔ ”میرا گرو۔“ وہ بولا۔ ”میرا پیر سمجھ لو۔ میرا ابھی کچھ۔ وہ اس قبرستان میں دفن ہے۔ اس نے مجھے وہ دولت بخشی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر میں اس سے نہ ملتا تو آج میں بھی عام نوجوانوں کی طرح سرخ ہونٹوں، سیاہ بالوں، متبسم آنکھوں اور سنہرے بدن کی ان بوتلوں میں کھویا ہوا جو آج کل سڑکوں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں۔ شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا بیزبردہ ہے جو ہماری عقل پر پڑا ہے اور آن کی تہذیب اسے اور رنگین اور دیز بنانے میں شدت سے مصروف کار ہے۔ اس جیتے جاگتے رنگین بھنور کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ مرد کو لے ڈوبے اور اس کی کامناتی نگاہ کو ناکارہ کر دے۔ اسے زندگی سے بے گانہ کر دے۔ اف کتنا عظیم پردہ ہے۔“ وہ شان ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کے مشتاق ہیں۔ کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر میری اس سے ملاقات نہ ہوتی تو آج میری حیثیت پر بھی وہی پردہ پڑا ہوتا۔ میرے بھی پر کئے ہوتے تمہاری طرح۔“

اچکن پوش معمر نے سر اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر مرد حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا اور دبے پتلے نوجوان پر مایوسی سی چھائے جا رہی تھی۔

”ہاں۔“ کھدر پوش بولا۔ ”یقین کیجئے۔ یہ سب اسی کی دین ہے۔۔۔۔۔ اسی کی۔ حالانکہ مجھے صرف ایک مرتبہ ملی تھی۔ صرف ایک مرتبہ۔“

”ملی تھی۔“ اچکن پوش کی دونوں آنکھیں گویا باہر نکل آئیں۔ مونچھوں والے نے کھلے

ہونٹوں پر تبسم دوڑ گیا۔ دہلے پتلے نوجوان نے دفعتاً "اضطراب سے پائپ کے کش لینے شروع کر دیے۔"

کھدر پوش مسکرایا۔ "ہاں۔" وہ بولا۔ "میری گرو بھی ایک عورت تھی بلکہ حسین عورت۔ ایک رنگین ترین، بھنور۔ ایک ایسی ناگن جس کے کانے کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر درختوں میں گویا بھوتیاں ناچ رہی تھیں۔ دور جانی ندی سر ٹپک ٹپک کر رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ اور چولے پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی ایک غم ناک دھن بجا رہی تھی۔

"میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں۔" کھدر پوش بولا۔ "ہمارا گاؤں پہاڑ پر واقع ہے۔ سمجھ لو کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر۔ بچپن سے ہی ہم پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین تھے اور اکثر بہت دور اونچے نکل جایا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے اوپر کوئی چار ہزار فٹ اوپر یا شاید ایک غار ہے جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اس کا منہ تنگ ہے مگر اندر سے کافی وسیع و عریض ہے۔ اس کی چھت بہت اونچی ہے اور فرش بہت صاف۔ جس کے ایک طرف سے چشمہ نکلتا ہے اور وہیں تلاب سا بن جاتا ہے اور اس غار سے منظر اس قدر خوب صورت دکھائی دیتا ہے کہ ہم دیکھ کر دم بخود رہ جاتے تھے۔ پھر موسم سرما میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی تو اس غار سے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا۔ عجیب۔۔۔۔۔" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن موسم سرما میں راستے بند ہو جایا کرتے تھے اور وہاں پہنچنا محال ہو جاتا۔ پھر بھی پہلی بار برف پڑتی تو ہم وہاں ضرور پہنچتے اور وہاں سے عجیب نظارہ نظر آتا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو۔ اور ہی جہاں ہو۔"

جب میں جوان ہوا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی نئے فیشن کی حسین عورت ہو اور ہم دونوں موسم سرما میں اکیلے اس غار میں رہیں۔ اکیلے نہ جانے یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں لیکن وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی۔ ویسے پہاڑ کی عورتیں تھیں۔ مگر مجھے ان سے نفرت تھی۔ میری نگاہ میں وہ عورتیں ہی نہیں تھیں۔

پھر والد کے انتقال کے بعد میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بات بڑی مشکل تھی۔ ایسی عورت کو ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا۔ تو قصہ مختصر میں اکثر شہر جانے لگا۔ کیونکہ شہر میں بہت سے لوگ میدانوں سے آتے تھے اور ان کے ساتھ وہ ہیر ہونیاں ہوتی تھیں جن کے ساتھ غار میں رہنے کا مجھے خطہ تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے شہر کے دلالوں سے راہ رسم بدھائی لیکن میری بات سن کر وہ ہنس دیے۔ "جی ایک دو دن بات کرو۔ اکٹھا ایک ہفتہ اور وہ بھی برف کے دنوں

میں اور پھر جناب۔۔۔۔۔ اتنی دور غار میں جانے کو کون تیار ہو گئی۔"

پھر ایک دن جب میں شہر میں تھا اور ابھی پہلی ہی برف پڑی تھی ایک دلالہ بھاگی بھاگی آئی۔ "کام بن گیا۔" وہ بولی۔ "لیکن پیسہ بہت خرچ ہو گا۔ نہ جانے کون ہے وہ۔ یہاں اکیلی ہوٹل میں نہری ہوئی ہے۔ برف دیکھنے آئی ہے۔ ساتھ نوکرانی ہے۔ کوئی ایسی ویسی نہیں۔ بڑے گھ انے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی نوکرانی کی بھولی بھرو تو وہ کہتی ہے کہ میں مٹاؤں گی اسے۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ روپے کی تو مجھے پروا ہی نہیں تھی۔ میں نے کہا غار میں جائے گی؟ "ہاں۔" وہ بولی۔ اس کی نوکرانی کہتی ہے۔ میں لے چلوں گی۔ پر یہی دو تین دن کے لئے۔ زیادہ نہیں۔ تو خیر صاحب بات کچی ہو گئی اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ غار میں پہنچ کر جب اس نے برقعہ اتارا تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی بھنوس چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ہونٹ بے نیازی سے بھٹکے ہوئے تھے۔ جیسے اسے جسم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ زمین سے نہیں، آکاش سے اترتی ہوئی ہو۔ "وہ خاموش ہو گیا۔ پتلا دھلا نوجوان منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اپکن پوش کی آنکھیں ابلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مونچھوں والے کاچرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر ایک سفید لمبی داڑھی اگ آئی ہو۔ ہوٹل کا لڑکا جو برتن اٹھانے آیا تھا، چپ چاپ دروازے کے پٹ کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو۔

"تین دن ہم وہاں اکٹھے رہے۔ تین دن" کھدر پوش نے بات شروع کی۔ "وہ غار نہیں رہا تھا۔ اس کی آمد کے بعد گویا وہ ایک مندر میں بدل چکا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ وہ ایک دیوی تھی اور میں ہوس کار نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت قریب۔۔۔ بہت قریب۔۔۔ لیکن نہیں وہ مجھ سے قریب نہیں تھی۔ دور۔۔۔ بہت دور۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ اس کی پنڈلیوں سے چھو رہے تھے۔ لیکن وہ گوشت پوست کی پنڈلیاں نہیں تھیں۔ وہ نور کی بنی ہوئی تھیں۔ اسی نور کی جو غار سے باہر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف اور پھر نیچے سے اوپر تک۔ چوٹیوں سے اوپر۔ بلالوں سے اوپر۔ نیلے بلالوں سے اوپر۔ نیلے آسمان سے اوپر۔" ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ "ان تین دنوں میں میں نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے پر سجدے کئے۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں۔ اس کے روہرو بیٹھ کر بچن لگے۔ سب کچھ کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری خواہشات میں ہوس کا عنصر نہیں تھا۔ ہمارے جسم گویا فتا ہو چکے تھے۔ ہماری آرزو میں اس پھیلی ہوئی سفیدی میں گویا دھل چکی تھیں۔ اس لطیف فضا میں محبت و تہرے سوا کچھ نہ تھا۔ بے غرض محبت۔ بے نام تہرے لیکن آپ نہیں جانتے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔" وہ بولا۔ "آپ کبھی دس ہزار فٹ سے اوپر نہیں گئے ہوں گے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیسے

جان سکتے ہیں آپ؟“ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔

”تیسرے دن جدائی کے خیال سے میری گھٹکی بندھ گئی۔ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے اسے دیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے متیں کیں۔ ہاتھ جوڑے۔ سبھی جتن کئے۔ لیکن جواب میں وہ خاموش رہی۔ بالکل خاموش جیسے گوشتی ہو۔“
”عمر بھر کے لئے ہونا منظور نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تو صرف ایک بار پھر صرف ایک بار۔ ایک مہینہ۔ ایک ہفتہ۔ ایک دن۔“

آخر میری مسلسل منتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس دن ایک بار پھر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم نے ایک تاریخ مقرر کر لی۔ اور پھر وہ چلی گئی۔

اب میں آپ کیا بتاؤں کہ وہ ایک سال میں نے کیا گزارا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ مقررہ دن میرے نزدیک اتنا اہم تھا جتنا کہ قتل کے ملزم کے لئے فیصلے کا دن ہوتا ہے۔ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ چاہے وہ ایک دن کے لئے آئے یا ایک ہفتہ کے لئے، میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا۔ اور ہم موسم سرما وہیں گزاریں گے۔ اسی خیال کے تحت میں نے چار مہینے کی جملہ ضروریات کی چیزیں اس غار میں پہلے ہی سے پہنچا دیں تھیں۔ اور بالا خروہاں اپنی دیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا۔“
”موٹھوں والے نے ڈھیلے ہونٹ سے کہا۔ ”پھر؟“

”لیکن وہ نہ آئی۔“ وہ بولا۔ ”نہ آئی حتیٰ کہ راستے مسدود ہو گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میں اتنے مہینوں کے لئے اس برف خانے میں دفن کر دیا گیا ہوں۔ پہلے وہ تین دن تو میں غار کے اندر اس خیالی مجسمے کے سامنے کتے کی طرح پڑا رہتا رہا۔ پھر جب دیوانگی دور ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں وہ پچھلے سال کھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس کی بھنویں اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں باہر اوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ مسکرا رہی تھی جیسے مجھے بھی باہر اوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب دے رہی ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ اطمینان اور سکون سے باہر دیکھا۔ لیکن آپ۔“ وہ بولا۔ ”آپ اس منظر کو ذہن میں نہیں لاسکتے۔ آپ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہیں گئے کبھی۔“

”دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر۔۔۔“ اس نے پھر سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ ”فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے۔ اس بلندی پر یہاں صبح صادق کے دودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں۔ اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ

اڑ رہا ہو۔ انسانی کشمکش کا بوجھ گویا اس کے پیٹھ سے اتر گیا ہو۔ اس کی آرزوؤں میں شدت کی وہ دھار نہیں رہتی۔ اس کے دکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بغض، دشمنیاں، نفرتیں سب یوں اپنی کشمکش کو بیٹھتی ہیں جیسے مٹھین سے دبی ہوئی روٹی کی گٹھڑی کو دھنک کر صاف کر دیا گیا ہو۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عیش و نشاط کی محفلیں چار بجے سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت محبوبہ کے لئے برا کا راک بھی گایا نہیں جاسکتا۔ صرف حمد و ثناء، صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بدھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اپنی اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرے ذرے پر بکھر جاتی ہے۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور۔ اور وہ سکوت۔ گہرا بے انتہا سکوت۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گویا دودھیا سویرا اچھا گیا۔

”تین مہینے کی اس نور سے بھیگی ہوئی تنہائی نے مجھے اپنی اپنی کائنات پر مسلط کر دیا۔“ اس نے سلسلہ کلام از سر نو جاری کیا۔ ”اور وہ وجدان جو مجھ پر طاری رہا۔ اس کی وجہ سے تین مہینے میں میری کلیا پلٹ گئی۔ پھر جب میں نیچے اتر تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی جنون طاری ہوا۔ اس کا جنون۔ میں نے جگہ جگہ چھالی کہ اسے ڈھونڈ نکالوں۔ لیکن بے سود۔ وہ نہ ملی۔ اس کا پتہ بھی نہ مل سکا۔“

پھر جب موسم سرما آیا تو مجھ پر ایک نئی وحشت سوار ہو گئی۔ وہ نورانی غار مجھے اپنی طرف بلانے لگا۔ مجھے ہر وقت اسی منظر کا خیال رہنے لگا۔ وہی نور کی چادر۔ وہی اطمینان، وہی گہری خاموشی۔ یہ وحشت اس حد تک میرے سر پر سوار ہو گئی کہ میں پھر موسم سرما کاٹنے وہاں پہنچا۔ اور اب میں ہر سال موسم وہیں گزارتا ہوں۔“

”اور وہ وہ؟“ دہلا پٹلا نوجوان چلایا۔ ”وہ پھر نہ ملی؟“

”وہ۔۔۔۔“ کھدر پوش ہنسنے لگا۔ ”اس نورانی سویرے نے مجھے کھار کھار کر بذات خود دیوتا بنادیا اور دیوی کے نقوش میرے دل سے دھو ڈالے۔ اور چھ سال میں، میں نے اس راز کو پالیا کہ عورت مرد کی راہ میں محض ایک رکاوٹ ہے۔ ایک پردہ ہے۔ ایک ایسا پردہ ہے جسے ہٹائے بغیر ہم کہیں پہنچ نہیں سکتے۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ زندگی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا نام ہے۔ آرزوؤں کا غلام بننے کا نہیں۔ میری طرف دیکھئے۔“ وہ چلایا۔ ”سردی ہو یا گرمی۔ میں صرف اس کھدر کے کرتے میں رہتا ہوں اور یقین جانو میرے بدن میں اس قدر قوت و دفاع پیدا ہو چکا ہے کہ

میں سانس لیتا ہوں تو مجھے لذت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی لذت جو عورت کے رتکین قرب سے بھی میسر نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن وہ۔۔۔۔۔؟“ پتلے دبیلے نوجوان نے پھر اس کی توجہ اپنی طرف متعطف کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکرایا۔ ”جب میں اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا تو ایک روز شہر میں اتفاقاً وہ مجھے مل گئی۔ اس کے ساتھ وہی نوکرانی تھی۔“

”مل گئی۔“ مونچھوں والے نے بیٹھے ہوئے گلے سے دہرایا۔ ”واقعی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ دیوی تم پھر نہ آئیں۔ اس نے جھرجھری لی اور بولی اس مندر میں دیوی کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے ازراہ شرارت کہا کہ پھر بیماری ہی کو بلا لیا ہوتا۔ وہ پھر ہنسی لیکن جلد ہی گویا کسی اثر سے بھیگ کر کہنے لگی۔ اس مندر کا بیماری کسی کے بلائے سے نہیں آتا۔ میں خود ابھی تک اسی مندر کی بیماری ہوں۔ اس کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں اس وقت وہی دودھیا اجالا چمک رہا تھا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ”ہاں وہ میری گروتھی۔ میرا پیر تھی۔ میرا سبھی کچھ تھی۔ اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہے تو میں یہاں آئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن۔۔۔۔۔۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اب کی سردیوں میں وہ وہاں ضرور آئے گی۔ اب وہ پردہ نہیں رہا۔ پردے سے نکل چکی ہے۔ وہ یقیناً ابھی تک اسی مندر کی بیماری ہے۔ ابھی تک۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

دفترا ہوٹل کالز کا چلایا۔ ”بابو جی بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور بس آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔“

”اور“ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مونچھوں والے نے اچکن پوش بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور صاحب آپ کا کون عزیمت ہوا ہے؟“ اور سب کی نگاہیں اچکن پوش کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ گھبرا گیا۔ پھر اچکن جھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تو کسی عورت کے لئے یہاں نہیں آیا۔ میں تو تقریباً ہر روز ہی آتا ہوں یہاں۔ جب سے میری بیوی فوت ہوئی ہے۔ روز فاتحہ کے لئے آتا ہوں۔“

”بیوی؟“ دبیلے پتلے نوجوان نے دہرایا۔

”اتنی وفادار اور خدمت گزار بیوی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔“ وہ بولا۔ ”حالانکہ میں بوڑھا تھا اور وہ نوجوان تھی۔ لیکن سبحان اللہ۔ وہ گویا صرف میری خدمت کے لئے جیتی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”جنتی روح تھی۔۔۔۔۔۔ جنتی۔“ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا

اور خاموش ہو گیا اور وہ چاروں ملحقہ قبرستان کی طرف چل پڑے۔

بادل واقعی چھٹ گئے تھے۔ سورج مغرب میں تانبے کی تھال کی طرح ٹنکا ہوا تھا۔ اس کی سنہری شعاعوں میں بدلیاں انگاروں کی طرح دکھ رہی تھیں۔

”وقت بہت کم ہے۔“ کھدر پوش بولا۔ ”شہر کے لئے یہ آخری بس ہے۔“

پتلے دبیلے نوجوان نے کہا۔ ”لیکن قبر پر دیا تو جلانا چاہئے کم از کم۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ مونچھ والا بولا۔ اور وہ تینوں سفید قبر کی طرف لپکے۔ اور جب تینوں نے بیک

وقت ایک تربت کے طاق کی طرف ہاتھ بڑھائے تو تینوں کے سر آپس میں ٹکرائے گئے۔

”ہائیں۔۔۔۔۔!“ وہ تینوں بہ یک وقت چلائے اور انہوں نے ایک نئے مفہوم سے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن پچھتراس کے کہ وہ کچھ کہتے۔ اچکن پوش بزرگ کی آواز سنائی تھی۔

”میاں تم کدھر آ نکھو ہو؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اپنی بیوی کے مزار کا دیا تو جلا لینے دو۔“

وہ سب تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگے۔ پتلے دبیلے نوجوان نے کچھ کہنے کی

کوشش کی لیکن کھدر پوش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زیر لب کہا۔ ”اونہوں۔۔۔۔۔۔ دو سروں کو ننگا

نہ کرو۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے۔ اپنی عقل سے۔“

”کتار نکلیں پردہ ہے۔“ مونچھوں والے نے آہ بھری۔

”کتی بڑی رکھوت ہے۔“ کھدر پوش نے کہا۔

اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا۔ اس کے گل آنسوؤں سے تر تھے۔

سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر فضا میں نور کی دھاریاں سی بٹادی تھیں۔ جیسے نور کا

ایک مینار کھڑا ہو اور چاروں طرف دودھیا سوریا پھیلا تھا۔

سندر تا کاراکش

شام دسے پاؤں رینگ رہی تھی۔

ٹیلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی جھولی سورج کی ٹھکی ماندی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔

سوامی جی کی کنیا کا دروازہ صبح سے بند تھا۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہر چند شامت بعد وہ سر اٹھا کر سوامی جی کی کنیا کے دروازے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ اکب دروازہ کھلے اور ورشن کے بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کھلتا تھا۔

صبح داس نے تھالی میں بھو جن پروس کر سوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا لیکن اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی۔ نہ دروازہ کھلا نہ سوامی جی نے بھو جن اٹھایا۔ اب وہ رات کے بھو جن کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

پاس ہی بالکا منجھ کے بنے ہوئے جوتے کی مرمت کر رہا تھا۔

دور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے اوپر دھری ہوں۔ شہر کے لو بھی بھنورے کی مدھم بھن بھن صاف سنائی دے رہی تھی۔

دھنسا "اس کے منہ سے اک چیخ سی نکلی۔" ہے رام۔" اور چا تو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"ہاتھ کٹ گیا کیا؟" بالکے نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"نہیں مہاراج۔ وہ دیکھو۔۔۔ اوھر۔"

بالکے نے لوھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر لڑکیاں ان کی طرف آ رہی تھیں۔ چست لباس پہنے، بال پھلائے، کھ سجائے، پرس جھلاتی ہوئی۔

یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں بلکہ پلنگ سپاٹ ہو۔

"یہ تو کلج کی دکھتی ہیں مہاراج۔" داس نے کہا۔

"آج کل تو بسھی کلج کی دکھتی ہیں۔" بالکے نے جواب دیا۔ "کنیا ما آ کیا پڑی۔۔۔۔۔" بالکا اٹھ

اٹھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ میں ٹپٹنے لگا۔

داس چھلے ہوئے آلوؤں کو پھر سے چھیلنے میں لگ گیا۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے۔

وقت ختم گیا۔

پھر ایک لودھار آواز نے تعلق کی طرح پھڑپھڑائے۔ "ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے۔"

بالکے نے سر اٹھایا۔

شیلا اور بلدا کی کنوڑا سی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا۔ "سوامی جی کی کنیا کے دوار کے پٹ کل سے بند ہیں دیوی۔ انہوں نے صبح کا بھو جن بھی نہیں اٹھایا۔"

"تو دوار کے پٹ کھول دو۔" شیلا بولی۔

"ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی۔"

"سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں۔" بلدا غصے میں چلائی۔ "اگر پر ماتما کا دوار بھی بند ہو گیا تو منگنوں کا کیا ہو گا؟"

یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سدھ بدھ ماری گئی۔ اب کیا جواب دے۔ کوئی ہو تو دے۔ ٹیلے پر خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر داس اٹھا۔ اس نے لپک کر چٹائی اٹھائی اور کنیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں سے بولا۔ "ہینو شرمیتی ہینو۔"

"ہمارے پاس بیٹھنے کا نام نہیں۔" شیلا نے کہا۔

"سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے؟" داس نے پوچھا۔

"مانگ بھی پوچھنا بھی۔" شیلا نے کہا۔

"ہم تمہارا سندیس پانچا دیں گے دیوی۔" بالکا بولا۔

"اونہوں۔" شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے۔"

"پر دیوی جی۔ سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے۔" بالکے نے کہا۔

"کیا کہا؟" شیلا اور بلدا دونوں چلا گئیں۔

"کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟" شیلا نے تعلق سے پوچھا۔

بالکے نے سر لٹکالیا اور چپ سا دھلی۔ اب وہ کیا کہے۔ کیا جواب دے۔
نیلے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلہ زیر لب بولی۔ جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔
”بے کار ہے بللا۔ استری کے لئے پرماتما کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر گہری ہے۔ یہ دیش بھی
پرش کا ویش نکلا۔“

بللا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلا کر بولی۔ ”سوامی جی پرش سے ملتے ہیں استری سے
نہیں۔ کیا سوامی جی استری سے ڈرتے ہیں۔“

بالکے نے جواب دیا۔ ”استری سے سوامی جی نہیں ان کے اندر کا پرش ڈرتا ہے اور پرش
استری سے نہیں خود سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی ہلکتی نہیں دیوی کہ وہ اندر کے مرد کو روک میں
رکھ سکے۔“

یہ سن کر دونوں کنیاں سوچ میں پڑ گئیں۔

اس سب سے داس نے دو پیالے چائے کی تھالی میں دھرے اور کنیاؤں کے سامنے رکھ کر بولا۔

”دیوی چاء پیو۔ تم تھک گئی ہو گی۔ بڑی کٹھن پڑھائی ہے اس نیلے کی۔“

”بی بی یہ تو ہمارا اندر کا کھوٹ ہے۔“ بالکے نے کہا۔ ”کہ استری سے بچنے کے لئے ہم اسے
دیوی بنالیتے ہیں۔“

”تمہارے اندر بھی کھوٹ ہے کیا؟ تم جو دن رات رام نام کی دھنکی سے دل کو پوتر کرنے میں
وقت گزارتے ہو۔“ بللا نے پوچھا۔

”دیوی۔“ بالکا بولا۔ ”من کا کھوٹ کنویں کے پانی کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا نکلو۔ اتنا ہی پتیر
سے رس کر باہر آ جاتا ہے۔“

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ دفعتاً انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں۔ اس
لئے چٹائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔

”ہاں۔“ شیلہ سوچ میں گم پڑی۔ ”میرے بچے نے بھی مجھے دیوی بنا رکھا تھا۔ اتنا پیار کرتا تھا
کہ وہ پوجا لگی تھی۔ میں کتنی پرکاش مجھے دیوی نہ بناؤ۔ مرنے والی۔ ساتھی جانو۔ برابر کا ساتھی۔۔۔۔۔“

”دو نموں۔“ بللا نے آہ بھری۔ ”وہ برابر کا نہیں جانتے۔ ساتھی نہیں مانتے۔ یا تو دیوی بنا کر
پوجا کرتے ہیں اور یا باندی سمجھ کر حکم چلاتے ہیں۔“

”ایسا کیوں ہے بالکا جی؟“ بللا نے پوچھا۔

”کیا سوامی جی سے یہی پوچھئے آئی ہو دیوی؟“ بالکے نے کہا۔

”ہاں۔“ شیلہ بولی۔ ”جب پرش اور استری ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں تو پھر بڑا چھوٹا کیوں؟“

”سچ کہتی ہو شریمنی۔۔۔۔۔ سچ کہتی ہو۔“ بالکے نے آہ بھری۔ ”یہ تو استری کی جنم جنم کی پکار

ہے۔ اس دن سے استری برابری کی بھیک مانگتی پھرے ہے جس دن رانی وجے ونٹی نے راج پاٹ کو
تیاگ کر برابری کے کھوج میں راج بھون سے پاؤں باہر دھرا تھا۔“ یہ کہہ کر بالکا چپ ہو گیا۔

”وجے ونٹی کون تھے بالکے جی؟“ بللا نے پوچھا۔

”تمہیں نہیں پتہ کیا؟“ بالکا بولا۔ ”آج بھی راج گڑھی کی ڈھیری میں آدھی رات کے وقت

رانی وجے ونٹی کی آواہیں سنائی دیتی ہیں۔“

”آج بھی۔۔۔۔۔؟“ بللا نے پوچھا۔

”ہاں آج بھی۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے۔“

یہ سن کر شیلہ بللا کو چپ لگ گئی۔

سائے اور بھی لمبے ہو گئے۔

درختوں کی شبنیاں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ سورج کے لہو نے رس

رس کر بادلوں کو رنگ دیا۔

وقت رک گیا۔

پھر شیلہ کی مدھم آواز آئی۔ ”بالکا جی۔ وجے ونٹی کون تھی؟“

اور پھر بالکے نے وجے ونٹی کی کہانی سنائی شروع کی۔ بالکا بولا۔ ”وجے ونٹی راج گڑھی کے

مہاراج ماتری راج کی رانی تھی۔ مہاراج کا سنگھاسن اس کے چرنوں میں دھرا تھا۔ مہاراج اسے

آنکھوں پر بٹھاتے۔ وارے نیارے جاتے۔۔۔۔۔ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ انا پلے باندھ لیتے۔

انہیں وجے سب رانیوں سے پیاری تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ سندر تائیں وہ سب سے اتم تھی۔ صرف

ناگ کہہ ہی نہیں اسکی چال ڈھال رنگ روپ سبھاؤ سبھی کچھ سندر تائیں بھیگا ہوا تھا۔ پلکیں

انٹاتی تو دیئے جل جاتے۔ ہونٹ کھولتی تو پھول کھل اٹھتے۔ ہانہ ہلاتی تو ناگ جھولتے۔ بھرپور نجر سے

دیکھتی تو رنگ پیکاری بھگو کر رکھ دیتی۔ مہارانی راج بھون میں بڑے آئندہ سے جیون گجاری تھی۔“

بالکا رک گیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”پھر ایک روز آدھی رات کے سے مہارانی کا دوار بجلا۔ وہ

سبھی مہاراج آئے ہیں۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بوڑھی

کھوسٹ استری کھڑی ہے۔“

”کون ہے تو؟“ وہ غصے سے چلائی۔

اس کی آواز سن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اٹھی اور دوڑ کر دروازے پر آگئی۔ اس کی

اتنی جان کہ آدمی رات کو مہارانی کا دروازہ کھٹکنا۔ رانی نے شوشی سے کہا۔ ”کون ہے تو؟“
شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی۔

”میں شوبلا ہوں۔“ بڑھیا نے جواب دیا۔ ”میرا دارو کھتم ہو گیا ہے۔ دارو بنا میری رات نہیں کئے گی۔ میں نے سوچا کہ رانی کے آگے جھولی پھیلاؤں۔ جو کرپا کریں تو میری رات کٹ جائے۔“

”تو استری ہو کے دارو پیتی ہے۔“ رانی نے گھن کھا کر جھرجھری لی۔

”نہ مہارانی۔ جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی۔ جب میں استری تھی تو دارو پیتی نہیں تھی۔ پلایا کرتی تھی۔ لیکن اب۔۔۔۔۔ اب میں وہ دن بھولنے کے لئے دارو پیتی ہوں۔“
”یہ کیا بول رہی ہے شوشی؟“ وجے نے کہا۔ ”کتنی ہے میں استری نہیں۔“

شوبلا بولی۔ ”استری ایک سوگند ہوتی ہے جو کچھ دناں رہتی ہے۔ پھراڑ جاتی ہے۔ اور پھر پھول کی بگلوں ڈنٹھل رہ جاتا ہے۔“

”تو راج بھون کی باندی ہے کیا؟“ شوشی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ شوبلا نے کہا۔ ”میں باندی نہیں ہوں۔ آج سے تیس ورش پہلے میں بھی اسی رنگ بھون میں رہتی تھی۔ اسی دلاں میں جس میں تو رہتی ہے۔ اسی سچ پر سوتی تھی۔ جب مہاراج ماتری راج کے پتا راج سکھاسن پر براجمان تھے۔ مہاراج مجھے آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جیسے تجھے بٹھاتے ہیں۔ بات منہ سے نکلتی تو پورن ہو جاتی۔ یہ سب چونچلے سندرتا کے کارن تھے۔ جیسے آج تیرے چاؤ چونچلے ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب تو بھی ان دنوں کو بھولنے کے لئے دارو کا سارا لے گی۔“

یہ سن کر وجے کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”تو کیا یہ ساری چاننی روپ کی ہے؟ میں کچھ بھی نہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ شوبلا نے جواب دیا۔ ”جب تک دکان جی ہے۔ گاؤں کی بھیڑ ہے۔ جب دکان لٹ جائے تو استری کو کون جانے ہے مہارانی۔“

”تو کتنی ہے۔ سب جھوٹ ہے۔“ وجے نے چیخ کر کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔“
بالا کرک گیا۔

داس نے چونک کر دیکھا۔ تو پڑا ہوا پھلکا جل کر کالا ہو گیا تھا۔

بملا سر جھکائے چٹائی کو کرید رہی تھی۔

شیلایا نگاہیں جلتے پلوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

”پھر کیا ہوا بالک مہاراج؟“ داس کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے۔ بالک نے بات چلا دی۔ بولا۔

”شوبلا کے جانے کے بعد وجے رانی بیکل ہو گئی۔ کیا یہ سچ ہے سندرتا ہی بھی کچھ ہے؟ استری کسی گنتی میں نہیں؟ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ شوشی نے اسے بہت سمجھایا۔ مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا۔ سچ کوئی مٹھا پھل نہیں۔ وہ جھوٹ جو شانت کر دے اس سچ سے اچھا ہے جو اندر بھی سلگھوے ہے۔ پر تو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈ کا تپ چڑھا تھا۔ بولی۔ ”منش کی رتھ میں دوپٹے لگے ہیں۔ پرش اور استری۔ رتھ کیسے چل سکتی ہے جد توڑی دونوں پٹے برابر نہ ہوں۔“

”نہیں رانی۔“ شوشی نے کہا۔ ”دوپٹے برابر نہیں۔ کارن یہ کہ پرش کا پیہر چلے ہے۔ استری کھلی سچلوت کے لئے ہے۔ چلتا نہیں۔“

باندی نے وجے کو بہت سمجھایا پر وہ نہ مانی۔ بالا کرک گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر بملا شیلایا کی طرف دیکھا۔ بولا۔ ”کنیاؤ۔ جس کے من میں سچ کی ڈھونڈ کا کیزا لگ جائے پھر جیون بھرا سے نہ سکھاتا ہے نہ شانتی۔“

”یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج؟“ داس بولا۔

دو در کا داس باک نے کہا۔ ”سچ بولو۔ سچ کو اپناؤ۔ سچ جیو پر تو سچ کی ڈھونڈ میں نہ لکنا۔ سدا چلتے رہو گے۔ چلنے کے بھر میں آجاؤ گے۔ نہ رستہ ہو گا۔ نہ ڈنڈی نہ اور۔۔۔۔۔ اور نہ کیس پہنچو گے۔ صرف چلتا۔ چلتے رہنا۔“ بالک نے آہ بھری اور کہانی سناتے لگ بولا۔ ”لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانیں ہیں کہ نہیں۔ اس کے من میں چننا کا کٹا لگ گیا۔ جوں جوں اس کی چننا بڑھتی گئی توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جھلاتے گئے۔ اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ سچ کی دیوی ہو۔ جوں جوں وہ دیوی کو مناتے گئے توں توں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی مہاراج مجھے مورتی نہ بنائے۔ مندر میں نہ بٹھائیے۔ اپنے پاس بٹھائیے۔ اپنے برابر جانے۔“

مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں۔ جسے دھیان دیا جائے۔ مان دیا جائے۔ اونچا بٹھایا جائے۔ وہ برابر ہی کیوں چاہے۔ جسے سارا دیا جائے وہ آواہا کیوں مانگے؟

وجے رانی جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سنان بنا سکتے ہیں، مہارانی بنا سکتے ہیں، جیستی سمجھ سکتے ہیں، ساتھی نہیں بنا سکتے۔

یہ جان کر وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی۔ رانی نہیں بلکہ استری بن کر

جے گی۔ سندر تا کے جور پر نہیں، جیسو کے جور پر۔ بھسوت مل کر سندر تا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے۔ ساتھی نہ جانے۔

پھر ایک رات جب گرج چمک جوروں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار کونوں میں سے بیٹھے تھے تو وجے نے ہمیں بدلا اور شوشی کو ساتھ لے کر چور دروازے سے باہر نکل گئی۔

چلتے چلتے وہ راج نگر سے دور ایک شہر میں رکیں۔ وجے گجرات کے لئے پھلکاریاں بناتی۔ شوشی انہیں باجدار جا کر بیچ دیتی۔

کچھ دنوں میں وجے کی پھلکاریوں کی مانگ بڑھ گئی۔ ”اتنی صاف ستھری پھلکاریاں کون بناوے ہے؟“ منڈی میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر بدیش سے ایک گھرو بیوپاری آئندہ آنکلا۔ پھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا۔ بولا۔ ”یہ پھلکاریاں کون کاڑھتی ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چل۔“ شوشی اسے گھر لے آئی۔ وجے کو دیکھ کر وہ پھلکاریاں بھول گیا۔ وجے پھلکاریاں دکھاتی رہی۔ آئندہ وجے کو دیکھتا رہا۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھسوت سندر تا کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آئندہ سوچتا رہا کہ جس گن کو استری اچھالتی ہے، یہ شرمیلی اسے چھپا رہی ہے۔ اوش کوئی بھید ہے۔

آئندہ بہت سیانا تھا۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا۔ اس نے سوچا پاؤں دھو دھو دھو۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گرا تو یہاں سارا دے کر اٹھانے والا کوئی نہیں۔ پہلے تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔ پھر پاؤں دھرتا۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لئے پھلکاریوں کے بہانے وجے کے گھر آنے جانے لگا۔

دو چار پھیسروں میں اسے پتہ چل گیا کہ سندر تا کی بات نہیں چلے گی۔ پریم کی بات نہیں چلے گی۔ ملائم بات نہیں چلے گی۔ لگاؤ کی نہیں، بے لاگ، کھوری، گنوار۔

وہ بولا۔ ”بلی کاڑھن۔ تو تو چیونٹی کی چال چلے ہے۔ پر مجھے تو بہت سی پھلکاریاں چاہیں تاکہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں۔“

پھر چار ایک دن کے بعد آئندہ وجے سے بہت بگڑا۔ سب جھوٹ موٹ۔ بولا۔ ”تو کام چور ہے ری۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا۔“ اس بہانے وہ سارا سارا دن وجے کے گھر رہنے لگا۔ جوں جوں وہ اس کے خیرے ہوتا گیا۔ اس کا من ہاتھوں سے ٹکٹا گیا۔

پھر ایک دن آئندہ نے اس کی بانہ پکڑی۔ بولا۔ ”بلی کاڑھن میرا دھندا نہیں چلتا۔ اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجرات کر سکوں۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے تو جیون سکھی ہو جائے۔ تو پھلکاریاں کاڑھے، میں انہیں بیچوں۔ کام تیرا، دوڑ دھوپ میری۔“

وجے اس کی چال میں آگئی۔ اس کی مست جاگ اٹھی۔ بولی۔ ”میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو

دانی کو برابر کا سمجھے۔ نہ اسے دیوی بنائے نہ باندی۔ اپنا جیون ساتھ جانے۔ دکھ سکھ کا ساتھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ آئندہ بولا۔ ”تو میری ساتھن ہے۔ ساتھن رہے گی۔“

جب وجے دلہن بنی تو بھسوت کا پردہ بھی اٹھ گیا۔ اندر سے رانی نکل آئی۔ آئندہ دھک سے رہ گیا۔ پر بھو ایسی مورتی۔۔۔!“ بالکار کر گیا۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا۔ چوہا جل رہا تھا۔ تو اچھائی پڑا تھا۔ تپ کر کالا ہو گیا تھا۔ بیڑا ہاتھ میں یوں دھرتا تھا جیسے بالک کے ہاتھ کا کھدو ہو۔

شیلہ کی نگاہیں گھاس پر پھٹی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈ میں لگی ہوں۔ بدلا کی آنکھیں ڈبڈب رہی تھیں۔ اب روئی کہ اب روئی۔

نیلے پر سائے منڈلا رہے تھے۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی۔

شام دے پاؤں جا رہی تھی۔ رات اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

”پھر کیا ہوا بالک جی؟“ داس نے جیسے پچھلی۔

بالک بولا۔ ”آئندہ بہت بڑا سوداگر تھا۔ حویلیاں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ دھن دولت تھی۔ کس بات کی کمی تھی اسے۔ وہ تو وجے کو رام کرنے کے لئے اس نے نزدھن کا سوانگ رچایا تھا۔ بس ایک بات سچ تھی۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا۔“

اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا پر کیا کرتا۔ اتنا بڑا بیوپار تھا۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی۔ اسے جانا ہی پڑتا۔ پھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا۔ دنوں باہر رہتا۔ چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو۔ آجاتا تو جیسے جانے سے ہول کھاتا ہو۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس نے وجے کو پھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا۔ ”چتی تو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پھلکاری بنادیا کر۔ ایسی جو راجا رانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہو گئی۔“

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ ”رے تو مجھ سے اپنے بیوپار کی بات کیوں نہیں کرتا؟“

آئندہ نے جواب دیا۔ ”ساتھن بیوپار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پھن پھر بہ ہوتا ہے۔ چھل بٹے ہوتے ہیں۔ بیوپار کی بات سن کر کیا کرے گی؟“

وجے بولی۔ ”دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھائی سکھ کا نہیں ہوتا۔ دکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیوپار کی ساری بات بتا۔ اپنے دکھ گنوا۔“

اس پر آئندہ نے اسے ایک لمبی چوڑی طوطا مینا کمائی سادی کہ کس طرح نگر نگر پھرا۔ راجاؤں

”چل شوشی۔“ ایک دن وجے نے کہا۔ ”یہاں تو راگ و دھیا کا راج ہے۔“ شوشی بولی۔ ”دیا جو چاہے ہے، وہ ادھر نہیں ملے گا۔ جہاں دھوان بٹے ہیں۔ وہ ادھر ملے گا جہاں نزدھن بٹے ہیں۔ کالی بٹے ہیں۔ جہاں پرش چتی کے سہارا لے بغیر کچھ کر نہیں سکتا۔ جہاں چتی نہ موہ ہوتی ہے نہ پایا۔ بس اک باجو ہوتی ہے۔ پہلے سہارا ہوتی ہے، پھر کچھ اور۔ جہاں دو وجے کے بٹا گیارا نہیں ہوتا۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے۔“

”وہ کون سی جگہوں ہے؟ کہاں ہے شوشی؟“ وجے نے پوچھا۔ ”وہ جگہ وہاں ہے جہاں دھن کا جور نہیں ہوتا۔ کام کا ہوتا ہے۔ دیکھو دیا تو مان نہ مان۔ پر تو استری جیو کی دھرتی ہے۔ جس کے دم سے جیو کو نپل ہری رہتی ہے۔ استری کی سار وہی جانے ہے۔ جو دھرتی کی سار جانے ہے۔ جو یونا لگانا جانے ہے۔ جو کھیتی لگائے ہے۔ جس کا گیارا دھرتی کی پیدا پر ہے۔ بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے۔ اپنے سا جانے ہے۔“

وجے کے دل میں بات اتر گئی۔
اک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں۔ شہر سے دور گاؤں کی اور۔
شوشی نے وجے کو موٹے کپڑے پہنا دیئے۔ منہ پر ہلدی، کالک کا اٹھن مل دیا۔ بولی۔ ”یہاں استری استری ہوتی ہے۔ مگن کے جور پر نہیں۔ جیو کے جور پر۔ یہاں سندر تا شوبھا نہیں رستے کی روک ہے۔ تو اپنی سندر تا کو چھپا رکھنا۔ جو فجر آگئی تو گڑبڑ ہوگی۔“

”شوشی۔“ وجے بولی۔ ”میں اس سندر تا کے کارن بڑا دکھی ہوں۔ کوئی بس بھری ہوئی ڈھونڈ ل کہ میں کچھ پر مل لوں جو سندر تا کی کٹ کر دے۔“
”شوشی ہنسی۔“ بولی۔ ”بھولی رانی۔ سندر تا کھ پر نہیں ہوتا۔ سارے پنڈے میں ہوتی ہے۔ انگ انگ سے پھونتی ہے۔ بات ہلانے میں ہوتی ہے۔ پگ دھرنے میں ہوتی ہے۔ آنکھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ ہونٹ کھولنے میں ہوتی ہے۔ تو اسے اپنے سہاؤ سے کیسے فوج ڈھپنے کی؟“

گاؤں میں پہنچ کر انہوں نے ایک جگہ میں ڈیرا کر لیا اور کھیت میں کپاہ کے پھول چننے لگیں۔
ایک دن لاکھا کسان نے وجے سے کہا۔ ”تو کیسی جتانی ہے ری۔ تیری انگلیاں تو فینچی سی چلتی ہیں۔“ اس نے وجے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انگلیاں دیکھیں تو سٹپٹا گیا۔ ”ری یہ کیسی انگلیاں ہیں؟ انگلیاں ہیں کہ رس بھری پھلیاں۔ اتنی لمبی اتنی پتلی۔“

پھر وہ روز اس کی چلتی چنتی انگلیاں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا۔ ”ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ میں اکیلا ہوں۔ پتا جی پر ماتا کو پیارے ہو گئے۔ ماتا بہت بوڑھی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ بھائی بہن ہیں نہیں۔ اکیلا ہوں۔ تو میرا باجو بن جاری۔ میں ہل چلاؤں گا تو بیچ

رائیوں سے ملا۔ انہیں پھلکاری دکھائی اور انت میں اک راج زرنگی پھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹوہ گئی۔ بولی۔ ”بول پیو پاری منہ مانگے دام دوں گی۔“

اس رات وجے کو یوں لگا جیسے آندھ اس کا جی ہلانے کے لئے کہانی سنا رہا ہو۔ سلانے کے لئے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ سوچ میں کھو گئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی۔ بولی۔ ”شوشی یہ تو وہ نہیں جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے، وہ ساتھی کیا بنے گا۔“

”دیکھ رانی۔“ شوشی بولی۔ ”وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں، کھوت نہیں۔ پرش چتی کو اپنے پیو پاری کا بھید کبھی نہیں دیتا۔ وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا۔ جورو ڈنڈی مارے ہے۔ یہی جگ کی ریت ہے۔“

”تو کیا وہ استری کو اس جو گا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے۔ یہ تو ساتھ نہ ہو، برابری نہ ہوئی۔ جا شوشی منڈی میں جا کر پوچھ گچھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔“

شوشی نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ آندھ تو ایک راج پیو پاری ہے۔ اس نے بیجا گری کی مہارانی کے لئے شیش بھون بنوانے کا شہید لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ ”تو پھلکاریاں بیچ کر گیارہ کرنے کی بات اک ہمانہ تھی۔ کیوں شوشی۔۔۔ تو کیا کہتی ہے؟“

شوشی نے وجے کو بہت سمجھایا۔ بھجایا کہ دیکھ دیا اس سے اچھا جیون ساتھی تجھے نہیں ملے گا۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا لیکن وجے نہ مانی۔ شوشا اتنے پردے اوپر کچھ۔ بھیت کچھ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں، جھوٹ ہو، دکھاوا ہو، برابری کیسی۔ چل شوشی کسی ایسی جگہوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو، جھوٹ نہ ہو۔ اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔“ بالاکر گیا۔

”تو کیا وجے آندھ کو چھوڑ کر چلی گئی؟“ شیشا نے پوچھا۔

”ہاں۔ چلی گئی۔“ بالاکر بولا۔

بلا نے ایک لمبی آہ بھری۔

”پھر وہ کہاں گئی؟“ اس نے پوچھا۔

”پہلے وہ ایک بچاری کے پھندے پھنس گئی۔ بچاری نے اسے داسی بنا لیا۔ پر بھوک داسی۔ پھر آپ پر بھون بیٹھا۔

وہاں سے بھاگی تو ایک زرنگی کے جال میں جا پھنسی۔ اس نے اسے اپنے چوبارے میں سجایا۔ چوبارے سے اسے ایک راج گانیک لے اڑا۔ وہاں سے بھی اسے برابری نہ ملی۔ گانیک سارا دن ستار بننے سے لگائے رکھتا۔ پھر تھک کر ماندگی اتارنے کے لئے وہ وجے سے دل ہلاتا۔

ڈال۔ میں پانی دوں تو کھیت کی بوٹی چن۔ میں گیہوں کاٹوں تو وانے نکال۔ پھر ہم کسی سے بیٹے نہیں رہیں گے۔ میں جو آدھا ہوں، پورن ہو جاؤں گا۔“ اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کامنا۔ نہ لوجھ۔
وہ نے کو اپنی شرط بھی بھول گئی۔ اس نے ہاں کر دی۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جت گئے۔
لاکھانہ اسے نزل سمجھتا نہ مازی۔ نہ سندر نہ دیوی۔ وہ تو اس کا باجو تھی۔ پھر کوئی بات اس سے چھپتا بھی تو نہ تھا۔ کیسے چھپاتا۔ ہر سے وہ دونوں اکٹھے رہتے۔ کھیت میں۔ گھر میں۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا۔
وہ بے نمل ہو گئی۔ سمجھی جیسے جل کھڑی جو ہر میں آگئی ہو۔

لاکھے کسان کو وہ بے کی ایک بات پر بڑی چڑ تھی۔ کہتا۔ ”ری تو گندی کیوں رہتی ہے۔ نہاتی دھوتی کیوں نہیں؟ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے۔ الیاں بلیاں لگی رہتی ہیں۔ بال چکٹ۔ آنکھوں میں کیچ۔“ دیکھو یہ من کر گردن لٹکا لیتی۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھانہ نے تاؤ کھا کر بالٹی اٹھائی اور وہ بے پر انڈیل دی۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا۔ وہ بے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھولے اور ماتھے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو۔

پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنہرے لائے بال۔ موری گردن۔ کٹورہ سی آنکھیں۔ دھاری ناک۔ پھول سے ہونٹ۔ چھوٹی موٹی سا بدن۔۔۔۔۔ ”تو کون ہے ری؟“ وہ لکھیا کر بولا۔ ”تو استری نہیں۔ تو تو پری ہے ری پری۔“

بالکا کچھ دیر کے لئے چپ رہا۔ پھر بولا۔ ”بس اس دن سے لاکھے کے من میں جھجک بیٹھ گئی اور وہ وہ بے سے دور ہٹا گیا۔ وہ بے نے بار بار اسے سمجھایا۔ ”دیکھ لاکھے میں پری نہیں استری ہوں۔ استری۔“

پر اس کی جھجک نہ گئی۔ بولا۔ ”تو پری نہیں تو استری بھی نہیں۔ تو مور ہے میں گاگ ہوں۔ تیرا میرا کیا سمبندھ؟ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے نہیں۔“

کچھ دن وہ بے اس کا منہ بکتی رہی۔ پھر زراش ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی۔ ”چل شوشی۔ یہاں ہمارا دانا پانی کھتم ہو گیا۔“

شوشی نے سر جھکا لیا۔ اور جوں کی توں بیٹھی رہی۔ جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ شوشی اب لاکھے کی ہو چکی تھی۔
وہ بے کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور وہ چپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی۔
بالکا چپ ہو گیا۔ سبھی چپ ہو گئے تھے۔

کسی کو ”پھر کیا ہوا“ پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا۔
پھر بالکے نے کہا۔

”پھر یہ نہیں۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔ وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

”آج بھی آدھی رات کے سے راج گڑھی سے آواہیں آتی ہیں۔۔۔۔۔ پر بھو یا ہر کی سندر تا کو بھتر میں رچا دے کہ استری استری بن جائے۔۔۔۔۔ پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلوانا رہے۔“
بالکا چپ ہو گیا۔ ٹیلے پر خاموشی چھا گئی۔

پھر کوئی دور سے بولا۔ وہ بے رانی نے سچ کو پالیا۔ جو اپنی سندر تا کو اچھالتی ہیں۔ بناؤ سنگھار کا راکشش کھڑا کرتی ہیں انہیں برابری مانگنے کا کوئی اوجھار نہیں۔
انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے۔

باجوؤں کی ڈھونڈ

پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ نجر دھند لا گئی ہے۔ جاگتے ماں اپنے دھمیں ہیں۔ دل کو دھڑکن لگ گئی ہے۔ ڈاکدار کے ہے 'دل' ماں کاٹنا لگ گیا ہے۔ لو اس عمر ماں بھلا کیسے لگے گا کاٹنا اور پھر اس گھر ماں۔ یہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ یوں پڑا ہوں جیسے سونے کی کھمبل کی ڈبی ماں پڑی ہووے ہے۔

یہ کمر ا جہاں رہتا ہوں، ماں انڈے کی طرحوں چمکے ہے۔ نیچے گلیچو بچھا ہے۔ اتنی صفائی ہے کہ کھلتی ہے۔ ایمان سے۔ کھاناں دخت پر روٹی لاوے ہے۔ دخت پر نقشہ، دخت پر چاہ، دخت پر دودھ۔ نہ ڈینگ روم ماں جانا پڑے ہے۔

شیدے نے پہلے روج ہی کھاناں سے بول دیا تھا۔ دیکھو کھاناں بڑے چوہداری سبب کا شہ لچا دھر لگے گا۔ بڑے سبب کے کمرے ماں اور ڈینگ روم میں یکنے سے ادھ گھنٹہ پہلے لگے گا۔ بعد ماں نہیں۔ ساتھ نہیں۔ سمجھے۔۔۔؟

شید ا بڑا کھیاں رکھے ہے۔ روج آوے ہے اک وار اس کمرے ماں۔ بچھن کے لئے۔ ہو دی کدی کدی آجلوے ہے نجر آتے جاتے۔ بڑی اچھی ہے۔ سلام کرے۔ پچھے ہے بابا اچھے ہیں۔ آپ مسکا کے بات کرے ہے پر چلتے چلتے۔

آج کل رواج ہی ایسا ہے۔ ہویں رکتی نہیں، بچاری کیا کریں۔ رکنے کا ٹیم نہیں ہوتا۔ اندر اتنی جان ہوتی ہے کہ رکنے نہیں دیتی۔ ہمارے جمانے ماں بھی جان ہوا کرے تھی۔ گھر والی ماں بڑی بڑی جان ہوتی تھی۔ پر وہ ٹھنڈی جان ہووے تھی۔ اب تو تھی ہووے ہے۔ بڑی تھی۔ اتنی کہ بھڑاس نکلے ہے۔ پہلے بھی بھڑاس ہووے تھی۔ پر دے نکلے نہیں تھی۔ جلی پاتھی کی طرحوں اوپر سے کالی سوا۔ نیچے لال انگارہ۔ اب تو لال انگارہ اوپر ہووے ہے۔ دخت دخت کی بات ہے بھائی۔ کدی ماں بھیت پر چھا کر رکھیں ہیں۔ کدی باہر جا کر رکھیں ہیں۔

سارا دن ماں اپنے بنے بچے کمرے میں ماں آرام سے پڑا رہوں ہوں۔ بس ایک تخلیت ہے۔ ماں نہیں دکھتا۔ بچنے سے اک عادی پڑی وی ہے کہ اسان دکھتا رہے۔ جو اسان دکھتا رہے تو حوصلہ رہے ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ ایک تو دل تنگ نہیں ہووے ہے۔ دو بچے جند گانی بند بند نہیں لگے۔ پھر یہ بھی کہ اسان دکھے ہے تو اسان والا بھی دور نہیں لگے ہے۔ جیسے نیرے نیرے ہو۔ پاس ہو۔ ساتھ ہو۔ اک تسلی سی رہے ہے۔ جندگی میں کیا چلے۔ بس اک تسلی۔ اور کیا۔

اس کمرے ماں اسان نہیں دکھے ہے۔ بس یہی ایک تخلیت ہے۔ بڑی تخلیت ہے۔ پھر رو بچے ہیں۔ ساری عمر کھلے درو جوں ماں بتائی۔ پر اس کمرے کے درو بچے بند ہی رہیں ہیں۔ کھلتے تو اس پر کھل کے نہیں دیتے۔ پھٹ سے بند ہو جاویں ہیں آپ ہی آپ۔ پھر درو جوں پر پروے پڑے رہیں ہیں۔ یہ سیسے کا ہے۔ یہ جالی کا، یہ گرل کا، یہ کپڑے کا، پر دے ہی پر دے ہی پر دے۔ بھلا اسان کیسے نجر آئے۔ بس تین ہی تین دکھے ہے۔ وہ بھی بنی بنی کچی کھٹکے والی۔ مٹی والی دھرتی نہیں دکھتی۔ بوٹے نہیں دکھتے۔ ویسے بوٹے تو بہت ہیں بیٹھے ماں۔ وہ بھی طرحاں طرحاں کے۔ پر بھی ہلائی گلوں والے۔ دھرتی والے نہیں۔

چلو اسان نہیں دکھتا تو نہ سہی۔ اتنی سی بات سے کاٹنا تو نہیں لگتا ناول ماں۔ پھر ڈاکدار کیوں بات ہے کاٹنا لگ گیا ہے۔ بھیا۔ کاٹنا تو دکھ میں لگے ہے سکھ ماں تو نہیں لگے۔ ماں تو یہاں سکھ میں پڑا ہوں۔ سمجھ کر لو جس طرحوں گرمی بدام میں پڑی ہووے ہے۔ پھر کاٹنا کیا۔

ماں ایک بات جو رہے۔ نجر دھند لا گئی ہے۔ منے یہ ڈاکدار کو نہیں بتائی جو بتا دیتا تو وہ پتہ۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا کیا بچتا۔ ویسے بھی ماں باجوؤں کی بات جو بتا بھی دیتا تو کیا وہ سمجھ لیتا۔ ماں تو اند نہیں سمجھ پایا باجوؤں کی بات کو۔ پھر بھلاوے کیسے سمجھاتا۔ منے تو اپنے پتر شیدے سے نہیں کری یہ بات۔ بھلا بتاؤ جس بات کا نہ سر ہو نہ پیر، وے کون سمجھائے۔ کون سمجھے۔

اور کوئی سمجھے بھی کیسے باجوؤں کی بات۔ باجوؤں کا تو جمانے ہی نہ رہا۔ وہ تو نکلے سے ختم ہو گیا۔ اب تو باجوؤں نے روپ ہی بدل لیا ہے۔ وہ تو گلے کا ہار بنے وے ہیں۔ اب وہ پرانے جمانے کے باجو نہیں۔ اب تو کھلی جسم رہ گیا ہے۔ ٹیکھا۔ بنڈوا۔ یوں جیسے تیر کمن پہ چڑھا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب پتہ نہ۔

یہ جب اور اب کا جھگڑا اسدا کا ہے بھائی۔ ہمیش جب جب رہا اور اب اب۔ نہ کدی جب اب ہوا۔ نہ اب جب۔ دونوں ماں پھا صلا ای رہا۔ اب تو یہ پھا صلا روج بروج بڑھتا ہی جاوے ہے۔ دنا ماں صدیاں کا پھر پڑتا جاوے ہے۔

ماں تو نجر کی بات کر رہا تھا ماں۔ اپنی نجر دھند لائے کچھ جیاوہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ یہی چار ایک

نہتے ہوئے ہوں گے۔ نہیں بھی دیکھنے میں تو بھرتی نہیں آیا۔ سب کچھ دکھے ہے۔ ٹھیک ٹھاک
دکھے ہے۔ کمرے کی تانکیاں دکھیں ہیں۔ دروازے دکھے ہیں۔ پردے دکھیں ہیں۔ کوچ دکھے ہے۔
میچ دکھے ہیں۔ سب چیخیں دکھیں ہیں۔ صاف دکھیں ہیں۔ کوئی جیسے نہیں دھندلائی۔ صریح نظر
دھندلائی ہے۔ یوں کہ کھوا کھواہ کہ چیخیں دکھنے لگی ہیں۔ وہ بھی ہستی نہیں، صریح دو باجو۔
دو باجو میرے کمرے میں گھس آئے ہیں۔ وہ میرے آسے پاس یوں گھومیں پھریں ہیں جیسے
سریت کی بوتل کے گرد گھمیں۔

پہلے دن رات سے باجوؤں کو دیکھا تو ماں گھبرا گیا۔ ایمان سے رات کا وقت تھا۔ بشیرا کھانا
آیا۔ سنے روٹی میچ پر رکھ دی۔ اس وقت کھانے کو جی نہیں چاہے تھا۔ منے سوچا، چلو کھا لو۔
چودھری فضلے دو برکیاں۔ پھر آرام سے حقہ پوں گا۔

حقہ مجھے بہت پیارا ہے۔ کچھ لومہی اک ساتھی رہ گیا ہے پر لے دیاں کل۔ میرے پاس بیٹہ
رات گئے تو ڈی مجھ سے بات کرتا رہا۔ اپنی کہے ہے۔ میری سنے ہے۔ گھر میں کسی کو میرا حقہ پینہ
نہیں۔ کھانا اسے ہاتھ نہیں لگائے ہے۔ ماں کھدی تاجا کروں ہوں، کھدی چلم پھروں ہوں۔
ہو تو کہے ہے۔ بے۔ بو۔ بو۔ بو۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔ مجھے نخر نہ آئے شیدے نے منہ کھول کر
کدی نہیں کہا کچھ۔ آنے بھانے بہت کچھ کہا۔ کہنے لگا۔ بابا سگریٹ کا براڈبہ منگوا دوں۔ کدی حقہ نہ
بھرا، سگریٹ پی لیا۔ اک روج وہ لے بھی آیا براڈبہ جس میں ڈبیاں تھیں۔ میرے کمرے میں چھوڑ
گیا وے۔ مینہ بھر پڑا رہا میں جوں کا توں بند کا بند۔ منہ نہ لگایا۔ کیسے لگاتا۔ بھائی کہاں گونگا
چرٹ کہاں باتاں کرنے والا حقہ۔ ماں اپنے دکھ سکھ کے ساتھ کو کیسے چھوڑ دیتا بھلا۔ ایک ہی تو ساتھی
ہے اپنا اس بھرے گھر میں۔

ہاں تو میں اس روج کی بات کر رہا تھا۔ منے سوچا، چودھری فضلے کھالے دو برکیاں۔ پھر آرام
سے بیٹہ کر حقہ پئیں گے۔ لوجی ماں میچ پر جا بیٹھا۔ روٹی والا رومال کھولیا۔ پتہ نہیں دو باجو کہاں سے
تیرتے وے آئے۔ اک باجو کا ہتھ کھلا اور وس نے پلیٹاں سے روٹی اٹھا کر میرے ہتھ تھما دی۔ ماں
دیکھتا ہی رہ گیا۔ حریان۔ پھر وہ باجو میرے آسے پاس ہی رہے۔ بوٹی کھانے لگا تو دو انگلیوں نے پکڑ کر
سامنے رکھ دی۔ پانی پیئے لگا تو گلاس ہتھ میں پکڑ لیا۔ ماں تو حریان۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بس اس روج سے آج تو ڈی ہی ہو رہا ہے۔ دن رات، اندھیرے سویرے، سر بھرا بھارا ہو
تو انگلیاں پڑ پڑیاں سلواویں ہیں۔ تھکاوٹ ہو تو ہاتھ پنڈلیاں دباویں ہیں۔ اٹھتا ہوں تو باجو سارا دیویں
ہیں۔ کھاٹ سے اٹھوں تو جو تاسا منے رکھ دیویں ہیں۔ دروج کھولیں ہیں۔ قدم قدم پر سنبھالا دیویں
ہیں۔

پہلے تو ماں سمجھا سٹھیا گیا ہوں۔ من گڈنڈ ہو گیا ہے۔ نخر تھامے کھیل رہی ہے۔ پھر سوچ سوچ
ماں نے کہا۔ چودھری فضلے یو بات نہیں۔ نہ تو من دھندلایا ہے، نہ نخر۔ یہ کچھ اور ہی بات ہے
سوچتا رہا، دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ باجو چپے نہیں، گورے نہیں، بڑا ہی ہیں۔ بھرے بھرے۔ سوکھے
ہیں۔ بنے سجے نہیں جیسے آج کل ہویں ہیں۔ نہ رنگ دار نہ ریشم نہ ملیں۔ پر ہیں صاف
توڑے۔ درستی نہیں کامی ہیں۔ انگلیاں یہ موٹی موٹی ہیں۔ بھنڈیوں کی طرح ہیں۔ نہ کلیاں، نہ پتلی
ہاں، نخون پڑھے وے نہیں چھریوں کی طرح ہیں۔ رنگ دار نہیں سارا دیویں ہیں۔ دکھنے والے
ہو آج کل کے باجو نہیں چھینرتے نہیں سنبھالتے ہیں۔ ڈولتے نہیں، سارا دیویں ہیں۔ دکھنے والے
نہیں کامی ہیں۔ تو بھائی ماں دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔

کدی کدی لگتا جیسے جانے پھانے ہوں۔ و۔ لیکن ماں سنے پرورتن ماں جانے پھانے۔ میرے
آسے پاس ہوں ماں تیریں ہیں تو ان جانے دکھیں ہیں۔ سردیوں میں سارا دیویں ہیں تو جانے لگیں
ہیں۔

پھر اک دن بھید کھل گیا۔

میری نخر باجو کی کٹی پر جا پڑی۔ پھوڑے کا اتنا بڑا انسان۔ ارے یو تو سگو کے باجو ہیں۔
پھر ماں سوچن لگا۔ چودھری فضلے یہ جو تجھے دن رات سگو کے باجو دکھنے لگے ہیں۔ کیا تجھے وس
سے موجودت تو نہیں ہو گئی۔۔۔۔۔ پھر ماں کھدی ہی ہنس پڑا۔ یہ موجودت کی بات بھی ایک رہی۔
چودھری فضلے زندگی کے تیرے وے تو نے سگو کے ساتھ گزار دیئے۔ تیرے وے۔ پر تجھے وس سے
موجودت نہ ہوئی اور اب جد اسے مرے وے پنج وے ہو گئے ہیں، اب کیا تجھے وس سے موجودت ہو
سکتی ہے۔ اس پر ماں اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور پھر سگو سے موجودت۔ سگو سے کیسے موجودت ہو سکے ہے بھلا۔ سگو تو باجو ہی باجو تھی۔
خالی باجوؤں سے کون موجودت کر سکے ہے بھلا۔ اس اللہ کی بندی نے نہ کدی منہ کی ٹکڑی سجا لی، نہ
’کھائی‘ نہ ہی سامنے دھری۔ منے بھی کدی منہ کی طریقہ دھیان نہ دیا۔

ویسے سگو کا منہ بھی تھا، ہتھ بھی تھا اور جو بیٹا تو بڑے جور کا تھا۔ تیکھا۔ کانٹے کی طرح چھینے
والا۔ چھیل دیوے تھا۔ پر وسنے اسے موٹی چدر ماں ہی لپیٹے رکھا۔ ہمیش یوں جیسے چور کی جیسے ہو۔
منے تو سب کچھ ہی لپیٹے رکھا۔ سب اک باجو ہی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

سارا دن وسکے باجوؤں سے بھرا رہتا تھا۔ ادھر وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔ ادھر بھانڈے مانج
رہے ہیں۔ پھر دیکھو تو جلتے تنور میں لٹکے وے ہیں۔ چانی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ آٹا گوندھ رہے
ہیں۔ بلوہنی سے چٹے وے ہیں۔ مجھ دوہ رہے ہیں۔ گتوا کر رہے ہیں۔ سکی بنا رہے ہیں۔ ماں کھیت

پھر ایک دن تھمے بٹھائے سگو پھوٹ ہو گئی۔ کیچہ ماں پیزا مٹی۔ باہیں اٹھا کر بولی۔ رے پکڑ لے
رے مجھے۔ پہلی بار دونوں باجو میرے گلے میں ڈال دیئے کھلے ہندوں۔ پھر اک پچی لی اور ٹھنڈی ہو
ئی۔

ہائیں یہ دروجہ کیوں بجا۔ کون ہے رے دروجے پر۔

”تو اندر آجانے۔۔۔ بول کی بات ہے؟“

”کیا کہے وہ تیرا سبب؟“

”کہیں جاتا ہے رے؟“ چودھری فضلے نے پوچھا۔

”پلاں والے۔۔۔؟“

”پر کس لئے۔۔۔۔؟“ یو بھی تو جا۔“

”ہائیں میت ماہر نکل آئی ہے۔“

[illegible]

تہ ورے میرا گھر ان باجوں سے بھرا رہا۔ اور صبر بردہ گھر ہی نہیں، میرے کھیت میں بھی ۱۰

سگوماں جنانی بھی تھی یو نہیں کہ کھائی باباں ای باباں تھیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ آلو کا بوٹا تھی۔

ماہر۔ اور پھر دور دور تک مشک مارے ہے۔ وقت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مشک لکھنے کا

کدی کدی سگو کی جتانی بولا بھی کرے تھی۔ اکھ سے اکھ ملا کر نہیں، جھکی نجر سے چلتے چلتے۔

گدھی کدے کہت تھے یو بات۔ دو چار مہینوں میں آگ لوہ داری۔ کدھی ماں کہہ دیتا ہنس

ہمارے وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے۔ ماں بھی لٹا پٹا اکیلا پلاں والے پہنچا تھا۔ وہ بھی

نے تھوڑی سی تین دے دی۔ اک ٹوٹا چھوٹا گھر دے دیا۔ پھر ماں مل پر جت گیا۔ وس نے باجو نکال

چھاؤں کر دی۔ گھر میں سگو کے باجوؤں نے لر بہر کر دی۔ کھیت ماں پیدا بڑھی تو مجھ لے لی۔ گھر ماں

گیا، وجہ لیا۔ ماسٹر نے کہا، چودھری تیرا پتر بڑا مسیب بنے گا۔ سوہن گیا۔

رہتی، مار نہ لگتی۔ بڑی اونچ نیچ دیکھی ان دنوں۔ بڑی جورا جوری کرنی پڑی۔ پر اب ماں سوچوں ہوں

پرست رہے ہے۔ کھلی آرام تو لو ہے کو بھی جنگ لگاوے ہے۔

حاتا۔ گھر کو تو سگو کے باجوؤں نے میرے لئے تخت بنا رکھا تھا۔ اور میری پکڑی پر طرہ لہرا رکھتا۔ اتنی

کدی کدی اسمان تلے بیٹھے دے اور سے اک اواج سی آتی۔ چودھری فضلے کچھ اور جتے تے

اس وقت سورج مغرب میں یوں غروب ہو رہا تھا جیسے مندر پر رنگ چپکریاں چلا رہا ہو۔ مندر کے پرلے سرمے پر کھٹے بوہڑ کے درخت کے لمبے سائے میں بیٹاشام مراری باسری پر کلیان بجا رہا تھا۔ بادلوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دور ان پورنا کے گاؤں میں کوئی چکی کراہ کراہ تال

”وہ یہ کہ ایک دم سے دیوی کھل بندھنا کی لگن کیسے لگ گئی۔ یہ کالج والیوں کو کیا ہوا کہ دیوی کے چرن چھوئے آگئیں۔ انہیں نہ تو دیوی پر وشواش ہے نہ دیوتا پر۔
پورن ماشی پر بس پانچ چھ آجایا کرتی تھیں۔ اب کے چالیس کیسے آگئیں؟ ہے بھگوان کیا یہ ہے۔۔۔۔!“

پڑی۔ ساس کے من میں پڑی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکھوے ہے۔ جتنا پتی چاہے ہے، اتنا ہی ساس جلے ہے۔ بس گھولے ہے۔ اپنے پتر کو مجھے راس کر کے دیوے ہے۔

اودھوہ تڑپے ہے لور میں تڑپوں ہوں۔ سچ میں ساس دیوار بن کر کھڑی رہے ہے۔ بس یہی میرے نصیبے کا بندھن ہے۔ کیا پتہ اس پورن ماشی میں دیوی ماشی میں دیوی کھل بندھنا میرا یہ بندھن کھول دے۔ ”وہ ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“ ”جے ہو دیوی کھل بندھنا کی۔“

”کھی کھی کھی کھی۔“ کنول ہنسی۔ ”بھولی عورت یہ جو ساس بندھیں، یہ تو پتی کے وینرے کے چاند ہیں۔ ان کی اپنی روشنی نہیں۔ مانگے کی ہے۔ پتی مہاراج کی دین ہے۔ سارا چٹکار سورج مہاراج کا ہے۔ چاہے تو ساس کا چاند چکا کر ہو سر پر لٹکا دے۔ چاہے تو نند کا ہاتھ اچلا کر بھاون کی آنکھیں چند حیا دے۔“

”سچ کہتی ہو۔“ سندری بولی۔ ”سب کھیل مہاری کا ہے۔ چاہے تو بند ریا نچا دے۔ چاہے تو مینا سے ٹپ ٹپ کر ادا دے۔“

کانتا سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”پگلی ساس نند تو پتلیاں ہیں۔ پتی دیو کے ہاتھ میں ڈوری ہے۔ جسے چاہے نچا دے۔ بچارے مات پتا کا کیا دوش۔“

”مات پتا۔۔۔۔۔“ سینے ماتھے پر گھوری تن گئی۔ ”سکھو عورت کا کوئی بھی اپنا نہیں۔ نہ بھائی۔ بس نہ مات پتا۔ یہ وہ ناؤ ہے جس کا کوئی پتوار نہیں۔ بس ڈولن ہی ڈولن ہے۔ جیون بھر کا ڈولن۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر ایک ہنگی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تیری چتا کیا ہے ری؟“ سندری نے پوچھا۔

”مت پوچھ۔ نکیلے چیٹی۔“ دکھیا کو نہ چھیڑ۔ پھوڑے کو ہاتھ نہ لگ۔“

”میری پتا۔“ سے گنگائی۔ میں اک بکاؤ مال ہوں۔ مات پتا مجھے دو بار بیچ چکے۔ اب تہی بار کے داؤ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے بیچتے ہیں، پھر بیٹے نہیں دیتے کہ پھر سے بیچ سکیں۔“

سے اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر مورتی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بولی۔ ”ہے کھل بندھن دیوی۔۔۔۔۔ جتا۔ کیا میرے بھاگے میں بکنا ہی لکھا ہے۔ بول جو ایسا ہی ہے تو بتا کہ میں خود اپنے کو بیچوں۔ کھلے بندوں بیچوں۔ روج کے روج بیچوں۔ مجھے یہ دکھ تو نہ رہے کہ مات پتا اپنی پیٹ جالی کو بکاؤ مال بنائے بیٹھے ہیں۔“

کنول اٹھی۔ اس نے سب کو کلاوے میں بھر لیا۔ بولی۔ ”جی برانہ کر ہنا۔ اک تو ہی نہیں۔ ہم سب بکاؤ مال ہیں۔ کوئی خود کو اک ہی مرد کے ہاتھ روز کے روز بیچتی ہے۔ کوئی رنگ رنگ کے پرش کے ہاتھ بکتی ہے۔“

دے رہی تھی۔

وہ سب چونک اٹھے۔ ”ہائیں یہ کیا؟“

”یہ کیسی آواز ہے؟“ سیوا کارن نے پوچھا۔

”یہ چاتری ہیں۔“ دیوی بھاگی بولی۔ ”دیوی کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر گیان دھیان کی بجائے ہنس بول رہی ہیں۔“

بانورہ ہنس کہنے لگا۔ ”ان آج کل کی چھو کریوں کو کیا پتہ کہ دیوی کیا ہووے ہے۔ بندھن کیا ہووے۔ جیون کیا ہووے ہے۔“

مندہ رے ہنسی کا ایک اور ریلا اٹھا۔

کانتا کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ بولی۔ ”یہ ہنسنے کی بات نہیں، رونے کی ہے۔ یہ سارے شبد دیوی، رانی، استری، شرمیتی، عورت، دو من سب چھوٹے ہیں۔“

”تو پھر سچا لفظ کون سا ہے؟“ کوٹلیا نے پوچھا۔

کانتا بولی۔ ”میری طرف دیکھو۔ میں نہ دیوی ہوں، نہ شرمیتی ہوں، نہ دو من ہوں۔ میں اک باندی ہوں باندی۔ اے سب صرف میں ہی نہیں، تم ہم سب۔ وی آر آل سیلز۔۔۔۔۔ سیلز۔“ ”سچ کہتی ہے۔“ کنول بولی۔ ”ہم سب اپنے ماسٹر کا دل خوش کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ہم اپنے مالکوں کی خوش وقتی دیتی ہیں۔ اے مو منٹ آف جائے۔ اے مو منٹ آف آسٹ منٹ۔ ایک لذت کا لمحہ۔ وقتی چٹارہ اور بس۔“

”نہ ابلا ایسا نہ کو۔“ دیہاتن بولی۔ ”انہری داسی نہیں، مالکن ہوتی ہے۔“

”کھی کھی کھی کھی۔“ کنول تمسخر سے ہنسی۔

”مجھے بتا تو وہ کون عورت ہے جو داسی نہیں بلکہ مالکن ہے؟“ کانٹا نے پوچھا۔

”میں ہوں۔۔۔۔۔ میں۔“ دیہاتن نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں اپنے پتی کے من پر راج کرتی ہوں۔ مسکا کر دیکھوں تو وہ لہلہا اٹھے ہیں۔ گھوری دکھاؤں تو مر جھا کر گر پڑے ہیں۔ سوکھ جائے ہیں۔“

”جو ایسا ہے۔۔۔۔۔“ کانٹا نے غصے میں کہا۔ ”تو تو کھل بندھنا دیوی کی پوری ماشی میں جھک مارنے آئی ہے کیا؟“

”یہاں تو بندھن کھلوانے آتے ہیں۔“ کوٹلیا نے وضاحت کی۔ ”تو کون سا بندھن کھلوانے آئی ہے۔“

”سچ کو ابلا۔“ سچ کو دیہاتن نے جواب دیا۔ ”میرے بھاگیہ کی گانٹھ پتی کے من میں نہیں

”کیا فرق پڑتا ہے؟“ کانٹا نے کہا۔ ”ایک کے ہاتھ بار بار بکویا ہر رات نے گاہک کے ہاتھ بکویا۔
 بکنا ہمارا بھاگیہ ہے۔ کتنا بڑا بندھن ہے۔“

”صرف ایک نہیں۔ بندھن ہی بندھن ہیں۔“ کنول غصے سے چلائی۔

”انٹھو ہرنا سب بندھن توڑ دو۔ اپنی ہمت سے توڑ دو۔“ بھنگے چلائی۔

”ایک بھی باقی نہ رہے۔ یہ پتھر کی دیوی کھل بندھنا بے چاری کیا کرے گی۔“

”ہوش کرو لڑکیو۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ مائی بھاگی بات کے بغیر نہ رہ سکی۔ ”مندر میں کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر تم پورن ماشی سے ایک رات پہلے دیوی کے خلاف اپنے من میں بس گھول رہی ہو۔“

”کیوں نہ بس گھولیں۔“ کانٹا بولی۔ ”ہم تو دیوی کے پاس صرف اس لئے آئی ہیں کہ پروٹ کریں۔ کیا دیوی کو نظر نہیں آتا کہ بندھنوں نے عورت کا بند بند لہلہا کر رکھا ہے۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہوگی۔“

”نہ نہ نہ نہ۔“ بھاگی کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس کا رنگ ہدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ خوف کے مارے آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ”نہ نہ نہ نہ۔“ وہ بولی۔ ”دیوی سے ایک بندھن کھولنے کی منت کرو۔ کوئی ایک بندھن۔ پر نہ وہ باہر کا بندھن ہو، بھیت کا نہیں۔ جو تم نے سارے بندھن کھولنے کی پرارتھنا کی تو۔۔۔۔ نہ نہ نہ نہ۔ ایسا نہ کرو۔ جو دیوی نے تمہاری سیل تو۔۔۔۔ تو کیا ہو گا؟“

ایک ساعت کے لئے سب ڈر گئیں۔

”کیا مطلب ہے؟“ کنول نے ہمت کر کے پوچھا۔

”جو باہر بھیت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تو۔۔۔۔۔“ بھاگی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”ٹوٹ گئے تو۔۔۔؟“ بھی بول کھلا سی گئیں۔ تو کہا۔

”تو تم بھی مہمان کے سامن ہو جاؤ گی۔“ بھاگی رک گئی۔ جیسے اس کے گلے میں آواز نہ رہی ہو۔

”مہمان کے سامن۔“ سب نے دہرایا۔

”عین اس وقت سب کا رن کی آواز سنائی دی۔۔۔۔۔“ بھاگی۔۔۔۔۔

آواز سن کر بھاگی جیسے جاگ اٹھی۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ شرمندہ سی ہو گئی۔ دانتوں میں زبان دیئے

بھاگی۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر کنول بولی۔ ”یہ کون تھی؟“

”کوئی مندر کی ہے۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی۔“

دوسرا تن بولی۔ ”کہہ رہی تھی اگر دیوی نے تمہاری مانگ پوری کر دی۔ سارے بندھن کنول دیئے تو پھر کیا کرو گی۔“

”نان سنس۔“ کانٹا نے ناک چڑھائی۔

”مجھے یہ مندر و ندر دیوی دیوی۔ سب پا کھنڈ معلوم ہوتا ہے۔“ پہلی ساڑھی والی پہلی مرتبہ بولی۔

”جو ایسا ہے تو یہاں کیوں آئی ہو؟“ کنول نے پوچھا۔

”چاندی کے رے کو کھلتے دیکھنے آئی ہوں۔“ پہلی ساڑھی والی نے کہا۔

”کیا واقعی رسہ کھلتا ہے؟“

”کتے ہیں۔ یوں تار تار ہو جاتا ہے جیسے دھوکو کو سوکھنے کے بعد پال کھلتے ہیں۔“

پہلی ساڑھی والی اٹھی۔ بولی۔ ”سب پا کھنڈ ہے۔ نہ پرارتھنا سے کچھ ہو گا نہ مانتا کھینے سے۔ نہ منتوں ترلوں سے۔ اگر اس سدا کی غلامی سے نجات پانا ہے تو انٹھو جدوجہد کرو۔ جان لڑا دو ورنہ اس مرد کی دنیا میں عورت کا کوئی مقام نہیں۔“

”بالکل بالکل۔“ چاروں طرف سے شور مچ گیا۔

شہر سے دور، شاہراہ سے دور، شوالک پہاڑیوں میں، بھی ہوئی پگڈنڈیوں کے بیچ درختوں سے گھرا ہوا ایک گاؤں ہے۔ ان پورنا۔۔۔۔ اس گاؤں سے ایک میل جنوب کی طرف ایک کھلا میدان ہے جس کے درمیان میں ایک بہت پرانا مندر ہے جسے کھس بندھنا کامندر کہتے ہیں۔ یہ مندر اتنا پرانا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب تعمیر ہوا۔ اس کی بناوٹ بھی مندر کی سی نہیں۔ نہ مندر کا مخروطی گنبد نہ کھس۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جس کی چھت نیچی ہے۔ ہال کمرے درمیان میں ایک چبوترے پر پتھر سے بنا ہوا قد آدم دیوی کا مجسمہ ہے جس کے خدو خال وقت کی خرابی کی وجہ سے گھمے پٹے ہوئے ہیں۔ صرف آنکھیں واضح ہیں جو لمبی اور تر چھٹی ہونے کی وجہ سے یوں ڈولتی محسوس ہوتی ہیں جیسے کشتیاں ہوں۔ دیوی کے قریب ہی ایک موٹا سا چاندی کا رسہ چھت سے لٹک رہا ہے جو چاندی کی پتلی پتلی تاروں کو باٹ کر بنایا گیا ہے۔

ہال کمرے کے ارد گرد تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن کے ارد گرد ایک

جھونسا سا برآمدہ چاروں طرف گھومتا ہے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے وہ مندر نہیں، بدھ مت کے پجاریوں کا پاٹ شالہ ہو۔

”پرانے زمانے سے یہ پتھر کی بنی ہوئی عمارت دیوی کھل بندھنا کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ دیوی کا اصل نام کیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے کہ وہ بندھن کھول دیتی ہے۔“

ہر سال بیساکھ کی پورن ماسی کے دن ارد گرد کے علاقے سے عورتیں دیوی کے آگے بس نوانے کے لئے آتی ہیں۔ کوئی پتی کے من میں پڑی ہوئی گرہ کھولنے کے لئے پزار تھنا کرتی ہے۔ کوئی بیٹے کے دل میں پریم بندھن کے خلاف ہلکا کار چلاتی ہے۔ کوئی ساس بہو کے کردہ کھولنے کی جنتی کرتی ہے۔ کوئی اولاد کی روک کارونا روتی ہے۔

پورن ماسی کی رات شام ہی سے دیوی کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں رات بھیتی ہے، بھنے پر ایک کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب بارہ متری درت لے شروع ہوتی ہے۔

”دیوی۔۔۔۔۔ کھل بندھنا۔“

اس پر سارے یاتری اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دل پر وجدان طاری ہو جائے تو سارے اعضاء رقص کرنے لگتے ہیں۔ کوئی برمال، کوئی گیت۔ جب یہ رقص اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو مندر میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یوں جیسے آکاش سے گھنٹہ گرنے ہوں۔

اس پر پجاری ساکت ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھک ٹھک گھنٹہ بندھ پاؤں قدم قدم قدم قریب آتے ہیں اور دیوی کے پاس آکر رک جاتے ہیں۔

عین اس وقت مندر کا مہامستری سنگھ بجاتا ہے۔ سنگھ کی آواز سن کر پھر سے کھل بندھنا کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ سنگھ روتا ہے ڈھولک سر بٹیتی ہے۔ اور لوگ بھجن کے پردے میں آہ زاری کرتے ہیں۔

عین اس وقت سیوا کارن جو گیا دھوتی میں ملبوس موٹے کے ہار لپیٹے دیوی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ تیز۔۔۔۔۔ تیز۔۔۔۔۔ اور تیز۔ ساتھ ہی چھت سے لٹکا ہوا چاندی کا رسہ جھومنے لگتا ہے۔ اس جھولن جھومن میں رے کے بل کھولنے لگتے ہیں۔ کھلتے جاتے ہیں حتیٰ کہ چاندی کی تاریں یوں ایک ایک ہو کر لٹکنے لگتی ہیں جیسے کسی میار نے سکھانے کے لئے بال کھول رکھے ہوں۔

یہی دیوی کا معجزہ ہے۔ اسی لئے دیوی کا نام کھل بندھنا مشہور ہے۔

ساری چاتریاں ایک ایک کر کے مندر سے جا چکی تھیں۔ صرف کانٹا کنول اور سیسے عورت کے بندھنوں کی شکایت کی زنجیر میں بندھی بیٹھی تھیں کہ مندر کی گھنٹی بجی۔ وہ تینوں چونکیں۔ ان کے سامنے سیوا کارن کھڑی تھی۔ بولی۔ ”مندر کے دور بند کرنے کا سہ ہو گیا۔ اب تم اپنا ٹھکانہ کر لو۔“

”کہاں ہے ہمارا ٹھکانہ؟“ کنول نے پوچھا۔

”جس کو ٹھنڈی میں بھی جگہ ملے۔“

”اور جو کو ٹھنڈیوں کے دروازے بند ہوئے تو۔۔۔۔۔“ کانٹا نے پوچھا۔

”تو کھٹکناؤ۔ مندر میں کوئی رات بھر نہیں رہ سکتا۔ دیوی کی یہی آگیا ہے۔“

”جب وہ مندر سے باہر نکلیں اور ایک نظر لمبے برآمدے پر ڈالی تو سیسے بولی۔ ”سب کو ٹھنڈیوں

کے کواڑ بند ہیں۔ کسے کھٹکناؤں؟“

”باری باری سب کو بجا دو۔“ کنول نے کہا۔

عین اس وقت برآمدے کے درمیان کی کوٹھڑی کا دروازہ چوں کر کے آپ ہی آپ کھل گیا۔

اندر سے دیئے کی مدھم مدھم روشنی باہر آنے لگی۔

انہوں نے کھلے کواڑ سے اندر جھانکا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی

تھی۔ دیوار کے آلے میں اک دیا ٹٹھا رہا تھا۔

جب وہ لیٹنے لگیں تو سیسے نے ڈر سے چیخ سی مادی۔ ”وہ دیکھو وہ۔۔۔۔۔“

”محراب کے پیچھے کوٹھڑی کے پچھلے حصے میں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی جس پر کوئی کالی چادر

لپیٹے سو رہا تھا۔

”کون ہے یہ؟“ سیسے نے پوچھا۔

”کوئی ہوگی۔“ کانٹا نے بے پرواہی سے کہا۔

”آج تو ساری کوٹھڑیاں بھری ہوئی ہیں۔“ کنول بولی۔

”کاتول۔۔۔۔۔“ کانٹا نے کہا۔ ”یہ مہلان کون تھی جس کا ذکر مندر والے کر رہے تھے۔“

”وہی جس کے سارے بندھن کھل گئے تھے۔“

”یہ طوطا مینا کمانی تم مان گئیں کیا؟“ سیسے نے کہا۔ ”سب جھوٹ ہے۔۔۔۔۔ جھوٹ۔“

”اوں ہوں۔ جھوٹ نہیں۔“ کوٹھڑی کے پچھلے حصے سے بھاری بھر کم آواز آئی۔

وہ تینوں چونک اٹھیں۔

”تو کون ہے؟“ سیسے نے بلند آواز سے پوچھا۔

”میں ہی ہوں۔“

”اس کی آواز کو کیا ہے؟“ کنول نے زیر لب پوچھا۔ ”عورت کی سی نہیں۔“
”رو رو کے میرا گارندہ گیا ہے۔“ کالی چادر والی نے کہا۔

”تو ملتان کو جانتی ہے کیا؟“ کانٹے نے پوچھا۔

”جانتی ہوں۔ میں اس کی بالکی ہوں۔“ کالی چادر والی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ کوشنری کی طرف پیچہ کئے ہوئے تھی۔

”مہمان کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے کیا؟“

”مہمان کون تھی؟“

”اس پر کیا پتی؟“

کوئی کچھ نہ کچھ پوچھ رہی تھی۔

پھر کوشنری میں خاموشی چھا گئی۔

دفعاً ”کالی چادر والی بولی۔

”مہمان کے مات پتا نذر کوٹ کی ریاست میں رہتے تھے۔ گھر کھانے کو سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب مہمان ان کے گھر پیدا ہوئی تو ماں باپ کے دل میں امید کا دیا ٹٹمٹایا کہ پتری بڑی ہو گئی تو ریاست کے مہاراجہ کی بھیئت کریں گے۔ چھوٹی موٹی جاگیر مل جائے گی۔ جیون سکھی ہو جاوے گا۔“

”مہاراجہ کی بھیئت؟“ کنول نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں مہاراجہ کی بھیئت۔“ ان دونوں یہ رواج تھا۔

ماں باپ سندھ پتریاں مہاراجہ کی بھیئت کر دیتے تھے۔ مہاراجہ چار ایک روج کل کارس چوتے۔ پھر اسے پرانے محل میں پھینک دیتے جہاں مہاراجہ کے نوکر چاکر پھول کی پنکھڑیں نوچتے اور پھر جب وہ دُفھل بن جاتی تو کل کوشنری میں دھکیل دیتے۔ یہی ان دونوں کی ریت تھی۔

پتری سندھ تھی۔ مات پتانے اس کا نام شوبھا رکھ دیا۔ ”کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔

”شوبھا کون؟“ سیسے گنگٹائی۔

”وہی۔۔۔“ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔ ”جو مندر میں آکر تپتیا کرتے کرتے ملتان بن گئی۔“ وہ تینوں چپ چاپ بت بنے بیٹھی تھیں۔

”مات پتانے شوبھا کے پیٹ اور گالوں پر حلوہ باندھ باندھ کر پتری کو بڑا کیا کہ پیٹ ملائم رہے۔ گال پکنے ہو جائیں۔ رانوں پر گھی کی ماشیں کیس کہ پلک بڑھے۔ کمر پر کمر بند کس دیا کہ رٹ کے

گیند کی طرحیوں ابھر ابھر کر جھٹکے۔“

”توبہ ہے۔“ سیسے نے آہ بھری۔

”جب شوبھا بڑی ہوئی تو اس میں وہ سب کچھ تھا جو مات پتانے چاہا تھا۔ جسم تیار تھا پر من میں اڑان تھی۔“

”اڑان کیوں؟“ کنول نے پوچھا۔

”جب شوبھا کو پتہ چلا کہ اسے بھیئت بنایا جا رہا ہے تو اس کے من نے کہا۔ میں سب کچھ بنوں گی پر بھیئت نہ بنوں گی۔ مجھے تھالی میں پر دس کر دو بجے کے سامنے نہ دھرا جائے۔ میں کتیا ہوں۔ کہا جائیں ہوں۔

جب وہ اسے راجہ کے محل میں لے کر گئے تو حواریوں نے اسے اچھی طرح دیکھا کہ راجہ کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ پھر وہ اسے مہاراجہ کی بیج پر بٹھا کر چلے گئے کہ مہاراجہ ابھی آتے ہیں۔

وہ وہاں سے اٹھ بھاگی۔ کھڑکی سے باہر نکلی۔ پر نصیبے کا لکھا کون مٹا سکے ہے۔ باہر کے کواڑ کی بجائے بھیت کے کواڑ میں سے ہو کر پرانے محل میں جا پہنچی جہاں مہاراجہ کے نوکر تاک میں بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں کتنے روج بھڑیئے اسے جستجوڑتے رہے۔ پر ایک دن وہ وہاں سے بھی نکل بھاگی۔ پریم کا گریا جگہ جگہ سے ترخ چلی تھی۔ اب اس میں دودھ بھرنے کی بات نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ سیدھی شار جانا نیکہ کے پاس پہنچی۔ بولی۔ لے نا کہ مجھے بیچ اور کھا۔ اپنی جھولی بھر۔ اب میں کسی اور کام کی نہیں رہی۔“ کالی چادر والی کاموش ہو گئی۔

دیر تک کوشنری گم سم رہی جیسے اوپر چپ کا تہنو تہا ہو۔ صرف دل دھک دھک کر رہے تھے۔ کروٹیں باہر نکل ہوئی تھیں۔ سینوں کی نوکیں ابھر کر کانٹے بن گئی تھیں۔

پھر کالی چادر والی نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولی۔ ”پھر شوبھا کا وہ چر چا ہوا“ وہ چر چا ہوا کہ مہاراجہ کے درباری بھی اس کے دور پر کھڑے ہو کر اتجار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اک دن مہاراجہ خود چوبارے پر آ پہنچے۔

شوبھا کے پاس گیانا تھا۔ پوشاکیں، جیور، ہیرے، جواہرات اور دھن۔ دھن ہی دھن۔ اوپر سے وہ پھول سان کھلی کھلی تھی پر بھیت میں ایک کانٹا لگا تھا۔ سوچتی کتنی اپرا دھن ہوں میں کہ جگہ جگہ بونیاں رُو آئیں۔ کبی پر مات پتا کو جاگیر نہ لینے دی۔ ان کا کتنا سودا کھونا کر دیا۔ پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔ اس کانٹے نے اس کے بھیت کو لہو لہان کر دیا۔ خود اپرا دھن جاننے لگی تو پھر رہا نہ گیا۔ گئے پاتے کی گٹھڑی باندھی اور چوری چوری چوبارے سے نکل گئی۔

مات پتا کو اپنی قیمت چکانے کے لئے گالوں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ بھوک کے مارے ایزیاں رگڑ

رگڑ کر مر گئے۔ "کالی چلور والی پھر رک گئی۔"

تینوں پھوکریاں یوں بیٹھی تھیں جیسے مایا اتر گئی ہو۔ استری ٹوٹ گئی ہو۔ جیسے پاپڑے کڑا کا نکل گیا ہو۔

”شوبھا کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔“ کللی چادر والی یوں بولی جیسے آواز بھیگ گئی۔ ”دو سرس اور گر گئی ہو۔“ کللی چادر والی پھر رک گئی۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“ سے کھائی۔

”پھر۔۔۔“ کالی چادروالی نے دہرایا۔ ”پھر شو بہا کی نظر میں جیسے سب کچھ، کچھ بھی نہیں ہو گیا۔ دھن دولت بانٹ دی اور کھل بندھنا کے دوچار پر آ بیٹھی۔ دیوی باہر کے بندھن پر ٹوٹ گئے۔ بہتر کے بھی کھول دے۔“ کالی چادروالی آہ بھر کر بولی۔

”بھتر کے دو بندھن اسے جکڑے ہوئے تھے۔ اک یہ کہ اس نے مات پتا کا اعلان کیا تھا۔“
 ”اور دو جا۔۔۔؟“ کانٹا کے ہونٹ ہلے پر کللی چلور والی چپ رہی۔

”پھر۔۔۔؟“ کنول کی آواز سنائی دی۔ پروہت بنی بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔

پھر دور کوئی بالک رویا تو کالی چادر والی چوکی۔ بولی۔ ”سنو سنو۔“ ووجا بندھن آپ ہی بول پڑا۔ اس کے من میں اک بالک روتا تھا۔ متا سر پہنی تھی۔ چھاتیاں سر اٹھا اٹھا کر بین کرتی تھیں۔ وہ تھیلی تزیّتی تھی جہاں بالک آتا چاہے تھا۔ من لہو کے آنسو روتا تھا۔ جوں جوں بالک روتا، توں توں شوہرا کے چرونوں میں تڑپ تڑپ کر بنتی کرتی۔ آدمی آدمی رات کے سے دیوی کے بھجن گاتا۔ دیوی۔۔۔۔ کھل بندھنا۔

اس نے اتنی تمپیا کی۔ اتنی تمپیا کی کہ مہملان بن گئی۔

پھر ایک رات وہ دیوی کے چرنوں میں سیس نوانے بیٹھی تھی تو مندر میں اک ہلکی آواز ابھری۔ ”چپ۔“ اس نے سراٹھا کر دیکھا تو دیوی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی اور سارا مندر ”چپ“ ”چپ“ گنگنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے الٹا اپنی مانگ کر دہرانا شروع کر دیا۔ پھر ایک کرودھ بھری آواز ابھری۔ اندھی منگلی اپنی مانگ کو جان۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھی۔ تو دیوی بولی۔ ”استری بندھن ہی بندھن ہوتی ہے۔ جو بھرت کے بندھن بھی کھل گئے تو استری، استری نہ رہے گی۔“ یہ سن کر وہ ڈر گئی پر سمجھی پھر بھی نہیں۔

دیوی بولی۔ ”اسٹری لیروں کے کھدوسان ہوتی ہے۔ لیریں نکال دو تو کھدو کھل رہے گا؟“ وہ پھر بھی نہ سمجھی۔ ایسی پھر سے تھیکرٹن رٹنے لگی۔۔۔۔۔ ”دیوی کھل بندھنا۔“ ناچ نچان کر دیوی کو مٹانے لگی۔

پھر دیوی جیسے کرودھ میں بولی۔ ”جاتی رہی بھیت کے بندھن کھل گئے۔“

اس پر مندر ڈولنے لگا جیسے بھونچال آگیا ہو اور مہمان گر پڑی۔ ”کالی چادر والی نے چادر لپیٹی اور اٹھ بیٹھی اور قدم قدم ان کی طرف چل پڑی۔

جب وہ محراب کے نیچے پہنچی تو سیسے بولی۔ پھر کیا ہوا؟
وہ رک گئی۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”ہاں ہاں۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر“ کل چادر والی نے اپنے منہ سے چادر اٹھا دی۔ ”پھر یہ ہوئے۔“

انہوں نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دہشت سے ان کی چھینٹیں ٹکل گئیں۔ ان کے سامنے پہچہ نہیں کون سی مخلوق کھڑی تھی۔ نہ وہ عورت تھی نہ مرد۔

تینوں نے سیوا کارن کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ ”سن رہی ہو سیوا کارن۔ سن رہی ہو؟ وہ دیوہری کے چروں میں میمن بیمنٹ کر رہی ہے۔“

سیواکارن بھاگی بھاتی باہر نکلی۔ دونوں مندر کے بڑے دروازے کی طرف دوڑیں۔ مہالان کی کوشلی کی کندھی کھل گئی۔ ”مجھے پتہ تھا کہ اک دن ابھائی کا چکر ٹوٹ جائے گا۔“ سیواکارن سن تو سہی۔ بھاگی چلائی۔
وہ سب سننے لگیں۔

”کھل بندھنا۔۔۔ بندھ دے۔“

”سنا تو نے۔“ بھاگی چلتی۔ ”مہمان نے بول بدل دیئے۔“ ”ہاں۔۔۔!“ سیوا کارن بولی۔

مہاجوگی کہتے تھے، 'ایک دن کسمپوش کا جد چاندی کا رسہ نہیں کھلے گا۔'

”اے دیوی تیری بے ہو۔“

سیواکارن نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیے۔ اندر کوئی گائے جا رہی تھی۔

”کھل بدھتا۔۔۔ بندھ دے۔۔۔ کھل بدھتا.....“

سرخ جھللا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے۔ ہونٹوں پر رضامندی بھرا تبسم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سینتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لیے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر ضلع نے انہیں ایسی کارگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بندہ میں حرکت کی ایوژن لہریں لے رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔ سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھ کر کہے گی۔ ”ہے مجھے سنبھالو۔ میں گرمی جا رہی ہوں۔“ اور جیکٹ والا اپنی سینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا۔ ”ہولڈ آن ڈارلنگ۔ میری گود میں گرنا۔“

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوڑ بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی، ساڑھی والی، بیدنگ کاسٹیوم والی، میکسی والی، سی تھرو لباس والی، لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، نیگے پاؤں والی، پنن، نوکرا بالوں والی، انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں۔ شکاری جیکٹ والا، دانشور، موٹر سائیکل والا، بلیک سوٹ، اچکن، کھیتے پاجامے والا، سٹوڈنٹ، ڈینڈی، مصور

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چل گئی ہے۔ جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاغذ سا باز پڑا ہے۔ پرانی میزیں کرسیاں، شفت اور پتلے جن کا رنگ و روغن اکھڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے۔ آرکیڈ بند ہو چکا ہے۔ ہال میں ساتھ آٹھ بتیاں روشن ہیں شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔

گھڑی نے دو بجائے۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلیوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ والی نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانگا۔ سینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر کیلڈ آئی چمکائی۔ لٹکتے بالوں والی سے چھیننے اڑنے لگے۔

”مائی گاڈ۔“ سی تھرو چلائی۔ ”یہ دیکھو۔ اس نے اپنی ٹانگ لہرائی۔ میری ٹانگ پر نیلی رگیں ابھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔“

روغنی پتلے

شہر کا ایٹ شاپنگ سنٹر۔۔۔ جس کی دیواریں، شفت، لہاریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں۔ جس کا بنا جا فیکٹ جلتے بجتے رنگ دار ساز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلو، سبز، شیشے کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شفت دیدہ زیب سلمان سے لدے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ میٹسم لڑائیاں اور لڑکے یوں ا۔ ستادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں۔ جو ان کی ارد گرد، یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگا رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں۔۔۔۔ ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو، لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیسٹ فیشن کی بات کر کے اپ تو ڈیٹ ہونے کا رعب بھاسکیں۔ نو جوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ غنڈے سیل گرلز سے اتنا سا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کے لیے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھماگ بگمات گرین بوتھ کی نوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں، رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو۔ آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ میں نہیں کر تہ ذر، سخت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن میٹس سے سوئی سلائی تک سی تھرو سے رنگین ملاؤں تک۔ سب کچھ وہاں موجود ہے۔ لوگ گھوم گھام کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے دستور ان میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈسٹریبٹرز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انہیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کا لباس پہنے کھڑے ہیں۔ چروں پر جوانی کی

”کیوں نہ ہو، بلو بلو ہے۔“ بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی۔ ”ساغر کو مرے ہاتھ سے لیتا کہ چلی میں۔“ سب لوگ بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

”تیرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر؟“ کرتے پاچاے والے نے پوچھا۔

”اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تجھے۔“ عین والا ہنسا۔

”میں تو بور ہو گئی ہوں۔“ منی سکرٹ والی نے آنکھیں گھما کر کہا۔

”کیوں مذاق کرتی ہو؟“ موٹر سائیکل والے نے گلیڈ آئی چمکائی۔

”تم تو سرپا حرکت ہو۔ تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔ تم کیسے بور ہو سکتی ہو؟“

”کیوں بناتے ہو اسے۔ اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں، تھر کے گی کہاں سے۔“ دور کونے میں

کھڑے اچکن والے نے کہا۔

”ہاں۔“ پہلوان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا۔ ”وہ تو تیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی

تھر کا کرتی تھی۔ اب تو کاٹھ ہی کاٹھ رہ گیا ہے۔“

”شٹ اپ۔“ عین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ ”اپنے وقیاقوسی رجعت پسند خیالات سے

فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو۔“

”اے مسٹر اچکن۔“ سٹوڈنٹ چلایا۔ ”ذرا آئینہ دیکھو۔ یوں لگتے ہو جیسے سارگی پر غلاف

چڑھا ہو۔“

”یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔“

”ایکس میوزیم میں۔“ جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

”بالکل۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔“

”یہ لوگ زندگی کو کیا جانتیں۔“

”ہپو کرش۔“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”اگنور ہم، ہٹاؤ۔“ کوئی لور بات کرو۔ ”سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی۔

”ہاؤ کین دی اگنور ہم؟ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔“

”ننان سنس۔ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگرس

موو منٹ۔“ جیکٹ والا چلا کر بولا۔

”ہیر ہیر۔“ تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

”ہا ہا ہا۔“ اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی۔ انداز والہانہ تھا۔

تالیاں رک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔

”کون ہے یہ؟“

”کون ہنس رہا ہے؟“

”جنا نہیں۔ اوپر سے آواز آرہی ہے۔“

”ہے میں تو ڈر گئی۔ کتنی ہو رس آواز ہے۔“

قہقہہ رک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ ٹھک ٹھک ٹھک۔

”کوئی چل رہا ہے اوپر۔“

”ہے میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔“

”ہتا نہیں کون ہے۔ منی اسکرٹ والی بولی۔

”ڈونٹ فیئر ڈارلنگ۔ آئی ایم ہیریائی بور سائیڈ۔“

”وہ دیکھو۔“ وہ نوکر پالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

”اوپر۔“ گیلری کے جنگلے پر۔ ”ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اٹھ گئیں۔

گیلری کی ریٹنگ سے ایک بڑا سا بھیا تک چہرہ جھانک رہا تھا۔

”توبہ ہے۔ اف۔“ ہائے۔ ”پتلیوں نے شور مچایا دیا۔

”کون ہے تو؟“ موٹر سائیکل والا اپنا سا یلنر نکال کر غرایا۔

”میں وہ ہوں جو ایک رو مشدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا۔ جہاں آج تو کھڑا ہے۔“

”اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے؟“ سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

”کہاں سے بول رہا ہے یہ؟“ پتلون والی نے پوچھا۔

”میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم بھی نکلی جانے والی ہو۔ لنگی والا کہنے لگا۔

پتلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چنچیں سی نکلیں۔ ”نو نو۔۔۔ نو نو۔ نیور۔ مائی گاؤ۔

ہے اللہ۔“ وہ سب سسم کر بیچے ہٹ گئیں۔

”ڈونٹ مائیڈ ہم ڈارلنگ۔“ عین والا بولا۔ ”یہ تو پٹا ہوا موہ ہے۔ بٹے ہوئے مرے سے کیا

ڈرنا۔“

”دیش اٹ دیش اٹ دے بلانگ ٹودی پاسٹ۔“

”یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھیننا چاہتے ہیں۔“ جیکٹ والا

تعارف سے بولا۔

توڑنے کا کریڈٹ۔ جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لیے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا۔“
 سپورٹس گرل نے بیڈ مشن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔
 ”ڈیفنڈل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو؟“ یہی ہنسنا۔ ”ہم نے دور حاضرہ کے سب سے بڑے
 بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن
 اسٹیج کے واحد دل بہلاوے سال کنفرنس کی نفی کر دی۔ ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔“
 ”یہ بے چارے کیا جانیں۔“ بہن بولی۔ ”ظاہریت کے متوالے۔۔۔ جب کوئی تہذیب
 متعفن ہو جاتی ہے تو اسے سمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں۔“
 ”تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ
 لگایا۔

”بالکل درست۔“ لنگی والا چلایا۔ ”یہ ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو
 دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جھدار آ جاتے ہیں۔ یہ جھداروں کا دور ہے۔“
 ”سلی فول۔“ سی تھرو نہی۔ ”یہ تو رومانس کا دور ہے۔“
 ”رومانس۔“ گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریٹنگ پر آکھڑ ہوا۔
 تم کیا جانو، رومان کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو ٹھنڈا کر کے
 رکھ دیا۔ محبوب سے محبوت چھین کر اسے ریڈی بنا دیا۔ عربانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔“
 ”ہانڈر ڈیش۔“
 ”ہنن سیس۔“

رومی ٹوپی والے نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا
 تھا تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا
 ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔“
 جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا۔ ”ٹینک اتاری۔“ ”ہم جنس کے متوالے
 نہیں۔ ہم جنس کی دلیل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دور حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ
 اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے
 آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔“

”حالات حاضرہ۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”تمہارے نزدیک حالات حاضرہ رومی
 کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے۔ سلف کا۔۔۔۔۔ میں“ کا۔“
 ”رومی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو۔“ بہن چلائی۔ ”جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں۔ جہاں بیٹھ

”بڑے میاں سلام۔“ جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔ ”ماضی پرستی کا دور
 ختم ہوا۔ نصرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔“
 گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔
 ”الحق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ
 جدید۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔“
 ”یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔“ مشدی لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”کہ دور ایک
 گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا۔“
 جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی۔ ”ان کباڑ خانوں والوں کی باتیں نہ سنو۔ یہ بے چارے کیا
 جانیں جدیدیت کو۔“

”جدیدیت کے دیوانے۔ آج تیری پتلون کے پانچے کھلے ہیں۔ کل تنگ ہو جائیں گے۔
 پرسوں پھر کھل جائیں گے۔ یہی ہے نا تیری جدیدیت۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔
 ”ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو۔“ لنگی والا بولا۔ نیلی پتلون پر سرخ ٹلی لگی ہوئی ہے۔۔۔۔۔
 بابا۔ بابا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”الحق۔ یہ ٹلی نہیں۔ سچ ہے سچ۔ سچ فیشن ہے۔ کچھ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دینی
 ہوتی ہے۔ تجھے کچھ پتا بھی ہو۔“
 ”پیوند کبھی غمت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے
 کوڑی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔“ مشدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ ”تم عجیب
 تماشا ہو۔“

رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”دور جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو۔ پیوند کو فیشن بنا
 بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔۔۔۔۔“

”سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔“ بہن نے سراٹھا کر کہا۔

”ہائیں۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ پتلون والی نے پوچھا۔

”کوسی تھرو ڈیر لب گنگنائی۔“ چھٹی بی بولی۔

”ہاں۔“ یہی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔“

”تعفن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کون سا۔“ بیدنگ کاسٹیوم والی بولی۔ ساڑھی والی

نے ناک چڑھائی۔

یہی نے قہقہہ لگایا۔ ”جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بت

جاتے ہیں، وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے، پہن لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔“

”اؤ نہوں انہیں کچھ نہ کہو۔ یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکا۔“ رومی ٹوپی والا بولا۔

”کل جب روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا، پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا۔ بتاؤ۔“ بہن بولی۔

”یہ تو حرکت کے متوالے ہیں، منزل کے نہیں، انہیں صرف چلنے کا شوق ہے، پہنچنے کا نہیں۔“ شمدی لنگی والے نے منہ بتایا۔

”کو نہیں۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا، اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔“

یہی قہقہہ مار کر ہنس۔ ”سو واٹ۔۔۔ ہم سپروں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ۔ بے شک لگاؤ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادی کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے۔ ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔“

”صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے۔“ بہن نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو اپنے جسم کے بیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی والی اپنا پلو سنبھال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چہرہ رہا ہوا تھا۔ ”کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔“

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا۔ ”خود کو زندگی کے متوالے گردانے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سارے کے بغیر چل نہیں سکتے۔ زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مگر۔ زندگی حال ہے۔۔۔۔۔ کسی صاحب حال سے پوچھو۔“

”جو قیل و قال کے دیوانے ہیں، انہیں حال کا کیا پتہ؟“ لنگی والا بولا۔

”انہیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری۔۔۔ ”میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“ بچے کو انگلی لگائے کھڑی

ماں گنگنا رہی تھی۔ ”یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“

”عورت کا نہیں بی بی۔“ پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔ ”یہ تو لڑکی کا دور ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ عورت کے کتے ہیں۔ بال سفید ہو جاتے ہیں، پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔“

”خاموش۔“ آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی۔ ”سنو سنو۔ یہ کیسی آواز ہے؟“

”کون سی آواز؟“

”کدھر ہے آواز؟“

”چپ“ موٹر سائیکل والا چلایا۔ ”یہ تو ٹیلی فون کی کھنٹی بج رہی ہے۔“

”یہ آواز تو باہر سے آرہی ہے۔“ منی سکرٹ والی نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

”سے اللہ۔“ سی تھرو بولی۔ ”یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آرہی ہے۔ وہ جو باہر پور نیگو میں ہے۔“

”خاموش۔“ شکاری ڈانٹ کر بولا۔ ”سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔۔۔۔۔ وہ آرہا ہے۔“

”کون آرہا ہے؟“ سی تھرو نے زیر لب پوچھا۔

”چوکیدار۔“

”چوکیدار۔“ پتلیاں سسم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اونچا لمبا، لمبی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سونے لٹا اٹھائے ہوئے کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

”بالکل اجڈ نظر آتا ہے۔“ پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

”جھکی، کروڑ، ان کو تھ۔“ ٹوکرا بالوں والی دانت بکھینچ کر بولی۔

”میرے بدن پر تو رو تکتے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔“ سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونے لٹا ہاتھ پر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا چوٹا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ بل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

”ضرور کوئی ایمر جنسی ہے۔“ شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنس۔ ”ایمر جنسی۔۔۔۔۔ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمر جنسی ہے۔“

”پاکل ہیں یہ ماضی کے دیوانے۔“ جیکٹ والے نے ٹیک اتار کر صاف کی۔ ”اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔“

”بالکل بالکل۔“ بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”بچے کم خوش حال گھراں۔“ موٹر سائیکل گنٹا نے لگا۔

”بھلا اللہ۔“ مشدی لنگی والا بولا۔ ”موشل ازم کے نام لیا سربایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔“

”بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں۔ قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل جیل ہوگی، بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدہم پڑ جائے۔ شاید ختم ہو جائے۔“ رومی ٹوٹی نے کہا۔

”مین پاور کی عظمت کو ملنے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔“ جنھوں
نما قہر مار کر مینے لگا۔

”پتلیاں ایک دو سرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔“

”کیا کہہ رہا ہے یہ؟“

ويكافؤ نوراً! ————

”ہجے۔ چلڈرن آراے نوے منس۔“

”سیانوں نے کہا تھا“ کرتاپا جامہ کہنے لگا۔ ”کہ.....“

”کون سیانے؟“ جیکٹ والے نے پوچھا۔

”ہمارے لگتے لوگ۔“ کرتا پا جامہ نے وضاحت کی کوشش کی۔

”تم اپنے کلتوں کی بات کر رہے ہو۔“ لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ ”انہیں مجھ میں نہیں

آئے گی۔ ان کے لگتے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی ت؟ ہدیب کے دیوانے ہیں۔“

”وہ دن دور نہیں۔“ اچکن والے نے کہا۔ ”جب انہیں اپنے گتوں کو اپنا پڑے گا۔“

”بھول جاؤ وہ دن۔“ جیکٹ والا جلال میں بولا۔ ”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“

”ہم تری کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔“

”موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔ ”کیوں ڈارنگ؟“

”فارگٹ ویٹ ڈے۔ اسٹول نیور کم۔“ لٹکے بالوں والی نے بابل جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کٹھ کباڑ سے ایک پتلا ٹھہ بیٹھا۔ اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر گلاب

تھا۔ ”کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”اچھا بدل رہا ہے کیا۔“ شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتے ہنسنے لگے۔

”دنیا کے سارے مذہب، سارے نجومی، سارے سیرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔“

چغے والا چلایا۔

”یہی سائی، مسلمان، یہودی، ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرا لوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔“ رومی

نوپی نے کہا۔

”وہ گولڈن ایج۔“ چنے والے نے انکی اٹھا کر کہا۔ ”جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ

کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہو گا۔ الطینتان کا دور دورہ ہو گا۔“

موٹر سائیکل نے طنز بھر قبضہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا۔ ”نیمعت الاعتقادی نہیں‘ خوش فہمی ہے یہ۔“

”اچھا“ میں بولی۔ ”کیسا گولڈن ایج ہو گا وہ؟“

”نشاة ثانیہ۔“ چغے والا چلا کر یولا۔

”نشأۃ ثانیہ۔“ ہل کی دیواریں گونجنے لگیں۔

”دنیا پر مہلک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔“

چغے والا بولا۔

”اس کے اثرات 1980ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔“

ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ ”سچ؟“

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا۔

خاموش لٹکے بالوں والی چٹائی۔ ”وہ دیکھو۔۔۔۔۔ وہ۔“ اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ

کیا۔ سب انگلی کی سیدھ میں پور ٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا؟“ دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”کون ہے؟“

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگی۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائیلینسر فٹ کر کے کہا۔ ”وہ آرہے ہیں۔ خاموش۔“ اس نے دور کھڑے چٹلون کو خبردار کیا۔ ”وہ آرہے ہیں۔ لوہر آرہے ہیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ لٹکے بالوں والی بولی۔ ”انتظامیہ کے لوگ آرہے ہیں۔“

”بالکل۔“ ساڑھی والی نے کہا۔ ”وہ ضرور اندر آئیں گے۔“

جینٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تھکانہ لہجے میں بولا۔ ”سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یقیناً کوئی ایمر جنسی ہے۔“ موٹر سائیکل والا بولا۔ ”ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا.....“

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لئے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

بال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ”دیکھو اس وقت تین بجے ہیں۔“ ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں، ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہئے۔ سمجھے۔“ ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یس سر۔“ نائب نے جواب دیا۔ ”اٹ شیل بی ڈن۔“

”ہوں۔“ ناظم نے کہا۔ ”ہمارے پرائم منسٹر کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہو گا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا مظہر ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔“ نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو، جتنے اتنے تھوڑے وقت میں اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گزارہ کرنا ہو گا۔“

”جی صاحب۔“ کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے

طمطراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پسندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپیٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے ا۔ ستاؤ تھا۔

ساڑھی والی لمبا چنڈ لٹکائے نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سی تھرو چھینٹ کا ٹھکرا اپنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے۔ صائم، اس کی دو نوجوان بیٹیاں سلمیٰ، ستارہ، ایک بیٹا سمیع، ہو اسماء اور صائم کی بیوی عینہ۔

عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی۔

اے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سوچتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ سوچتی رہی حتیٰ کہ بیمار پڑ گئی۔
ڈاکٹر نے ٹونیاں لگا کر اسے دیکھا۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں۔ عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک پھول ہوتے ہیں۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے ارد گرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا۔ اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید دور کی آمدنی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ جہاں باضی ابھی تک حال کا ہروپ و حارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بیٹے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا۔ جہاں ابھی تک انیسویں صدی چل رہی تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے لئے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک دقیانوسی مقام تھا۔ اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حوطہ کر رکھا ہے۔ اور اس حوطہ شدہ گھر نے آسہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے۔ صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسہ اور صائم نے سال با سال اکٹھے مل کر دکھ سے تھے۔ اکٹھے مل کر دکھ سہنا کر تعلق پیدا کر دیتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد و پیش ایلین نہ تھا۔ جب آسہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے۔ جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا۔ مفہوم تھا۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرائی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے رات دن کام کرنا پڑا تھا وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا۔ اس لئے مالک اور مالکن کو کھانا کھلانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑا تھا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں بھنڈی کچی تو آسہ بھنڈیوں سے اتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی۔ جب وہاں کرلیے پکتے تو کرلیوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا۔ نوکرائی کے بیٹے کے لئے بور کرلیے تھا۔ ٹوپیاں بھنڈیاں تھیں۔ چھلکے سبزیاں تھیں۔

مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرائی کو انہیں کھانا کھلانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا

کھلا کر جب وہ آؤت ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سوچا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی۔ چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔

بیٹا کھاتا تو لیتا تھا مگر جاگتا نہ تھا۔ اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیشن اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باورچی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لئے آسہ کو نکال دیا گیا اور ماں بیٹا آزاد ہو گئے۔

آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا۔ الاؤنس بہت قلیل تھا۔ ضروریات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑتی۔ انہوں نے مل کر چار پائیاں بنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ کانڈ کے پھول بنائے۔ پتنگ بنائے۔ دھاگا خرید کر اس پر مائجھا لگایا تاکہ ڈور بیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے۔ آسہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خرید لے اور اکیلی سلائی کا کام کرے لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پھر کسی غیرے قرض کے طور پر پرانی کھسی پٹی سلائی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسہ ہر فن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانگ دیا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی۔ انوکھی چیزیں بنایا کرتی لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی۔ قیمت نہ تھی۔

ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق۔ مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق۔ دکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے۔ محنت اور مشقت بھرنی زندگی بسر کرتے تو یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا لیکن علم قینی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پرزے اڑا دیے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پرزے اڑا دیے وہ علم دوست نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں۔ میں تو صغیرہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رخ ہوتا ہے۔

آسہ کے دور میں ایمان لانا تھا۔ صائم کے دور میں شک کرنا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رخ ہمیشہ

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں سمجھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساس گناہ سے بھگی بیٹھی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا۔ پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ کس سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھگی جاتی۔ اس کی آواز زیر لبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پر ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے اور اکی نکلتے بیان کرنے کا علوی تھا جو دوسروں کو چونکا دیتے۔

محفلوں کی بات چھوڑیے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر ماں سے کہہ دیا تھا۔ ”ماں جب تم مرو گی تو میں دیکھیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا پاننوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یا اللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقع عطا کیا۔ اور ماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پر کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔“

آہستہ آہستہ 95 سال تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت رحمت بن جاتی ہے۔

صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا۔ خود اس کے اپنے ارد گرد ایلین قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی بیٹیاں سہلی اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں ماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

ماں کے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ ماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔ لیکن سہلی ستارہ کے ایلین بننے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے بچے اس سے کٹ نہ جائیں، وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تاکہ پیچھے نہ رہ جائے۔..... پھر بھی وہ پیچھے رہ گیا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ نئے فکر سے ناواقفیت کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے،

گر گٹ کی طرح بدلتا رہا ہے۔ صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا، جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں، توں توں مضحکہ خیز ہو گیا۔ تعلقات کٹنے لگے۔

صائم کو آہستہ آہستہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ ماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر کیوں رضامند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ ماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا۔ ماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ ماں نے اندھی و فاشعاری کو کیوں اپنائے رکھا۔ شاید ماں غم خور ہو۔ شاید ماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم ماں تسکین پسند نظر آنے لگی۔ دکھی ماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے لگی۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹا گیا۔ مزدوری کا تعلق بڑھتا گیا۔ ایذا پسند کے لئے محنت جدوجہد نہیں ہوتا۔ دکھ دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی تسکین ہوتی ہے۔ بطح کے لئے جو ہڑ ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا۔ اس برائے نام تعلق کو ہم رسمی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً ”صائم آٹھ روز سے ماں کی پالٹنی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے ماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی جنبش نہ ہوئی دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ”شاید.....“ اس نے پھر غور سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ امید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید نے آنکھوں میں دیا روشن کر دیا ہو۔

چونکہ ماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ ماں کا دل کہاں ہو گا۔ پھر وہ اس مقام کو ٹھنکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں۔

وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔ پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا۔ بے چاری اس عذاب سے مخلص پائی۔

منزل نہیں۔ منزل کیسی۔۔۔۔۔ ان کے جذبے کا تو کوئی رخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی۔
ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا؟
سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

مثلاً "سلی کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہو۔ اگر وہ اداکار ہو تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا۔ فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹو گرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چست ہو جاتے۔

ستارہ کوئی وی سیریز اس لئے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل و صورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلی سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دلنشین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ۔۔۔۔۔! سلی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بد شکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لئے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سر میں اس کا ذکر رہتا ہے۔ اور فلاں فلاں مضمون اس لئے برا ہے کہ اس میں دیکھو تو سی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقاً "صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلی کھڑی تھی۔ بال ٹنگ رہے تھے چہرے ستا ہوا تھا۔ سرد دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ آسہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سلی حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔
گھر کے سارے افراد حزن و ملال سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن و ملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔

اس لئے نہیں کہ ماں یا دادی ماں مر رہی تھی۔
بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی۔ چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ سارا گھر موت سے یوں لالاب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جلنے میں گھر کا ہر فرد آرزو مند تھا کہ بوجھ اٹھائے۔ بوجھل یورڈم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی ماں پر کچھ بیت جائے۔

سلی نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی ماں کا کیا حال ہے؟
صائم نے مایوسی میں سر ہلادیا۔

سلی کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا۔ بال ٹنگنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں امید کی کرن ناپنے لگی۔

سلی ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اسے آسہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی چیت سیلی شانی کے بیاہ کو آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے شانی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔

وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے، لیکن اس کے ملتان جانے میں رخصت نہ پڑے۔ اور اگر ماں یونہی پڑی رہی تو وہ ملتان نہ جاسکے گی۔

پہلے ہی ماں کی بیماری کی وجہ سے سلی کی ساری روئین تباہ ہو چکی تھی۔ مثلاً "فون ہی لیجئے۔ فون برآمدے میں لگا ہوا تھا جو ماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ ماں کی وجہ سے سلی فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو علوی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔
ان کالوں میں زیادہ تر رانگ نمبر ہوتے تھے۔ وہ ان رانگ نمبروں کو بڑے فخر سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے مذاق اڑا دیتی۔

خاص سیلیوں کے علاوہ سلی کو کسی خاص رائٹ یا رانگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رانگ نمبر کو کالنے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ واٹ فون..... اظہار نگاہ کے جواب میں اظہار بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

ماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر مٹھنوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔
فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بولتی رہتی۔ "اچھا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔

بور۔۔۔۔۔ موڈ نہیں۔ وہ کیسے۔" ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی۔ چھوٹی ہنسی۔ لمبی ہنسی۔ مہذب ہنسی۔ جس میں ہنسی نہ ہوتی، البتہ آواز کے زیر و بم میں جاذبیت ضرور ہوتی۔

سلی کے لئے ماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روزمرہ بحال ہو جائے۔

ستارہ کو بھی ماں سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی۔
ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر جو بوجھ پڑا ہوا تھا، وہ اس کی پڑھائی میں نخل ہو رہا تھا۔ اسے قدر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن نہ ہتھیالے۔

رابعہ وہ بد صورت بھدی لڑکی تھی جو رانا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چزلی کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی۔ کہیں وہ چزلی میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی

ایک فکر نگاہ رہتا تھا۔ ہے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے کب جان چھٹے گی۔ اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔ ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔

”اب کیا حال ہے؟“ صائم کی بیوی سیکھ سمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔ صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سمینہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ حزن و ملال سے غور رہی تھی۔

سمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ سمینہ ایک مذہبی عورت تھی۔ مذہب اس کے لئے صرف خوف خدا تھا۔ وہ بے چاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود اسی گھر میں ہوئی تھی۔ وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔

اگرچہ آسیہ اور سمینہ کے مابین ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ تو ازل سے حکم بجالانا جانتی تھی۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے بیٹے کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ کیسے ہوتی۔ خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا۔ ”اماں تم نہیں سمجھتیں.....“ بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا۔

آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گہر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی۔ اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی۔ نوئی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی۔ پردے رنگ کرنے بنا دیتی۔ نوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر نئی کوزیاں بناتی۔ رضائی کے ابرے تیار کرتی۔ میز پوش کے ٹکٹے کے غلاف اور کیا کیا۔ آسیہ کی اس عداوت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا۔ اسی واسطے سمینہ اسے عزیز رکھتی تھی۔ کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں۔ یہ تو مفاد ہے۔ بہر طور سمینہ کا حزن و ملال دلی تھا کیونکہ وہ خدا ترس عورت تھی۔

”کیوں اب۔“ سمینہ نے داخل ہو کر پوچھا۔ ”کیا حال ہے اماں کا؟“

”ویسا ہی ہے۔“ صائم نے کہا۔

”اوہ.....!“ سمینہ خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔

”اماں کو ضرور دوا کھانی چاہئے۔“ سمینہ بولا۔

”ہاں۔“ صائم نے کہا۔ ”لیکن اماں مانے بھی۔“

”ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لئے کچھ نہیں کر رہے۔“ سمینہ نے کہا۔

”ایک فیلنگ آف گھٹ ہے۔“ سمینہ گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

سمینہ ازلے طور پر مشنری کارکن تھا۔ اس کے لئے دفتر و دفتر نہ تھا بلکہ مقصد حیات تھا۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پر محیط ہو چکا تھا۔ باقی تمام رشتے اور تعلق لگاؤ سمٹ کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوور لوڈڈ بس میں مسافر یا یہ ان پر لٹکے ہوتے ہیں۔

”اوہ۔“ سمینہ چونکا۔ ”مجھے تو جانا ہے۔ دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہو گا۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر کو لے آؤں؟“ اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر لے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا۔ سینس آف گھٹ دور ہو جائے گا۔

”اماں سے پوچھ لو۔“ صائم نے کہا۔

”اماں۔ اماں جی۔“ سمینہ نے آواز دی۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر سمینہ گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اماں کے منہ سے رضائی اتار دی۔

”اوہ.....!“ وہ زیر لب چلایا۔ ”اماں تو..... اماں تو.....“

”کیا کہا۔“ کئی ایک چھین گونجیں۔

”اماں گزر گئیں کیا؟“

”ہائے اللہ..... اماں چلی گئیں۔!“

بڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں۔ ”نہیں۔ چیخیں نہیں۔ وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔“

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے۔ جیسے یہ کہانی صائم کی ماں کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے۔ شاید تمہاری ماں کی ہو۔ ہم سب کی ماؤں کی ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے۔ اور اس کے ارد گرد ا۔ لیسز یوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے جلی کے ارد گرد ناچتے ہیں۔

سمجھتا ہے کہ یہ لگاؤ نہیں لاگ ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ لاگ کا ایک روپ ہے۔ ڈھکا چھپا شدت سے بھرا لگاؤ۔

وقار محل صدیوں سے وہاں کھڑا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا، اسے وہیں کھڑے دیکھا تھا۔

پہلے تو لوگ وقار محل پر فخر کیا کرتے تھے، پھر بنی بود نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ پھر کسی سنبھلے نے بات اڑادی کہ محل کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ چتھیں بیٹھ رہی ہیں۔ وہ نیو کالونی کے لئے خطرہ ہے۔ اس پر کمیٹی والے آ گئے۔ انہوں نے چاروں طرف سے محل کی ناکہ بندی کر دی۔ اور جگہ جگہ یوڈ لگا دیئے۔ ”خبردار۔۔۔۔۔ دور رہئے۔ عمارت گرنے کا خطرہ ہے۔“ پھر بیسیوں مزدور کدال پکڑے آپنچے اور محل چھتوں اور دیواروں کو توڑ توڑ کر گرانے لگے۔

پتہ نہیں بات کیا ہے کہ سالہا سال سے اتنے سارے لوگ کدال چلا رہے ہیں۔ اسے توڑنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی محل کا کچھ نہیں بگڑا۔ وہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس معالجے سے بنا ہے کہ اسے منہدم کرنا آسان نہیں۔

بہر حال۔ سارا دن مزدور کدال چلاتے رہتے ہیں۔ نیوکلونی میں ’اوازیں‘ گونجتی رہتی ہیں۔
ٹھکا ٹھک ٹھک، ٹھکا ٹھک ٹھک۔

یہ ٹھک ٹھک جنفی کی رانوں میں گونجتی ہے۔ اس کی لرزش سے کوئی پوشیدہ سپرنگ کھلتا ہے۔ کوئی پراسرار گھڑی چلنے لگتی ہے۔ اس کی ٹک ٹک دل میں پہنچتی ہے۔ دل میں لگا ہوا اس پہلی فاز اسے سارے جسم میں اچھال دیتا ہے۔ ایک بھونچال آ جاتا ہے۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگتا ہے۔ ہونٹ لس کی آرزو سے بو جھل ہو کر ٹک جاتے ہیں۔ نسیں تن جاتی ہیں اور سارا جسم یوں بجھنے لگتا ہے جیسے سارنگی ہو۔

اس پر بھی دیوانہ وار کھڑکی کی طرف بھاگتی ہے اور وقار محل کی طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے اس سے پوچھ رہی ہو، اب میں کیا کروں؟

والدین نے جنتی کا نام یاسمین رکھا تھا۔ بچپن میں سب اسے یاسمین کہتے تھے پھر جب وہ بانی سکول میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ یاسمین دقانونی نام ہے۔ اس سے پرانے نام کی بو آتی ہے۔ یہ نام بھی تو۔ ملو ٹپو۔ ڈھیلا ڈھیلا جیسے چولیس ڈھیلی ہوں۔ لہذا اس نے یاسمین کی چولیس ٹھونک کر اسے جس من کر دیا۔ پھر جب وہ کالج میں پہنچی تو اسے پھر سے اپنے نام پر غصہ

وقار محل کاسایہ

وقار محل کی چھتیس گر چکی ہیں لیکن دیواریں جوں کی توں کھڑی ہیں۔ جنہیں توڑنے کے لئے بیسیوں جوان مزدور کئی ایک سال سے کدال چلانے میں مصروف ہیں۔

وقار محل نیو کالونی کے مرکز میں واقع ہے نیو کالونی کے کسی حصے سے دیکھئے۔ کھڑکی سے سر نکالئے۔ روشن دان سے جھانکیئے۔ نیرس سے نظر دوڑائیئے۔ ہر صورت میں وقار محل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مضبوط، ویران، بوجھل، رعب دار، ڈراؤنا سر بلند، کھوکھلا، عظیم۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نوجوانی آسیب زدہ ہو اور وقار محل آسیب ہو۔
نوجوان دیکھتے ہیں تو دلوں میں غصہ ابھرتا ہے۔ نوجوانی کے چہرے کا پھوڑا۔ رستی ہستی
کالونی میں آثارِ قدیمہ۔ چہرے نفرت سے بگڑ جاتے ہیں۔ ہٹاؤ اسے۔ لیکن وہ محل سے اپنی نگاہیں
مٹا نہیں سکتے۔

بچہ دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ”ڈیڈی! یہ کیسی پلنگ ہے؟ بھدی“ بچے
 ذہب، موٹی موٹی دیواریں، اونچی اونچی چستیں، تنگ کھڑکیاں اور ڈیڈی کیا نوہ کی بنی ہوئی
 ہے۔ اتنے سارے مزدوروں ہے بھی نہیں ٹوٹ رہی۔“

بڑے بوڑھے محل کی طرف دیکھتے ہیں تو ——— لیکن بڑے بوڑھے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو رہتے ہی محل میں ہیں چوری چھپے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی پر بھید کھل نہ جائے۔

کاش کے لڑکے جو اس کھوکھلے محل کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے ہیں، وقار محل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب تو خالی دیواریں رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کی بات اور ہے۔ لیکن ان کے دلوں سے آواز ابھرتی ہے اور وہ تائیاں پیٹنے لگتے ہیں۔ قمقمے لگانے لگتے ہیں تاکہ وہ آواز ان میں دب کر رہ جائے۔ بہر حال نیو کالونی کا ہر نوجوان وقار محل سے ایک پراسرار لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ وہ

آنے لگا۔ لو میں کیا پھول ہوں کہ جس من کلاؤں۔ میں کیا آرائش کی چیز ہوں۔ میں تو ایک ماڈرن گرل ہوں اور ماڈرن گرل پھول نہیں ہوتی، آرائش نہیں ہوتی، خوشبو نہیں ہوتی۔ یہ سب تو دقانونی چیزیں ہیں۔ ماڈرن گرل تو ایکٹو ہوتی ہے، سمارٹ ہوتی ہے۔ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی۔ جس پر زندگی بیتی نہیں بلکہ جو خود زندگی بیتی ہے۔ لہذا اس نے اپنا نام جس من سے جنی کر لیا۔ جنی، فٹ، فٹافٹ فوراً۔ یہ نام کتنا فعال تھا۔ کتنا سمارٹ۔ اس میں زندگی کی تڑپ تھی۔ پھر اس نام کے زیر اثر جلد ہی اس میں یہ خواہش ابھری کہ کچھ ہو جائے۔ ابھی ہو جائے۔ ابھی ہو جائے فوراً تو ابتدا تھی۔ بالآخر جنی چاہنے لگی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو ہونے سے رہ جائے۔

لیکن اس روز جب کہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہو گیا تھا۔ یہاں تک ہو گیا تھا جس کی اسے توقع نہ تھی۔ لیکن وہ خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ انا وہ تو ہاتھ بل رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ پتہ نہیں اس روز جنی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پر غم تھیں۔ وہ حسرت آلودہ نگاہوں سے وقار محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا بی چاہتا تھا کہ دوڑ کر وقار محل میں جا پناہ لے۔ اس روز جیسے جنی پھر سے یاسمین بن گئی تھی۔

اگرچہ شعوری طور پر جنی کو وقار محل سے سخت چڑ تھی اور وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں وقار محل اس کے بنیادی جذبات پر مسلط تھا۔ ان جانے میں وہ اس کی زندگی پر یوں سایہ کئے ہوئے تھا جیسے بڑا بوڑھا درخت کسی گلاب کی بھاڑی پر سایہ کئے ہوئے ہو۔

جنی وقار محل کے زیر سایہ پیدا ہوئی تھی۔ وہیں کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی کوٹھی اور گرین وقار محل کے عقب میں تھی۔ اس کی تمام کھڑکیاں محل کی طرف کھلتی تھیں۔ دونوں میزبیں ادھر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بچپن میں جب وہ یاسمین تھی تو وقار محل اس کے لئے جذب نظر اور قابل فخر چیز تھی۔ پھر جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی، وقار محل اسے بوسیدہ عمارت نظر آنے لگی جو نیو کالونی کے راستے کی رکاوٹ تھی۔ اس کے دل میں یہ گلن بڑھتا گیا کہ وقار محل نوجوانوں کی آزادی کچلنے کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گرتے ہوئے وقار محل کا سایہ اس کے دل کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے ہر اہم واقعے میں وقار محل کا حصہ تھا۔

مثلاً جب اس میں جوانی کی اولیں بیداری جاگی تھی تو گرتے ہوئے وقار محل کی ٹھک ٹھک نے ہی تو اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی جس من تھی، جنی نہیں بنی تھی۔ اگرچہ اس کی باقی عفت مدت سے عفت سے اف اور پھر اف سے افی بن چکی تھی، چونکہ اف بٹ کا امکان خارج ہو چکا تھا۔

ان دنوں باقی سارا سارا دن اپنے بیڈ پر اوندھے منہ پڑی رہتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ افی باقی تو بیڈ پر ڈھیر ہونے والی نہ تھی۔ اس کی تو بونی بونی تھرتھرتھی۔ ابھی یہاں کھڑی ہے۔ ابھی باغیچے میں جا پٹنی۔ لو وہ نیرس پر نسل رہی ہے۔ بائیں وہ تو چل بھی گئی۔ کسی گٹ ٹو گیدر میں۔ کسی فنکشن میں۔ کسی پارٹی میں۔ ایک جگہ ملک کر بیٹھا افی باقی کا شیوہ نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں، ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا کہ پلنگ پر گھڑی بن کر پڑی رہتی تھی۔ جس من سمجھتی تھی کہ افی باقی میں واسکوڈے گاما کی روح ہے۔ اسے خبر نہ تھی کہ واسکوڈی گاما نے امریکہ دریافت کر لی ہے اور اب تھک ہار کر پڑ گئی ہے۔

ان دنوں می بار بار افی کے بیڈ کے دروازے سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور حیرت سے باقی کی طرف دیکھتی رہتی۔ وہ باقی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ پوچھنا الگ رہا، می تو باقی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیسے کرتی بات، بات کرتی تو باقی تنگ کر گیتی۔ ”می ڈارلنگ۔ آپ نہیں سمجھتیں۔ آپ نہ بولیں۔“ واقعی می نہیں سمجھتی تھی۔ کیسے سمجھتی وہ تو بے چاری سیدھی سادی امی تھی۔ نئے حالات نے زبردستی می بنا دیا تھا۔

جب فاطمہ بیگم کی شادی محمد عثمان سے ہوئی تھی تو وہ اسٹنٹ تھے، پھر حالات نے سرعت سے پلٹا کھایا اور وہ میمنجر ہو گئے اور اب جنرل میمنجر تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ محمد عثمان سے ایم اوٹمن ہو گئے تھے۔ لیکن فاطمہ بیگم ہی رہی تھی۔ وہ فاطمہ زیادہ تھی اور بیگم کم کم۔ تعلیم سرسری تھی۔ سوشل سٹینڈس کی بھاری بھر کم گھڑی سر پر آ پڑی۔ پھر بھی جوں توں کر کے اس نے رہن سہن میں تبدیلی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی شخصیت کو بیگم کا رنگ نہ دے سکی تھی۔

اس پر ایم اوٹمن اگر بیگم سے مایوس ہو گئے تھے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر جو امنوں نے گھر سے ناپ توڑ لیا اور کلب میں وقت بسر کرنے لگے تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ کلب میں بہت سی بیگمات آتی تھیں۔ جن پر چوکھا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم گھر میں یوں کونے سے لگ گئی جیسے نیو کالونی کا رائس کرو سو ہو۔ پھر لڑکیاں جوان ہوئیں تو امنوں نے اسے بالکل ہی بے زبان کر دیا۔

لڑکیوں نے زبردستی اسے می بنا لیا۔ می کے لفظ سے فاطمہ کو بڑی چڑ تھی۔ کتنا ننگا لفظ

پہلی مرتبہ تو اس ہائی نے وقار محل سے سر نکالا تھا۔ پھر وہ جگہ جگہ سے سر نکالنے لگی۔ جب وہ کالج بس میں سوار ہوتی تو وہ بس سٹینڈ سے سر نکالتی۔ جب جس من کالج کی گراؤنڈ میں ٹھہر لگاتی تو پروردہ دیوار سے جھانکتی۔ جب وہ مارکیٹ جاتی تو وہ اس کا پیچھا کرتی۔

ہاں صورت حال بہت ہی خراب ہوئی جارہی تھی۔ پھر اس کے اپنے جسم نے بغاوت کر دی۔

ان دنوں وقار محل میں مزدوروں نے دیواریں توڑنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ ان کی ٹھک ٹھک ساری نیو کالونی میں گونجتی رہتی تھی۔

ایک دن جب جس من کی طبیعت ناساز تھی اور وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اس ہائی کے متعلق سوچ رہی تھی تو دفعتاً وہ حلوہ عمل میں آگیا۔

ساری شرات مزدوروں کی اس ٹھک ٹھک کی تھی۔ روز تو وہ ٹھک ٹھک جس من کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی، اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ٹھک ٹھک سیدھی جس من کی رالوں سے آ ٹکرائی۔ اور اس کے جسم میں گونجنے لگی۔

جس من کے جسم میں ایک عجیب سی لرزش جاگی۔ کسی پوشیدہ سپرنگ میں حرکت ہوئی۔ ایک تناؤ سا اٹھا اس نے دل پر دباؤ ڈالا۔ دل کے اعلیٰ فائر نے اسے اچھالا۔ سارے جسم میں ایک بھونچال سا آگیا۔ نیس تن گئیں۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگا۔ ہونٹ لس کی آرزو سے بے حال ہو کر لٹک گئے۔ سارا جسم سارنگی کی طرح بجنے لگا۔

اس لمحے میں اسے سب پہ چل گیا۔ سب کچھ کہ باقی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی کہ وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی کہ بچہ کہاں تھا۔ سب کچھ۔ اس روز وہ جس من سے جنی بن گئی تھی۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی۔ ابھی اسی وقت۔ فائنل۔ جلدی کچھ ہو جائے اور واقعی کچھ ہو گیا۔

اسی رات جنی کے بیڈ روم کا وہ دروازہ آہستہ سے کھلا جو کوٹھی کے احاطے میں کھلتا تھا اور زیر لبی آواز آئی..... ”ہائی۔“

جنی تڑپ کر مڑی۔

دو لنگی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔
اگلے روز گینے لنگی ہوئی مونچھوں میں بڑے سفید دانت نکالے۔ چند ہیائی ہوئی مگر چڑھ
جانے والی سرخ چیونٹیوں جیسی آنکھیں لئے سر پر کالے بالوں کا ٹوکرا اٹھائے صدر دروازے کے
راستے سے ایور گرین میں داخل ہوا۔

رہتی تھی۔ اس کا باپ وقار محل کا چوکیدار تھا اور اب محل کے بلے کی روٹی باندی کیا کرتا تھا۔ ماں مرچکی تھی۔ صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ سارا دن ماہ رو اتنی گوری تھی۔ اتنی گوری تھی کہ ہر راہرو اسے دیکھ کر رک جاتا۔ جب وہ محسوس کرتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا چہرہ اس قدر گلابی ہو جاتا۔ جیسے کسی نے رنگ کی پچکاری چلا دی ہو۔ پتہ نہیں، حیا اس قدر گلابی کیوں ہوتی ہے۔ جس من نے کئی مرتبہ ماہ رو کو شرماتے دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی حیا کے غارے کو اپنالے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماہ رو کی طرح غنوار نہ تھی۔ اور ماڈرن گرل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شراب کر منہ موڑ لے۔ لہذا اسے تو ہائی کے جواب میں ہائی کہنا چاہیے۔

جب پہلی مرتبہ ہائی جس من کے سامنے آئی تو اس نے بڑی جرات سے کام لیا اور شرما کر منہ مٹکوا دیا۔ لیکن اس میں اتنی جرات پیدا نہ ہو سکی کہ جواب میں ہائی کہتی۔

دراصل جس من بڑی مخلص، سچی اور شرمیلی لڑکی تھی۔ جس طرح ساری ماڈرن گرلز ہوتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے دل میں کئی ایک خوش فہمیاں رچی بسی ہوئی تھیں۔ جس طرح ماڈرن گرلز کے دلوں میں خوش فہمی رچی بسی ہوتی ہیں۔ شد "اے کچھ پتہ نہ تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اسے سب پتہ ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل کو سب پتہ ہونا چاہئے۔ چاہنے اور ہے میں جو فرق ہے اسے اس کا احساس نہ تھا۔ شعور نہ تھا۔

اس کا دل بہت سے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل پر لازم ہے کہ وہ آزاد ہو۔ حضوں سے آزاد۔ لگو سے آزاد۔ رکی قید و بند سے آزاد۔

اگرچہ ذہنی طور پر اسے رجعت پسندوں کے خلاف زبردست چڑ بھی جیسے کہ ماڈرن گرل کو ہونی چاہئے لیکن دلی طور پر اسے اپنے ماں باپ سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ اسے اس کا شعور نہ تھا۔ شعور کیسے ہوتا۔ جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ شعور ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی توجہ کسی دوسری بات پر مبذول کر دیتی۔ چونکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ اس کے برآو کی کوئی تفصیل ایسی بھی ہے جو ماڈرن گرل کے شایان شان نہیں۔

ان دنوں اسے بھی فکر و امن گیر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو ماڈرن گرل کی شان کے متافی ہو۔ اس ہائی نے اسے خاصا درہم برہم کر دیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ درہم برہم ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات ماڈرن گرل کو بھلا کیسے درہم برہم کر سکتی ہے۔ لہذا وہ درہم برہم نہیں تھی، بالکل نہیں تھی۔

جب گینی پیدا ہوا تو وہ لڑکا تھا۔ اس کی پیدائش پر ماں باپ نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام غنی رکھا تھا۔ لیکن جب وہ نوجوانی اور دور جدید میں داخل ہوا تو بہت سے تبدیلیاں عمل میں آ گئیں۔ بال بڑھ کر نوکرا بن گئے۔ مونچھیں لٹک گئیں۔ منہ پر پاؤڈر سرنخی کی تہہ چڑھ گئی۔ رنگ دار قمیض، چمکیلی صدیریاں، منکوں کی ملائیں اور جانے کیا کیا۔ یوں وہ غنی سے گینی بن گیا تھا۔

ایور گرین میں گینی کی آمد سے کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ پہلے ہی اس سلسلے میں افنی نے بڑی کارکردگی دکھائی تھی۔ اس کے بوائے فریڈز ایور گرین میں اکثر آیا کرتے تھے اور وہ بڑے شوق سے ان کا ڈیڈی سے تعارف کراتی تھی۔ می سے نہیں چونکہ می ڈارلنگ تو سمجھتی نہیں تھی۔ اور اسے سمجھنا بہت مشکل تھا۔

فاطمہ نے گینی کو دیکھا تو سینہ تمام کر رہ گئی۔ افنی کے متعلقہ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ اس کے دل میں از سر نو خدشات نے سراٹھایا۔ لیکن وہ بولی نہیں۔ کیسے بولتی۔ رہے ڈیڈی۔ ڈیڈی کی سب سے مشکل یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں ایم اوٹمان بن کر جینا ہے یا محمد عثمان بن کر۔

ان کی تعلیم، شیٹس اور پوزیشن اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ ایم اوٹمان بن کر زندگی گزاریں۔ اسی وجہ سے خاصی محنت کر کے وہ ایم اوٹمان بنے تھے لیکن کئی بار بیٹھے بٹھائے محمد عثمان ان کے دل میں یوں گھس آتا جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آگھسا ہو۔

محمد عثمان بڑا ضدی تھا۔ غسل تھا۔ منہ پھٹ تھا۔ کٹہر تھا۔ ایم اوٹمان اسے سمجھاتے۔ دلیس دیتے۔ بھی زمانہ دیکھو۔ زمانے کا رنگ دیکھو۔ آج کے تقاضوں پر غور کرو۔ اب یہ پرانی باتیں نہیں چلیں گی لیکن محمد عثمان اپنی بات پر اڑا رہتا۔ اس لحاظ سے ایم اوٹمان بھی گویا ماڈرن گرل تھے۔ ان کی شخصیت کی اوپر لی سطح پر ایم اوٹمان کی بھال تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں محمد عثمان براجمان تھا۔

جب گینی کا تعارف ایم اوٹمان سے کرایا گیا تو محمد عثمان نے ان کے کان میں کہا۔ ”دھیان کرنا۔ کیس پھر سے تمہیں سر پر ٹوپی رکھنا ہاتھ میں چھڑی پکڑ بیٹی کے کمرے میں جانا نہ پڑے۔“ ایم اوٹمان کو اس بات پر غصہ آیا۔ ”بٹ جاؤ۔“ اس نے چلا کر کہا۔ ”میرا دل پر آگندہ نہ کرو۔“ پھر وہ گینی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آیا کرو۔ مسٹر گینی جب بھی فرصت ملے۔ آجایا کرو۔“

گینی ایور گرین میں کبھی صدر دروازے سے داخل نہ ہوتا۔ اس کے لئے تو صرف عقبی

دروازہ ہی موزوں تھا۔ لیکن جنی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ ایک ماڈرن گرل تھی اور ماڈرن گرل ”سلائی“ تعلق رکھنے سے نفرت کرتی ہے۔ اس سے اس کی آزاد طبیعت پر حرف آتا ہے۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے۔ ڈھکے چھپے تعلق تو وہ پیدا کرتی ہیں جن پر بندشیں عائد کی جاتی ہیں۔ جو پابندیوں میں جیتی ہیں۔ جنی کو اپنا جیون ساتھی بھی تو تلاش کرنا تھا۔ جنی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ گینی نے جیون ساتھی بننے یا تلاش کرنے کے متعلق ہمیں سوچا۔

گینی تو گڈ ٹائم اور اڈوسپر کا متلاشی تھا۔ جب وہ جنی کے مجبور کرنے پر ایور گرین کے صدر دروازے سے داخل ہوا تو اڈوسپر کا عنصر ہی ختم ہو گیا۔ اڈوسپر تو ہمیشہ عقبی دروازے سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی رہا گڈ ٹائم۔ تو آپ جانتے ہیں۔ گڈ ٹائم میں شروع کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ہی سرد ہائے رکھنے سے نغمہ نہیں بنتا۔

اس لئے جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ٹائم میں گڈ کا عنصر بتدریج کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف ٹائم ہی ٹائم رہ گیا اور اس خالی خولی ٹائم سے آگاہ گینی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

گینی کی روپوشی پر جنی ساری کی ساری الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چونکہ وہ گڈ ٹائم کی قائل نہ تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اسے پتہ نہ تھا کہ ان حالات میں ماڈرن گرل کو کیا کرنا چاہئے۔ لہذا وہ کی بکی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

پھر وقار محل کی ٹھکا ٹھک نے اسے گھریا۔ وہ ٹھک ٹھک اس کے جسم میں دھنسن گئی۔ اندر جا کر تالیاں بجانے لگی۔ اسے اکسانے لگی۔ اٹھو۔ چھ کرو۔ اٹھو کچھ کرو۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔

ماڈرن گرل ہونے کے باوجود جنی کو جسم کے تقاضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ جب وہ گینی سے ملا کرتی تھی تو اسے یہ احساس نہ تھا کہ جسم کا تقاضا پورا کر رہی ہے۔ اس نے تو ان جانے میں گینی کو جیون ساتھی بنایا تھا۔ اسے گینی سے محبت ہو چکی تھی۔

جب گینی چلا گیا تو بات ہی ختم ہو گئی۔ پھر محل کی کھٹ کھٹ اس کی رانوں میں کیوں گونجتی تھی۔ گھڑی کیوں چلتی تھی۔ جی تو وہ پریشان تھی۔ کئی ایک دن وہ پریشان رہی۔

پھر ان کے گھر میں حسنی آگیا اور مزید پیچیدگیوں پیدا ہو گئیں۔

حنسی ان کا نیا بوائے سروٹ تھا۔ چھپنے ہی سے وہ کوٹھیوں میں کالم کرتا رہا تھا۔ وہیں جوان ہوا تھا۔ ماڈرن بیگمن کے اندر دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے جوان ہو گیا تھا۔ حسنی خاصا اپ ٹوڈیٹ تھا۔ کلین شیو۔ سارٹ لک۔ لمبے بال۔

جنی نے حسنی کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

نوکر تو گھر میں آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ کبھی خانہ سال چلا گیا۔ کبھی بوائے سروٹ آ گیا۔ گینے کی روپوشی کے بعد ان دنوں جنی کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ اس روز اس نے چائے اپنے کمرے میں منگوائی۔

حسی پیالی بنا کر کمرے میں لے گیا۔ جب وہ جنی کو پیالی دینے کے لئے جھکا تو اتفاقاً جنی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ حسی کے کلین چہرے پر دو مونچھیں ابھر آئیں۔ وہ لٹکنے لگیں۔ گھبراہٹ میں جنی کے منہ سے نہ جانے کیا نکلا۔ حسی اسے سمجھ نہ سکا۔ ”جی؟“ جنی کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ”ہائی“ کہا ہو۔ اس کا سر سرہانے پر گر پڑا۔ حسی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ لیکن چائے تو بستر پر گری تھی۔ جنی کیوں شرابور ہو گئی تھی۔

پھر یہ مشکل روز کی مشکل بن گئی۔

جب بھی حسی جنی کے کمرے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے کہتا۔ ”جی“ تو اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے ”ہائی“ کہا ہو۔ وہ چونک کر مڑ کر دیکھتی۔ اس وقت حسی کے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لٹک جاتیں اور چٹے سفید دانت چمکتے۔ صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ جنی حسی سے ڈرنے لگی۔

اول تو جنی اپنے آپ سے بھی تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ حسی سے ڈرتی ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ خود سے ڈر رہی ہے۔ حسی کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ ڈرتی ہے۔ حسی کو شیو میں کام کرتے کرتے جوان ہوا تھا۔ وہ ماڈرن گرل سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ انہیں سمجھتا نہیں تھا لیکن جانتا تھا اور کبھی بغیر جاننا۔ جانے بغیر سمجھنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال حسی کو پتہ تھا کہ جب مس صاحبہ ڈرنے لگے تو وہ صرف شیٹس کا ڈر ہوتا ہے۔ اور شیٹس کا ڈر ایسی بیل ہوتی ہے جس کی جڑ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ انتظار کرتا رہا۔ حسی بار بار ہانے ہانے جنی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتا اور پھر مدھم مگر پرلے آواز میں کہتا ”جی۔۔۔“ آپ نے بلایا مس صاحبہ“

ایک روز جب جتنی آئینے کے سامنے کھڑی تھی تو حسی نے وہی حرکت دہرائی۔ جنی گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گری۔ دو مضبوط ہانوں نے اسے سنبھال لیا۔ جنی نے اوپر کی طرف دیکھا۔ دو لٹکی ہوئی مونچھیں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ جنی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس ڈر کے مارے کہ کہیں مونچھیں اڑ نہ جائیں۔ نیچے سے کلین شیو چہرہ نہ نکل آئے۔ پھر۔۔۔ پھر اسے یاد نہیں۔

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ وقار محل کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ سنہرا گردو غبار اڑ رہا تھا۔

اگرچہ جنی نے اپنی عزت کا تحفظ کرنے کے لئے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لگائی تھیں۔ اور یوں اپنے ذہن کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جسم کو کیسے سمجھاتی۔ جسم تو ایک بے سمجھ کہہ دینے والا دھقان ہے۔ وہ ذہن کی سیاست دانوں کو نہیں سمجھتا۔ جھوٹے رکھ رکھاؤ کی ہیرا پھیریوں کو نہیں جانتا۔ عذاب اور ثواب کے فلسفے کو نہیں مانتا۔ وہ قدیم اور جدید کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جسم غلیظ سہی لیکن مکار نہیں۔ وہ صاف بات کرتا ہے۔ دو ٹوک بات۔ سیدھی بات۔ جسم نے جنی کے کان میں بات کہہ دی کہ تھل صرف گینے سے وابستہ نہیں۔ مونچھیں لگانے کی تکلف کے بغیر بھی تھل حاصل ہو سکتی ہے۔ جسم کی یہ زیر لبی جنی کو بہت ناگوار گزری۔

اگلی صبح جب دھند لکا دور ہوا اور اسٹیش کی دنیا پھر سے آبلو ہوئی تو جنی کی اتاکو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ ایک معمولی نوکر۔ سارا دن وہ اپنی نظر میں گرتی رہی۔ گرتی ہی چلی گئی۔ سارا دن وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ لیکن اس روز گویا یا سمین اس کے دل میں آکھسی تھی۔ جنی اور یا سمین برسرِ تکرار تھیں۔

جنی بار بار کہتی۔ ”چلو ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ اتنی چھوٹی سے بات پلے نہ باندھو۔“ یا سمین کہتی۔ ”اونہوں۔ بات پلے باندھی نہیں جاتی، وہ تو بن پوچھے، بن سوچے سمجھے آپ ہی آپ پلے باندھ جاتی ہے۔“ جنی کہتی۔ ”دل میلانا کرو۔ تم تو ایک ماڈرن گرل ہو۔ جنس تو ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اسے روگ نہ بناؤ۔“

یا سمین کہتی۔ ”تم ماڈرن گرل نہیں ہو۔ کوئی بھی ماڈرن گرل نہیں ہے۔ سبھی ماڈرن گرل بننا چاہتی ہیں۔ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔“

اس روز سارا دن جنی اور یا سمین میں کشاکش ہوتی رہی۔ سارا دن اس کے دل کی ہڈیا میں جنی اور یا سمین کی کچھری پکتی رہی۔

جنی اور یا سمین کے جھگڑنے کو سن سن کر اس کے کان پک گئے۔ وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان دونوں سے الگ تھلگ ہو۔

ذہنتا“ اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ پھر میں کون ہوں؟ کیا میں یا سمین ہوں؟ نہیں میں

”حسّی۔۔۔۔!“ اس نے یوں آواز دی جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی میں سے کوئی مدد کے لئے چلا رہا ہو۔
 ”حسّی۔۔۔۔!“

جنّی اور یاسمین دونوں ششدر رہ گئیں۔ ”یہ آواز کس نے دی؟ کس نے؟“
 ”حسّی۔۔۔۔!“ وہ پھر چلائی۔

وہ آواز منہ سے نہیں بلکہ جسم سے نکل رہی تھی۔

یاسمین نہیں۔ کیا میں جنّی ہوں؟ نہیں میں جنّی بھی نہیں۔ تو پھر میں کون ہوں؟
 صرف میں ہی نہیں ڈیڈی بھی تو ہیں۔ کیا ڈیڈی محمد عثمان نہیں۔ کیا وہ ایم اوٹمان ہیں؟
 نہیں تو پھر ڈیڈی کون ہیں؟

اس گھر میں صرف ایک فرد می تھیں جو فاطمہ بیگم تھیں۔ خلی فاطمہ بیگم جنہیں سب می کہتے تھے۔ نہ جانے کب سے کہہ رہے تھے۔ جنہیں برسوں سے می بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ امی تھیں اور امی ہی رہی تھیں۔ گھر میں صرف وہی تھیں جنہیں علم تھا کہ وہ کون ہیں۔

میں کون ہوں۔ یہ ایک نیرھا سوال تھا۔ پندرہ برس تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ یاسمین ہے۔ دو سال تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ جس من ہے اور گزشتہ چار سال سے وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جنّی ہے لیکن آج وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں۔ آج اس کے دل میں جنّی اور یاسمین کی کچھڑی پک رہی تھی۔

کیا میں جنّی اور یاسمین کی کچھڑی ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کچھڑی نہیں ہوں۔ میں کبھی کچھڑی نہیں بنوں گی۔ میری ایک شخصیت ہے۔ میرا ایک سلف ہے۔ میں یاسمین بن سکتی ہوں۔ جنّی بن سکتی ہوں لیکن کچھڑی نہیں۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔
 اس کے سامنے افعی آکھڑی ہوئی۔ میں افعی ہوں۔ وہ سینہ ابھار کر بولی۔ خالص افعی۔
 نہیں یہ جھوٹ بولتی ہے۔ یاسمین نے کہا۔ اگر یہ افعی ہوتی تو کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتی۔
 اس جج جج سے گھبرا کر جنّی اٹھ بیٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ سامنے وقار محل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ حسرت آلودہ تھی۔

جنّی نے محسوس کیا جیسے محل سب کچھ جانتا ہو۔ ٹھک ٹھک کچھ۔ ڈی ٹھک ٹھک۔ کچھ ڈی محل کی دیوایں چلا رہی تھیں۔
 ”نہیں نہیں۔“ یاسمین بول۔ ”بھولنا کافی نہیں۔ تمہیں اس داغ کو اپنے دامن سے دھونا ہو گا۔“

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ ٹوٹنے ہوئے محل کی آوازیں جنّی کے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ ٹک ٹک ٹک۔۔۔ ایک لرزش اس کے اندر رینگ رہی تھی۔
 ”نہیں نہیں۔“ جنّی گھبرا کر بولی۔ ”تم ایک ماڈرن گرل ہو۔“ نہیں
 ”نہیں۔“ یاسمین چلائی۔ ”تم وقار محل کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہو۔“
 ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ ٹوٹتا ہوا محل کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

سے کا بندھن

آپنی کما کرتی تھی: ”سنہرے سے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سے پہچان۔ سنہرے اپنے سے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔“

اب سمجھ میں آئی آپنی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی۔ آئے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی۔ آپ مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کتنی تھی ”تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی۔ کھالی میں پڑے رہنا۔ پھر یہ جمال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔“

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بال بن ہی میں آپنی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کو گود میں پلی۔ اسی کی سر تال بھری بیٹھک کے بھلے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا لڈ لڈ آیا چھپائے نہ چھپتا۔ آپنی بولی ”نہ دے۔ چھپا نہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپا۔“

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپنی نوکٹی ”یہ کیا کر رہی ہے بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو سمجھے۔ تیرا کام دیکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن، منظر بن اور جو دیکھے بھی تو دیکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سے دیکھ۔ سنہرے ابھی تو شام ہے۔ یہ سے تو اداسی کا سے ہے۔ دکھ کا سے ہے۔ شام بھی گھنٹا شام نہ آئے۔“ آپنی گھٹانے لگی۔ ”یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سے ہے۔ تیرا آنے کا سے ہے۔ پگی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سے ہو گا پچھلے پر تک۔“

ایک دن آپنی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سر ہانے پٹائی پر سوڑے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانہ تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڑے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھاکر کے کھلتا تھا۔

بولی۔ ”سنہرے۔ بوتل کھول۔ گلاس میں ڈال چکی بھر نمک گھول کر مجھے پلاوے۔“ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپنی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی ”دیکھ لڑکی۔ یہ ہمارا سے ہے۔ ہمارا سے وہ ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں، دوپے میں اٹھے۔ دوپے میں جھاگ اٹھنا، مٹی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دو جا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے، ہمارا سے۔ جب کہ دو جا شانت ہو جائے، لے۔ ہمارا سے بیت گیا اور جب سے بیت جائے تو دھیرج پاؤں ٹھک نہ کرنا۔ ٹھک کا سے گیا۔ چک نہ مارنا۔ چک کا سے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا۔ پائل جھنکار بیرون بھی۔“

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی ”سنہرے۔ میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں۔ اوپر کی نہیں۔ سنی سنائی نہیں۔ پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں۔ باوام نہیں ہوتیں۔ جان لے بیٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گرمی ہو۔ چھلکا نہ ہو۔ جو بیٹی ہو، جگ بیٹی نہیں۔ آپ بیٹی ہو۔ ہڈی بیٹی نہیں۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاو۔ بھلاو۔“

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیٹی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزرو گئے۔ لکیریں وہ لکیریں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں، چلے جاتی ہیں۔ جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے، دوسری شروع ہو جاتی ہے۔

آپنی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پٹیلی، روپنی اور میں۔ پٹیلی بڑی، روپنی منجھلی اور میں چھوٹی۔ پٹیلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندر تا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے ٹیاروس سے بھری رہتی ہے۔ گردن اٹھی رہتی مورتی سلن۔

روپنی سرخی سر تھی۔ شدھ سر تاروں سے بنی تھی۔ اس کے بندہ بند میں تار لگے تھے۔ سر تیاں سر تیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے۔ تپتی میں تھی۔ آپنی کتنی تھی۔ ”سنہرے۔ تجھ میں دکھ کی جھجک ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے۔ دوپے کو بھی ڈوب دیتی ہے۔ پگی دوپے کو ڈوبیا کر۔ خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔“

آپنی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا، منہ اٹھایا چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپنی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دو تے آتے تھے پر ایسے بد مزہ ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپنی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں

پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیوں نے اچھالنا۔ جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں، وہ منہ کے بل گر جاتی ہیں اور جو گر گئی۔ وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوتی۔“

آپ کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے، آواز چلتی تھی۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھی۔ نہ تماشا ہوتا نہ تماشا بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دو جا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سبکی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجیب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اور جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا۔ مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی ری ہو۔ آرتی جی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپ کی عزت کرتی تھی۔ بھروسہ کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی بھئی نظر اچھال نہ تھی۔ جھکائے رکھا۔ پیتا ضرور تھا۔ پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا، التامد ہم پڑتا جاتا۔ آٹھ کی چمک گل ہو جاتا۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی اٹکھاتا تھا۔ جیسے بوتل کا منہ ہو، بھیتر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

”ڈرو سکھو ڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو بیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا بھینا نہ جھلا دیتا ہے۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا رطاب مجھے بھی لے ڈوبے گا۔“

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے۔ ”کاٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔“ گیت نے کچھ ایسا سا بانڈھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ ”پھر کو۔ پھر یو لو۔“ کا جاپ کئے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگتی تھی۔ اپنے من کا من کے سے پیتا جا رہا تھا۔ سے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اسی روز وہ سے ایسا ہی سے تھا۔

دھننا ”گھڑی نے تین بجائے۔ آپ ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی۔ ”شما کرو ٹھاکر جی۔“

معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔“

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ ”نہ آپ۔“ وہ بولا۔ ”ابھی تو رات بیٹھی ہے۔“ آپ بولی۔

ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہے۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی کیا رہا؟“ ٹھاکر نے بڑی فٹیں کیں۔ آپ نے مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپ کی گرد ہو گئیں۔ ”آپ یہ سے کا گورکھ دھندہ کیا ہے؟“ آپ بولی۔ ”لڑکیوں سے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پو

پلاؤ۔ بلو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک پھر بھور سے اس کا سے ہے۔ اس کا نام چپو۔ اسے پکارو۔ فریاد کرو۔ دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندہ جو ہمارا ہے، اس کے سے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سے میں پاؤں نہ دھرتا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو۔ اس کے سے کے نیزے نیزے بھی ایسا گیت نہ گاتا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا۔ کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکار نہ بھر دے۔“

پھر وہ دن آگیا جب میں نے ان جانے میں سے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپ سے بولے۔ ”بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ ان رات خواجہ کی محفل ہو گی۔ ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔“

آپ سوچ میں پڑ گئی۔ ”روپہ مادی ہے، وہ تو نہیں جاسکے گی۔ کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز۔“

”خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟“ وہ بولا۔

”تو کسی اور کی منڈی کو لے جا۔“

”اونہوں۔“ ٹھاکر نے منہ ہٹا لیا۔ ”خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق کھ تو ہو۔“

”میں کس لائق ہوں جو ان کا منہ پر لاؤ۔“

”بس اک تیری بیٹھک ہے جہاں پوڑتا ہے۔ جسم کا نہیں، من کا ٹھکانا ہے۔“

آپ مجبور ہو گئی۔ اس نے روپہ کا دھیان رکھنے کے لئے پہلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہویں، بیٹیاں، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو، بھجن منڈی تھی۔ ”خواجہ میں تو آن کھڑی تو رہے

دوار“ سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپا کا ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔ پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیک گئی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میں حیران۔ میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لئے آئی ہوں۔ میری آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیک کر گئی گئی۔ سے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اس کے سے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپا تھی نہیں جو مجھے نوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتہ کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ۔ زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سننی آئی تھی نہ دکھی لوگ پکار پکار کر بار جاتے ہیں۔ پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا دیا لو ہے۔ اتنا نیرے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔ پھر ٹھاکر بولا۔ ”سمرے پائی۔ بس اک آخری فرمائش۔ خواجہ پیا موری رنگ دے چڑیا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھویا دھوئے جائے ساری عمری۔“

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ بس رنگ پکاری چلی کہ میں بھیک بھیک گئی اور میں ہی نہیں، محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیک۔ خواجہ نے رنگ کھات بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چیت نہ لگتا۔ بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارگی روئے جاتی۔ استخوان خان بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ پیٹتے گھنگھروکتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ کہہ نہیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پیلی حیران، روپہ کا منہ کھلا۔ آپا چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بڑھ گئی تو آپا بولی۔ ”بس پتر۔ تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ داناپانی خستہ ہو گیا۔ تو نے اس کے سے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔“

”پر کہاں جاؤں آپا؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لئے۔“

”جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا۔“ روپہ بولی۔

”اس بھڑ میں جائے۔“ آپا بولی۔ ”یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کو ٹھہری میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔“

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دل میں ایک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں داہوں۔ سر میں قل ماش کروں۔ اس کے لئے پکاؤں۔ میز نگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی غیا نہیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آری کا کول بناؤں۔ پھر سر ہانے کھڑی رہوں کہ کب جائے۔ کب پانی مانگے۔

ایک دن آپا بولی ”اب کیا حال ہے دھیے؟“ میں رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

بولی۔ ”وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟“

”انہوں۔ کوئی نظر میں نہیں۔“

”ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟“

”نہیں آپا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بولی۔ ”جو کھوئی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھوئی بھیجے گا۔“

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کو ٹھہری کا دروازہ بجلا۔ آپا داخل ہوئی۔ بولی۔ ”خواجہ نے کھوئی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟“

”کون ہے؟“

”کوئی زمیندار ہے۔ اوچڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کئے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول کیا کہتی ہے۔ منہ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مینے کے لئے دے دے۔ ایک سال کے لئے یا ہمیشہ کے لئے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔“ آپا ہنسنے لگی۔ بولی۔ ”چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔“

”اونہوں۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ ”نہیں آپا انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟“

”کتنی دیر کے لئے ماؤں؟“

”بیون بھر کے لئے۔“

”سوچ لے۔ جو اوباش نکلا تو؟“

”پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے، جیسا بھی نکلے۔“

اگلے دن بیشک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپنی نے رو کر دیا۔ بولی۔ ”سودا نہیں کر رہی۔ دھبی و دار کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی لمات ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔“

حویلی یوں اجڑی اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

دیے تو کبھی کچھ تھا۔ سازو سامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قد آدم آئینے، جھاڑ فانوس۔ کبھی کچھ۔ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرائی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ سسے کو سسے سے ٹکراتی۔ لواسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الپ گنگنائی۔ دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پائل کی جھنکار بیریز ہو۔

دور اس کو ارٹھر کے باہر کھٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نظریں چھوٹی چودھرائی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سونا لگتا اور پھر سے چھوٹی چودھرائی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ کر دکھی ہو جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرائی کی طرف ٹٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت لی بی، چودھرائی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پوٹھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کس چھوٹی چودھرائی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کھماڑی کیوں

ماری تھی؟ کیوں خود کو دوہوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سارا ہوتا۔ اپنی اولاد، تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بتائی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرائی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرائی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرائی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی جائیداد اپنے ہاتھ سے ہانٹ دی۔ اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھی رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرائی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔ اور پھر نوٹی رات سے اس کے کمرے سے گنگنائے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خیرا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرائی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا۔ پر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرائی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا بیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ بار جاتی۔ پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ اچھے اچھے خیال الجھتے۔ مجھے چمن سے اکھیرا۔ نیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اس درخت کو اکھیر پھینکا۔ نیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا بیون کس کام آیا؟

دھننا! اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

”کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”میں ہوں، پٹواری۔ چودھرائی جی۔“

”تو جا۔ جا کر بڑی چودھرائی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟“

”آپ ہی سے کام ہے۔“ وہ بولا۔

”تو بول۔ کیا کہتا ہے؟“

”گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے پر ٹھہرا دیں۔“

”ٹھہرا دو۔“ وہ بولی۔

”نوکر چاکر بندہ دست.....“ وہ رک گیا۔

”سب ہو جائے گا۔“

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا۔ ”کہاں سے آئے ہیں؟“

پٹواری بولا۔ ”اجیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔“ اک دھماکا ہوا۔ چھوٹی چودھرائی کی بوٹیا ہوا میں اٹھائیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرائی نے جنت بی بی سے پوچھا۔ ”جنت۔ یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟“

جنت بولی۔ ”نو چھوٹی چودھرائی۔ وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے بچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں، ہو جاتا ہے۔“

”تو تیار ہو جنت۔ ہم بھی جائیں گے۔ تو لوور میں۔“

”چودھرائی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔“

”تو چل تو سہی۔“ چودھرائی نے خود کو چاور میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”اور دیکھ وہاں مجھے چودھرائی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار.....!“

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرائی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا ”سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔“

”ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔“ چھوٹی چودھرائی بولی۔

”تو پھر؟“ سفید ریش گھبرا گیا۔

”ایک سوال پوچھنا ہے۔“ چودھرائی نے کہا۔

”سائیں بیبا اس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔“

”سائیں بیبا نے جواب نہیں دینا، انہوں نے پوچھنا ہے۔“ وہ بولی۔

”کس سے پوچھنا ہے؟“ خلوم بولا۔

”اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔“ یہ سن کر سفید ریش خلوم سن کر کھڑا کا

کھڑا رہ گیا۔

”ان سے پوچھو۔“ چھوٹی چودھرائی نے کہا۔ ”ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی

ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟“

کمرے پر منوں بو جھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چودھرائی بولی۔ ”کہو وہ عورت پوچھتی ہے: تو نے بیٹھک کے گیلے سے اک بوٹا اکھیزا۔ اسے تیل بنا کر درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر غار ہوتی رہ۔“ وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ ”اب تو نے اس درخت کو اکھیز پھینکا ہے۔ تیل مٹی میں رل گئی۔ وہ تیل پوچھتی ہے۔ ہل میرا جیون کس کام آیا؟“ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

”تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔“ سفید ریش خلوم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ”تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟“ وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بو جھل ہو گئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

”میری طرف دیکھ۔“ سفید خادم نے کہا ”سنہری بالی۔ میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پچھتی؟ میں تیرا سارگی نواز تھا۔ میں کیا تھا، کیا ہو گیا۔“

چھوٹی چودھرائی کے منہ سے ایک جھج نکلی۔ ”استو جی۔ آپ.....؟“ وہ استوا کے چرن چھونے کے لئے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھر کم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

”سنہری بی بی۔“ وہ بولا۔ ”مجھ سے پوچھ، تیرا جیون کس کام آیا۔“

چھوٹی چودھرائی نے مڑ کر دیکھا۔ ”ٹھاکر.....“ وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا۔ ”ہم ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں اوھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔“ اس نے

سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا۔ ”بی بی۔ ہمیں آشیر باد دے۔“

خبر میں جھوٹ ملانے کی کیا ضرورت تھی۔ جوں جوں میں سوچتا گیا، توں توں شکوک پیدا ہوتے گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو کہ فساد پر آملا کر دے۔

پھر خیال آتا۔ آخر ادبی محفل میں بھی تو کہانی سننے والے آستین چڑھا کر بات کرتے ہیں اور میز پر کئے مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے تو خبر درست ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آتا۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ادبی محفل میں تو پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر کسی نے تنقید پر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ رکھی ہوتی ہے۔ لہذا وہ اپنے علم کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور علم کا مظاہرہ دوسرے کی بات رد کرنے میں ہی ہوتا ہے، سپورٹ کرنے میں نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادبی محفل کا ہال واحد جگہ ہے جہاں ادیب کو کھل کر بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ باہر سیاستے بولنے نہیں دیتے۔ گھر میں بیوی اور پھر یہ بھی تو ہے کہ معترض کا مقصد کہانی پر بات کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی ادبی صلاحیتیں چھانٹنا ہوتا ہے۔ مزدور نقاد تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ وہ ایک معصوم سی کہانی پر کیسے مشتعل ہو سکتے ہیں۔

”خبر من گھڑت ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا اور غصے میں اخبار کو پھینک دیا۔ عین اس وقت سجاد آگیا۔ سجاد میرا دوست ہے۔ یقیناً آپ اسے جانتے ہوں گے۔ بھی مشہور جرنلسٹ ہے۔ وہ آتے ہی بولا۔ ”کون سی خبر من گھڑت ہے؟“

”خبر ہے کہ چلتی گاڑی میں ایک مزدور نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے کہ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے۔ پانچ زخمی ہو گئے۔ لیکن میں نہیں مانتا کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو سکتی ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتی؟“ وہ بولا۔

”بھئی۔ میں خود افسانہ نویس ہوں میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ سجاد تن کر کھڑا ہو گیا۔

”بھئی ایک کہانی کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہو جائے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ایک صورت ہے۔ اگر کہانی ذاتی نوعیت کی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آگیا ہو۔“

”بھئی ایک کہانی کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہو جائے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ایک صورت ہے۔ اگر کہانی ذاتی نوعیت کی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آگیا ہو۔“

سجاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ ”یہ کہانی ذاتی نوعیت کی نہیں تھی۔“

”تمہیں پتا ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ پتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

چکٹ گاڑی، ہو نکلتا ہوٹر اور موم بتی

لاحول ولا قوۃ۔ کتنی بے معنی خبر ہے۔ میں نے غصے میں اقبار اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ بھلا ماننے کی بات ہے کیا کہ کہانی اس قدر پر اثر ہو کہ سننے والوں کو فساد پر آملا کر دے۔ میں نہیں مانتا۔ میں نے چلا کر کہا۔

ایسے ہی من گھڑت خبریں چھاپ دیتے ہیں۔ بھئی میں خود کہانیاں لکھتا ہوں۔ ساری زندگی اسی دھندے میں گزری ہے۔ ادبی انجمنیں شہد ہیں کہ میری کوئی کہانی کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی ایمان سے۔ لوگ سنتے ہیں، اوئے اوئے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار انجانے میں واہ بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آکر تنقید کی چٹیاں، فیچیاں، چھریاں نکال لیتے ہیں اور پھر چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کہانی کو کم، لکھنے والے کو زیادہ۔

اس روز صبح سویرے سے میں اخبار لئے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے یہی خبر نظر آئی تھی کہ مزدور شل میں کسی بڑے میاں نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر بھی مشتعل ہو گئے۔ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے۔ پانچ زخمی ہو گئے۔ آپ کہیں گے اتنی غیر اہم خبر میری نگاہ پر کیسے چڑھی۔ آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں صرف غیر اہم خبریں پڑھا کرتا ہوں۔ اخبار پڑھنا بھی مفتی۔ سچی اور عوامی خبریں پڑھنا چاہتے ہو تو غیر اہم خبریں پڑھو۔ اس لئے اخبار کو الٹی طرف سے کھولو۔ جہاں غیر اہم خبریں ہوتی ہیں۔ اہم خبریں کبھی سچی نہیں ہوتیں۔ جن مسائل سے بڑوں کی غرض و غایت وابستہ ہو، نہ سچی ہو سکتی ہیں نہ عوامی۔ لہذا عوام سے متعلق خبریں پڑھو جو اخبار میں غیر اہم صفحات پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں۔ مثلاً ”فلاں خاتون کے گھر دو سروں والا بچہ پیدا ہوا۔ فلاں گھر میں جنات کی خشت باری ابھی تک جاری ہے۔ راہ چلتے تو جوان نے خاتون کو آنکھ ماری اور پکڑا گیا۔ ایسی خبریں۔“

اس روز اخبار میں پڑھ کر میں سوچ میں پڑھ گیا۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ بھلا غیر سیاسی

مزدوروں کو لاد کر تارپین آئل فیکٹری تک پہنچاتی ہے اور شام کو فیکٹری سے انہیں لاد کر شہر لے آتی ہے۔ یہ فاصلہ تقریباً چالیس میل کا ہے۔ اس لائن پر کوئی سٹیشن نہیں۔ صرف فلیگ سٹاپ ہیں۔ جب یہ شل شہر پہنچتی ہے تو اسے باقاعدہ پلیٹ فارم پر نہیں لاتے بلکہ سٹیشن سے باہر سائینڈنگ پر کھڑا کر دیتے ہیں۔

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی اس لئے کہ یہ گاڑی اس قابل نہیں کہ اسے منظر عام پر لایا جائے۔“ سچو نے کہا۔

دراصل یہ گاڑی نہیں تیلی کی دکان ہے۔ کل کوئی پھ بوکیاں ہوں گی۔ سب تیل سے چمکتے۔ ”شمیں‘ فرش‘ پئے‘ پائیدان سب کالے وحت۔ نہ تو بوکیوں میں دروازوں کے پٹ ہیں۔ نہ کھڑکیوں کے شہر۔ سالن رکھنے کے تختے بھی اکھاڑ لئے گئے ہیں۔ کھڑکیوں کو بند کرنے والے شیشے اور تختے نوٹ چکے ہیں۔ ہاتھ روم کے دروازے بھی غائب ہیں۔ ان بوکیوں میں نہ بتیاں ہیں نہ چٹکے۔ صرف یہی نہیں‘ بوکیوں کا ہر بیچ ڈھیلا ہے۔ پئے چلنے کے ساتھ جھولتے جھومتے بھی ہیں۔ ایک گاڑی کو دوسری گاڑی سے جوڑنے والے کنڈے تو ہیں مگر بفرز کے شاک آبرار برڈ کب کے دم توڑ چکے ہیں۔ چلتے ہوئے دھکے لگتے ہیں اور ساتھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں جیسے پر اسرار فلم میں بیک گروانڈ میوزک چل رہی ہو۔“ سجاد ہنسنے لگا۔ ”وہ گاڑی نہیں‘ اونٹ ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ البتہ ایک ہوڑ ہے جو بہت جاندار ہے۔ نہایت بھدی اور ڈروانی آواز میں گونجتا ہے۔ اور تقریباً سارا رستہ بجاتا ہی رہتا ہے۔“ کچھ دیر کے لئے وہ رک گیا۔

”ہو ایوں کہ چار دن پہلے تارپین آئل فیکٹری کے متعلق ایک خبر چھپی تھی کہ بیروڑہ کے پھوک سے ہم ایک ایسی چیز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی۔“ وہ پھر رک گیا۔

”اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔ بھئی یہ کیا چیز ہے جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی؟ اس کی تفصیلات کا پتہ لگاؤ۔ اور اگر واقعی یہ چیز اہم ہے تو اس پر ایک فچر لکھ دو۔ اس پر میں نے فیکٹری کے پی آر کو فون کر کے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ بولا۔ وہ چیز بتانے کی نہیں دیکھنے کی ہے۔ یہاں آ جاؤ۔ اسی وجہ سے مجھے کل تارپین آئل فیکٹری جانا پڑا۔ وہاں دن بھر ریسرچ میں مصروف رہا۔ پھر شام کو اسی گاڑی سے لوٹا جس میں یہ حادثہ پیش آیا۔“ سجاد خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”چائے پلاؤ گے؟“

میں نے چر کر کہا۔ ”پہلے ساری بات بتا مجھے‘ پھر پلاؤ گا۔“

”کیسی کہانی تھی وہ؟“ میں نے اسے کرید۔

”عام سی تھی جیسے فیمل ہوتی ہیں۔ مثلاً ”چڑی گل کی کہانی۔“

”نہیں یار۔ مذاق نہ کر۔“ میں نے پڑا۔ ”اول تو کہانی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فساد برپا کر سکے۔ پھر چڑی گل جیسی کہانی۔ اونہوں۔ یہ خبر سرے سے ہی غلط معلوم پڑتی ہے۔“

”خیر تو بھی سولہ آنے مصدقہ ہے۔“ سچو نے تن کر کہا۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مصدقہ.....؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی میں خود وہاں موجود تھا۔“ سچو نے جواب دیا۔

”موقع پر؟“

”ہاں۔ موقع پر۔“

”تم نے وہ کہانی خود سنی تھی کیا؟“

”بالکل بھئی۔ میں کہانی سنانے والے کے قریب کھڑا تھا۔“

”تو یار۔ مجھے سناؤ وہ کہانی۔“ میں نے پینتر بدلا۔

”بھئی۔ وہ ایک عام سی کہانی تھی۔ جیسے ہوتی ہیں پرانی کہانیاں۔ اور سنانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ ایک معمر مزدور اور کہانی سنانے سے اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔“

”تو پھر اس نے کہانی سنائی کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یار بڑے بوڑھوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں بیٹھے ہیں‘ کوئی اصلاحی بات یا نصیحت چھیڑ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کی سپورٹ میں کوئی نوک و زڈم کی کہانی سنا دیتے ہیں یا سعدی کی یا مولانا روم کی کوئی حکایت۔ بہر حال وہ اپنی نوعیت کی کہانی تھی۔“ سچو نے کہا۔

”تم سناؤ تو سہی۔“ میں نے سچو کی منت کی۔

سجاد کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکالا‘ سلگایا۔ ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا۔ پھر جیسے کہانی سنانے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن جلد ہی پھر ہچکچا کر بولا۔ ”اس وقت کہانی شاید‘ پچھسی لگے۔ دراصل کہانی کا ماحول سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔“

”تو ماحول بھی بیان کر دو۔ اس میں کیا مشکل ہے؟“ میں نے کہا۔

کچھ دیر کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ”تم فیکٹری شل کو جانتے ہو کیا؟ جس میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا؟“

”بھئی ظاہر ہے‘ وہ کوئی گاڑی ہو گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”گاڑی تو ہے۔“ سچو بولا۔ ”لیکن ایک خصوصی گاڑی ہے۔ یہ گاڑی روز صبح شہر سے

وہ ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ بولا۔ ”واپسی پر جب سٹاپ پر پہنچا تو گاڑی حرکت میں آ چکی تھی، خیر، میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گاڑی مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دراصل اس روز ان کا پے ڈے تھا۔ اس لئے حاضری نل تھی۔ گاڑی میں تیل، پینے اور فکر مندی کی بو کے جیسے کچھ اٹھ رہے تھے۔ وہ سب گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے کوسوں دور، نہ جانے کہاں۔“

”تو تو کتا ہے۔ وہ پے ڈے تھا۔“ میں نے اسے ٹوکا۔

”بالکل پے ڈے تھا۔“ سجاد نے جواب دیا۔

”مزدور تو پے ڈے پر خوش ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ غلط فہمی ہے۔“ سجاد بولا۔ ”میں نے بھر مزدور لوگ پے حاصل کرنے کی امید رکھائے رکھتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں۔ پے ڈے کو انہیں احساس ہوتا ہے کہ حصول کتنا عیش ہے۔ کتنا بے معنی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔“ سجاد مسکرایا۔ ”کہ زندگی کا المیہ حاصل نہ ہونے میں نہیں بلکہ حاصل ہو جانے کے بعد اس احساس میں ہے کہ کیا اسی کے لئے اتنی شورا شوری تھی۔ نئے کتا ہے کہ ہماری زندگی کا عظیم ترین لمحہ وہ ہے جب ہماری بڑی سے بڑی آرزو، بڑی سے بڑی کامیابی ہماری نگاہ میں پیچ نظر آتی ہے۔“

”بھائیار۔“ میں نے چڑ کر کہا۔ ”نئے بازی چھوڑ۔ مجھے وہ کہانی سن۔“

وہ میری بے قراری پر ہنسنے لگا۔ ”ایک معمولی سی کہانی کے لئے تم خود کو رسی کی طرح بل دے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بات شروع کی، بولا۔ ”اتفاق سے مجھے کھڑے ہونے کے لئے وہیں جگہ ملی جہاں وہ بڑھا مزدور داستان کو بیٹھا تھا۔ ایک دبلا پتلا مزدور میرے پاس کھڑا تھا۔ بولا: میاں جی۔ آپ کہانی سنانے لگے تھے۔ ہاں۔ ہاں۔ وہ بڑھا بولا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب غلام رکھنے کی رسم عام تھی۔ بازار میں ہر اٹھو ارے منڈی لگا کرتی تھی جس میں غلام کھلم کھلا بیٹے تھے۔ سو اگر بکنے والے کو تھڑے پر کھڑا کر کے اس کی خوبیاں گناتے کہ دیکھ لو۔ مضبوط آدمی ہے۔ جوان ہے۔ طاقت ور ہے۔ کام کر سکتا ہے۔ بے داغ ہے۔ جس طرح گھوڑے کو بیچتے وقت اس کے دانت دکھاتے ہیں۔ پھر بولی شروع ہو جاتی۔ جو سب سے اونچی بولی دیتا، غلام ہمیشہ کے لئے اس کی ملکیت ہو جاتا اور مالک اس سے زندگی بھر جو کام چاہتا، لیتا۔

گاڑی چیختی، چلاتی، کراہتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ گرد و پیش کا ویران علاقہ دھندلا ہو چکا

تھا۔ رات کا اندھیرا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ گاڑی کے اندر فکر مندی اور اواسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مزدوروں کی شکلیں دھندلائے جا رہی تھیں۔ ہوٹر اپنی بھدی آواز میں کراہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میاں جی بولے: پھر جو بندے کو غلام بنانے کے خلاف آوازے لگنے لگے تو ملک کے قانون میں بدلی کر دی گئی۔ ملک میں ڈھنڈورا پیٹ کر اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، اپنے غلام کو منڈی میں لا کر بیچ سکتا ہے۔ اس طرح آئندہ سے غلام کو بھی حق حاصل ہو گا۔ وہ جب چاہے، خود کو بکنے کے لئے پیش کر دے۔ مطلب یہ کہ جس غلام کو اپنا آقا پسند نہ ہو، وہ شہر کے قاضی کے پاس جائے۔ اگر قاضی اسے بکنے کی اجازت دے دے تو منڈی میں خود کو بکنے کے لئے پیش کر دے۔ بولی میں جو قیمت ملے، وہ اپنے پہلے مالک کو دے دے اور خود کو نئے مالک کے حوالے کر دے۔ میاں جی پھر خاموش ہو گئے۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے مزدور جوں کے توں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کہانی سن نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ صرف وہی دبلا پتلا مزدور ہنکارا بھر رہا تھا۔ جی میاں جی پھر۔؟

میاں جی نے سراٹھایا۔ ایک لمبی آہ بھری۔ اور بولے: شہر میں ایک غلام تھا زیر۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ مس بیگ رہی تھیں۔ جسم میں جان تھی۔ ناک نقشے میں جاہلیت تھی۔ وہ ہر چوتھے دن شور مچا دیتا۔ میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس مالک میں کیا عیب ہے جو تو اس کے پاس نہیں رہے گا؟ قاضی نے پوچھا۔ زیر بولا: یہ مالک مجھ سے اچھا برا تو نہیں کرتا۔ میں سارا دن اس کے کاموں میں جتا رہتا ہوں لیکن یہ خود تو تازی روٹی کھاتا ہے، اور مجھے کھانے کو باسی دیتا ہے۔ قاضی نے زیر کو بہت سمجھایا بھلیا کہ اتنی سی بات کو دل پر نہیں لگاتے لیکن زیر نہ مانا۔ قاضی نے اسے بکنے کی اجازت دے دی اور وہ پھر سے بک گیا۔

اپنے نئے مالک کے گھر چند ہی روز رہنے کے بعد زیر نے پھر شور مچا دیا۔ میں بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس لئے کہ یہ خود سیبوں کی کھاتا ہے اور مجھے جو کی دیتا ہے۔ قاضی نے پھر اسے بہت سمجھایا بھلیا مگر وہ نہ مانا اور پھر بک گیا۔

تیسرے مالک کے گھر پہنچتے ہی زیر نے پھر چیخ پکار شروع کر دی۔ اس سے بہتر تو میرا پہلا مالک ہی تھا جو اگرچہ جو کی دیتا تھا لیکن دو وقت دیتا تھا۔ یہ تو صرف ایک وقت روٹی دیتا ہے اور وہ بھی روٹی نہیں بلکہ پانی میں بھگوئے ہوئے سوکھے ٹکڑے۔ یہ مجھے انسان نہیں، جانور سمجھتا ہے۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گا۔ قاضی بولا: زیر میں نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مالک

ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب میں تجھے کیا سمجھاؤں۔

گاڑی کے بوڑھے زور سے لمبی چیخ ماری۔ بوڑھا رک گیا۔

گاڑی ہونک رہی تھی۔ یوں جیسے سسکیاں بھر رہی ہو۔ کل پرزے کڑکڑا رہے تھے۔ انجن یوں چیخ رہا تھا جیسے چلا چلا کر کہہ رہا ہو۔ بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ گاڑی کے اندر خاموشی کا تنبو تنا ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں سے دبی دبی آہوں کراہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر میاں جی؟ دبلے پتلے واحد سامع کی آواز سنائی دی۔ پھر کیا ہوا؟ میاں جی بولے۔ زیر کی آوازیں آتی رہیں۔ آتی رہیں۔ میں بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ پہلے ان آوازوں میں غصے کا رنگ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں دکھ کا پہلو ابھرتا گیا۔ پکاریں کراہوں میں بدلتی گئیں اور وہ بکنا گیا۔ بکنا گیا۔ پھر دفعتاً اس کی آواز خاموش ہو گئی۔ زیر چپ ہو گیا۔ زیر کو یوں چپ دیکھ کر لوگ چونکے۔ یہ کیا ہوا؟ زیر چپ کیوں ہو گیا؟

سارے مزدوروں اور غلاموں میں چہ میگوئیوں ہونے لگیں۔ ایک بولا۔ زیر کو آخر کار آقا قتل کیا ہے۔ وہ خوشی کی وجہ سے چپ ہو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا۔ چلو مان لیا کہ وہ خوش ہے۔ پھر وہ خوش دکھتا کیوں نہیں؟ پہلے اس کا چہرہ کتنا صاف تھا۔ اس پر بشارت کی جھلک تھی۔ مگر اب ماتھے پر تیوری چڑھ بیٹھی ہے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ ایک بوڑھے غلام سے کہا: وہ اس لئے چپ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان گیا ہے۔

اس کے بعد جب بھی زیر بازار میں نکلتا تو لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں۔ دیکھو دیکھو۔ وہ قاضی کی طرف جا رہا ہے۔ ضرور وہ بکنا چاہتا ہے، لیکن جب وہ دیکھتے کہ اس کا رخ کسی اور طرف ہے تو وہ مایوس ہو جاتے۔ پھر وہ آوازے کتے۔ زیر تو قاضی کے پاس کیوں نہیں جاتا؟ کیا تو بکنا نہیں چاہتا؟ کیا تو خوش ہے؟ لیکن زیر ان آوازوں کو ان سنی کر کے گردن جھکائے چلا جاتا۔

لوگوں کی آپس میں شرمیں بندھ گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ زیر خوش ہے۔ کچھ کہتے تھے وہ خوش نہیں۔ شرط پر فیصلہ سننے کے لئے لوگوں نے اپنے آوازے تیز تر کر دیئے۔ آخر ایک روز ان آوازوں سے آگتا کر زیر رک گیا۔ اس نے منہ موڑ کر آواز لگنے والے کی طرف دیکھا اور چلا کر کہا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ آوازے لگانے والوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ابھی زیر نے جانے کے لئے رخ بدلا ہی تھا کہ مجھے سے ایک آواز آئی۔ تو کیوں نہیں کہے گا۔۔۔ وجہ؟

زیر پھر رک گیا۔ بولا: میرا آقا علم کا رسیا ہے۔ مطالعے کا شوقین ہے مگر اتنا تجوس ہے کہ

چراغ دان نہیں خریدتا۔ رات کو جب وہ مطالعہ کرتا ہے تو چراغ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ یوں میں آدھی آدھی رات تک چراغ اٹھائے رہتا ہوں۔ نہیں۔ میں نہیں بکوں گا۔ وہ چیخ کر بولا۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرا اگلا مالک مجھے تیل پلا دے گا اور میرے منہ سے تسی نکال کر مجھے دیا بنالے گا۔ نہیں۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔

بڑھا خاموش ہو گیا۔ گاڑی پر سکوت طاری ہو گیا۔ اندھیرا اس قدر گاڑھا تھا کہ محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمیں کنوئیں میں دھکا دے دیا ہو۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ یونہی صدیاں بیت گئیں۔ پھر دفعتاً گاڑی کا بوڑھا کہنے لگا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔ اس پر گاڑی میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ ایک آواز آئی۔ میاں جی۔ تو مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ عبد اللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک مزدور کھڑا ہو گیا۔ بولا: یہ تجھے طعنہ نہیں دے رہا۔ عبد اللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ مجھے پتا ہے۔ اس کی آواز میں تشدد تھا۔

نہیں۔ نہیں۔ دپلا پتلا مزدور بولا۔ میاں جی تو کمائی سنا رہے تھے۔ ٹھہر جاؤ۔ تشدد بھری آواز پھر آئی۔ اس بڑھے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اس سمجھ لوں گا۔

پھر اس ہنگامے سے ایک دھولس سنائی دی اور ایک اونچا لبا آدمی پھلانگ لگا کر کونے سے باہر نکل آیا۔ تو رہنے دے۔ لبا ترنگا بولا۔ اس بڑھے نے تجھے نہیں، مجھے چھیڑا ہے۔ مجھے۔ میرا نام زیر ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں کیوں بکنا نہیں چاہتا۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ جس نے اس کی حملت کی، اس سے میں سمجھ لوں گا۔

پھر بوگی میں چاروں طرف سے تشدد بھری آوازیں آنے لگیں۔ "سجاد نے کہا۔" یہ عالم دیکھ کر میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے ختم گھٹا ہو گئے۔ گاڑی کے پٹے ہونک رہے تھے۔ بفر کرا کرا کر دھکے دے رہے تھے۔ بوڑھا چلا رہا تھا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔"

چلو خاموش ہو گیا۔۔۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا جیسے گرمی سوچ میں پڑا ہو۔ پھر اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ "سچی بات یہ ہے مفتی۔" وہ بولا۔ "میرا جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اس بڑھے کی ناک پر گھونسا مار دوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" سجاد نہلا۔ "مجھے ایسا لگا جیسے اس بڑھے نے میرا راز مجھ پر کھول دیا ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر نے مجھے موم بتی بنا کر دونوں سروں پر جلا رکھا ہو تاکہ اس کا اپنا نام روشن رہے۔"

میں نے عشق کئے۔ محبتیں کیں۔ افروز نہیں۔ یار نے نہیں۔ توجہ کا مرکز بنا رہا۔ ذلتیں اور رسوائیاں جھیلیں۔ فراق و وصال سبھی کچھ۔ جیسی تو اب خود مطمئن تھا۔ احساس تکمیل سے سرشار۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے: بول کیا مانگتا ہے؟ جو مانگے گا، ملے گا۔ تو یقیناً "میں سوچ میں پڑ جاؤں گا۔ کیا مانگوں؟ میں مانگ کی دنیا سے دور نکل آیا ہوں۔ سکون اور اطمینان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

شور شرابا پیچھے رہ گیا ہے۔ بہت پیچھے۔

جس راستے پر میں گامزن ہوں، وہ اطمینان سے لبریز ہے۔

سڑک خاموش ہے۔

راستہ ہموار ہے۔ نہ اوچان نہ نیچان۔ سیدھا، صاف۔ دونوں جانب پیراگے ہوئے ہیں۔ سرسبز نہیں، پیلے پیلے اونچے لمبے نہیں، پیٹھے پیٹھے، جھکے جھکے، گرد آلود۔

پتے مسلسل جھڑ رہے ہیں۔ کھڑکھڑا رہے ہیں۔

شام گرمی ہوتی جا رہی ہے۔

دور دور لگے کھمبوں پر بتیاں ٹنٹنارہی ہیں۔

ان کی زرد ٹم ٹم زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔

شام کا کسمبہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑک پر اکا دکا راہ گیر چل رہے ہیں۔

چپ چاپ تھکے ہارے۔ گرد سے اٹے ہوئے۔

ایک دوسرے سے دور دور۔ اکیلے اکیلے تھکا تھکا۔

منظر پر سکون کا ایک خیمہ تپا ہوا ہے۔ بے چینی کی مدہانی مدت سے رنگ آلود ہو چکی ہے۔

میرے دل میں کوئی مدوجزر نہیں۔ ذہن سوچ و بچار کی گھائیوں سے نکل چکا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟

کس لئے کے بھڑ بھن بھن کرنا بھول چکے ہیں۔

میرے سامنے آسمان پر چاند ٹنکا ہوا ہے۔ چاندنی والا چاند نہیں۔ چاندنی تو چھیر دیتی ہے۔

ایک بڑا سادہ سادہ مدہم چاند۔ جیسے تانبے کا ایک تھال لٹک رہا ہو۔ میں چلے جا رہا ہوں۔

دھنٹا پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ قریب۔ اور قریب۔ یہ کون ہے جو میرے ساتھ

چل رہا ہے؟

میں سڑک دیکھتا ہوں: کون ہو تم؟

عینی اور عرفیت

زندگی کا عظیم ترین واقعہ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ایک چھوٹا سا چشمہ پھونٹا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سردیا بن کر آپ کی شخصیت کو خش و خاشاک کی طرح ہمارے جاتا ہے۔

وہ اچانک نمودار ہوتا۔ ایسے وقت جب کہ نہ خواہش ہوتی ہے نہ آرزو۔ نہ امید نہ

توقع۔ آپ دروازے بند کر چکے ہوتے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔ جب

آپ بھرپور زندگی بٹا چکے ہوتے ہیں، خود سے مطمئن، تکمیل کے احساس سے سرشار۔

اس وقت وہ اچانک نمودار ہوتا ہے اور آپ کی شخصیت کے اس شاندار ایوان کو جسے

آپ نے سال ہا سال ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا، ایک جھٹکے میں سمار کر دیتا ہے۔

اور پھر جو آپ دیکھتے ہیں تو..... کیا دیکھتے ہیں کہ آپ لمبے کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی

نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ جوانی میں جذبات کی ایک بھیر لگائے رکھی۔ میلہ

لگائے رکھا۔ پٹانے جھوڑے۔ پھلجھڑیاں چلائیں۔ ہولیاں کھیلیں۔ رنگ پچکاریں چلائیں۔

ایڑگال کے تھال بھرے۔

میں جذباتی تھا۔ شدت پسند تھا۔ جذبات اور شدت میری وائٹ میں خلوص کے منظر

تھے۔ میرا رخ مثبت تھا۔ خلوص بھرا۔ ہمدردی بھرا۔ حقارت اور نفرت سے پاک۔ میں کہہ دینے

والا تھا۔ گوٹکے اور ٹھنڈے خون والے مجھے پسند نہ تھے۔

میں نے علم حاصل کیا تھا۔ نفسیات میں مجھے دسترس تھی۔ تحلیل نفسی میں خاصی اہلیت

تھی۔ دوست مانتے تھے۔ اچھا جانتے تھے۔ قدر کرتے تھے۔

اپنے ماضی پر مجھے پشیمانی نہ تھی۔ نہ احساس گناہ، نہ کمتری۔

وہ سر اٹھاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھنکتی ہے۔ رکتی ہے۔ پھر سر جھکا لیتی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔

اس کے جسم میں چمک ہے۔ تازگی ہے۔ کھٹکتی ہے۔ لیکن منہ لٹکا ہوا ہے۔ خدو خال پر بے تعلقی کی دھول جھی ہے۔ تھکا ہارا مردہ چہرہ۔ گردن جھکی ہوئی۔ نگاہیں ہیں اکتائی ہوئیں۔ جیسے بہت کچھ دیکھا ہو۔ دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں۔ جھک گئی ہوں۔ نہ دیکھنے کی چاہ نہ دکھانے کا شوق۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کون ہو تم؟“

”میں بھی ہوں۔“ وہ سر اٹھائے بغیر جواب دیتی ہے۔

جواب میں سختی ہے، لیکن آواز مدہم، پھٹی پھٹی، تھکی تھکی۔ اس میں چمک نہیں، تان نہیں، لے نہیں، لوچ نہیں۔ جیسے روڑی بھگ گئی ہو۔ کڑاگانہ رہا ہو۔

”لیکن یہ سڑک تو تمہارے لئے نہیں ہے۔ تمہیں تو شاہراہ پر چلنا چاہئے جہاں رونق ہے، زندگی ہے۔“

”وہیں سے آئی ہوں۔“ وہ جواب دیتی ہے۔

”لیکن کیوں؟“ ناگہ میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

وہ سر اٹھاتی ہے۔ تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ”میری مرضی۔“

میں چپ ہو جاتا ہوں۔ چلنے لگتا ہوں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ ہٹا نہیں غصہ ہے یا کید۔

پاؤں کی چاپ پھر قریب آ جاتی ہے۔ اور قریب۔

”تم میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی ہو؟“ ان جانے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

”ساتھ نہیں۔ میں چل رہی ہوں۔“ وہ با آواز بلند کہتی ہے۔ پھر زیر لبی سنائی دیتی ہے۔

”کوئی کسی کے ساتھ نہیں چلتا۔“ اس کی آواز میں حسرت نہیں، آرزو نہیں، بے تعلقی ہی بے تعلقی ہے۔

میں رک جاتا ہوں۔ ”دیکھو پاؤں دھیرے دھیرے ہم ساتھ ساتھ نہ رہیں۔“

”ہاں۔“ وہ کہتی ہے۔ ”دھیرے دھیرے تھے۔ لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ میں پوچھتا ہوں۔

”پھر تم بھی پاؤں دھیرے دھیرے لگے۔ رک گئے۔“

”میں رک گیا تھا؟“ مجھے غصہ آنے لگا۔

”ہاں۔ تم۔“ وہ جواب دیتی ہے۔ اس کی آواز برف کی سل کی طرح گرتی ہے۔

”تمہیں اپنے متعلق خوش فہمی ہے کیا؟“

”تمہیں ہے، مجھے نہیں۔ میں خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل آئی ہوں۔“

میں رک جاتا ہوں۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا۔“

”تھینک یو۔“ وہ جواب دیتی ہے اور حیر چلنے لگتی ہے۔

”تھینک یو۔“ کس بات پر؟ میں چلاتا ہوں۔

”میں تمہارے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتی۔“ وہ پیچھے مڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ ”میرے ساتھ چلنے

میں کیا ہے؟ بولو۔“

”تم ساتھی نہیں ہو۔“

”لیکن کیوں؟“ میں اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہوں۔

”تم اپنی میں سے بھرے ہوئے ہو۔ اتنے بھرے ہوئے ہو کہ دوسرے کی گنجائش نہیں۔

تم توجہ دے نہیں سکتے۔ خود توجہ طلب ہو۔“

”تم مجھے جانتی ہو کیا؟“

”جانتی نہیں۔“ وہ جواب دیتی ہے۔ ”تمہارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔“

”تم اسے پڑھ سکتی ہو کیا؟“ میں طنزاً پوچھتا ہوں۔

”ہاں۔“ وہ سر اٹھا کر جواب دیتی ہے۔ ”میں گودت جو ہوں۔“

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سن کر دیا ہو۔ میں اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے اٹھا لیتا

ہوں۔ میری گردن لٹک جاتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ کہتی ہے۔ ”میں تمہیں دکھانا نہیں چاہتی۔ دل میلا

نہ کرو۔ سچ سننے کی ہمت پیدا کرو۔“

اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھائی ہیں۔ مجھ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور مسکرا دی ہے۔

دلفنسا، نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ رنگ پچکاری چل گئی ہے۔ پیڑ تن گئے

ہیں۔ پتے ہرے ہو گئے ہیں۔ بتیاں روشن ہو گئی ہیں۔

چاندنی کی چاندنی نے سارے منظر کو بھگو دیا ہے۔

میرے ارد گرد اک بھیڑ لگ گئی ہے۔

وہ چل پڑتی ہے۔

”رک جاؤ۔ رک جاؤ۔“ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔

پیچھے پیچھے چلنے کا میرا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں بار بار پیچھے پیچھے چلا ہوں۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی کو پیچھے لگا سکوں۔ دراصل میں ازلی طور پر پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں۔

میرا عشق پیچھے چلتا ہے۔

جو میرے پیچھے چلتی ہے وہ دل سے اتر جاتی ہے۔

جب تک میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں جنون قائم رہتا ہے۔

جب ساتھ ساتھ چلنے کا موقع آتا ہے قدم اکڑ جاتے ہیں۔

سالہا سال پہلے یہی بات مجھے اہل نے بتائی تھی۔ لیکن اہل کی بات میں نے کبھی نہ سنی تھی۔ اہل کی بات پر میں کیسے سوچتا۔ میں تو بات بات پر اہل سے کہا کرتا تھا۔ ”اہل تم نہیں سمجھتیں۔“ جو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس کی بات پر سوچنا کیسا۔ اہل کی بات کو میں نے کبھی نہ جانا تھا۔ اور جانا ہی نہیں تھا تو ماننا کیسا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ بدلتے موسم کی ہوا چل رہی تھی۔ کرتے پتے کھڑکھڑ کر رہے تھے۔ اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہم تین رہتے تھے۔ ننھا میر دیوار سے لگا۔ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میں ٹین کی کرسی پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے، فضا کو گھور رہا تھا۔ بوڑھی اہل دیوار سے ٹیک لگائے آلو جمیل رہی تھی۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

و نعتاً! اہل بولی۔ ”ایسے کیسے چلے گا بیٹے؟“

میں نے سر اٹھایا۔ ”ایسے کیسے کیا اہل؟“

”کب تک وہ دیوار سے لگا کھڑا رہے گا؟“ اس نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”تو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین کو گھورتا رہے گا۔ اور اس میں.....“ وہ رک گئی۔ ”مجھ سے اب یہ کچھ نہیں ہوتا بیٹے۔“

”کیا کریں اہل؟“

”کوئی گھر والی لے آئے۔“

”کیسے لے آؤں؟ طے تو لاؤں؟ ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”نہ نہ نہ۔“ وہ بولی۔ اس کا چہرہ یوں پھوٹ گیا جیسے شیشہ ترخ جاتا ہے۔ آواز میں منت

بھری ٹوٹ جھٹکی۔ ”نہ بیٹے نہ۔ اللہ کے واسطے ڈھونڈ میں نہ پڑتا۔“

”کیوں اہل؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی پسند آگئی تو تو اس کے پیچھے بھاگے گا۔“ وہ رک گئی۔ انگلی سے آنسو پونچھا۔ ”پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سولہ سال تو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ پھر جب وہ مل گئی تو ساتھ ساتھ نہ چل سکا۔“ وہ رک گئی۔

”جو پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں بیٹا، وہ ڈرتے ہیں کہ مل نہ جائے۔ پیچھے بھاگنے کی لذت ختم نہ ہو جائے۔“ وہ چپ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا۔ بات سامنے دھری تھی پر میرے پلے نہ پڑی تھی۔

اب میں نے جانا ہے کہ سامنے دھری نہیں دکھتی۔ جو ڈھونڈ کا رسیا ہو، اسے سامنے دھری کیسے دکھے۔

دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔

پھر اہل اٹھی۔ میرے پاس آئی۔ ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ تھپک کر بولی۔ ”بیٹے تو سب کچھ جانتا ہے۔ پر خود کو نہیں جانتا۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔“

”تو مجھے کیسے جانتی ہے اہل؟“

”تو اپنے لبا پر گیا ہے۔ ہو ہو وہی ہے اور میں نے ساری زندگی اس کے ساتھ مزاری ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ پیچھے بھاگنا محبت ہے۔ بس وہ بھاگتا ہی رہا زندگی بھر۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک کھڑی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”اہل۔“ میں نے خاموشی توڑی۔ ”محبت کیا ہوتی ہے؟“

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ”بیٹے محبت دوڑ بھاگ نہیں ہوتی۔ طوفان نہیں ہوتی۔ سکون ہوتی ہے۔ دریا نہیں ہوتی۔ جمیل ہوتی ہے۔ دوپہر نہیں ہوتی۔ بھور سے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی۔ اجالا ہوتی ہے۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے۔ وہ بتانے کی چیز نہیں، بچنے کی چیز ہے۔ سمجھنے کی چیز نہیں، جاننے کی چیز ہے۔“

اہل کی بات میرا راستہ روک لیتی ہے۔ میں رک جاتا ہوں۔ لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید وہ مڑ کر دیکھے۔ پھر مسکرائے۔ پھر پلجڑی چل جائے۔ پھر کن کہہ دیا جائے۔

لیکن وہ چلے جاتی ہے۔ یوں چلے جاتی ہے جیسے کسی نے اس کا راستہ کاٹا ہی نہ ہو۔ جیسے

کسی کو پیچھے چھوڑ کر نہ جا رہی ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرے پاؤں رک گئے ہیں لیکن میں نہیں رکا ہوں۔ میں اس کے پیچھے چل رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔

پتا نہیں۔ میں اس کے پیچھے کیوں چلے جا رہا ہوں۔
کوئی خواہش نہیں۔ آرزو نہیں جو پیچھے چلنے پر اکسائے۔ حصول کی خواہش نہیں۔
مطلب نہیں۔ مانگ نہیں۔

اسے دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔
پوچھنے کے پھول سوکھ کر کانٹے بن چکے ہیں۔
بھینٹ چڑھانے کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہے۔
پھر بھی میں چلے جا رہا ہوں۔

نہ مقصد نہ منزل۔

چلتے چلتے ایک دن وہ پھر نظر آ جاتی ہے۔
مجھے یقین نہیں آتا۔ آنکھیں ملتا ہوں۔

نظر تو وہ مجھے مسلسل آتی رہتی ہے۔ وہ مسکراہٹ، وہ رنگ پچکاری جیسے کسی نے کن کہہ دیا ہو۔ نہیں نہیں۔ فریب نگاہ نہیں۔ واقعی وہ پارک کے ایک کونے میں 'درخت کے مقابل' زمین پر اکڑوں بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں برش ہے۔ پہلو میں بست سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔
روبرو ایک بڑی سی کیٹوس فریم پر لگی ہوئی 'درخت کے سارے کھڑی ہے۔
میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہوں۔

ارے۔ یہ کیٹوس پر کیا بنا ہوا ہے؟ اس قدر خوف ناک چہرہ دیکھ کر رو گئے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کوئی عفریت ہے۔ یہ کیا بنا رہی ہے؟ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں۔

دیر تک وہاں کھڑا رہتا ہوں۔ کھڑا رہتا ہوں۔

وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ ایک نظر غلط انداز۔ سرسری۔ اور پھر سے رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جیسے پیچھے کوئی کھڑا ہی نہ ہو۔ انداز میں نہ تعجب ہے نہ لگاؤ۔ نہ لاگ۔
"یہ کیا بنا رہی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

"پورٹریٹ۔" وہ منہ موڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

"کس کی ہے؟"

"بے کسی کی۔"

"کوئی عفریت ہے کیا؟"

"نہیں۔ عفریت نہیں۔"

"کس کے لئے بنا رہی ہو؟"

"میری اسائنمنٹ ہے۔" وہ پیچھے دیکھے بغیر جواب دیتے جا رہی ہے۔

"کانٹوں سے بھری شبیہ ہے۔"

"ہاں تاؤ ہے۔ تلخی ہے۔ شدت ہے۔ محاسن نہیں۔ محبت نہیں۔"

"محبت تو شدت کے بغیر ممکن نہیں۔" میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

"نہیں۔ محبت شدت کی نفی ہے۔" وہ پہلی بار مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مسکراتی

ہے۔ وہی رنگ پچکاری۔ فرحت سے بھری ایک پھواری اڑتی ہے۔ پورٹریٹ کی ساری تلخی دھل جاتی ہے۔

"تم شدت کو برا جانتی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

وہ میری طرف منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہتی ہے "محبت ایک پرسکون کیفیت ہے۔ وجدان نہیں۔" وہ زیر لب گویا خود سے کہتی ہے۔ "بتائی نہیں جاسکتی۔ صرف بتی جاسکتی ہے۔"

دفعاً وہ میری طرف دیکھ کر چوکتی ہے۔ "رک جاؤ۔ رک جاؤ۔" وہ اٹھ کر میری طرف آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی تھام لیتی ہے۔ پھر ٹھوڑی پر بائیں طرف انگلی رکھ کر پوچھتی ہے۔ "یہ کیا ہے؟ سکار ہے یا تل ہے؟"

"تل ہے۔" میں جواب دیتا ہوں۔

وہ پورٹریٹ کی طرف مڑتی ہے۔ برش اٹھاتی ہے اور شبیہ کی ٹھوڑی کے بائیں طرف کالا نقطہ لگا دیتی ہے۔

غصے سے میرا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ "کیا مطلب۔ تمہارا مطلب ہے یہ میری.....؟" میں پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔ لیکن میرا گلا خشک ہو جاتا ہے۔

وہ میری طرف منت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ "سچ جاننے کا حوصلہ پیدا کرو۔"

دفعاً پارک کے پھول انگاروں میں بدل جاتے ہیں۔ شعلے اٹھتے ہیں۔ پودے دھڑ دھڑ جلنے لگتے ہیں۔ منظر دھواں دھواں ہو جاتا ہے۔ میں اٹھ کر بھاگتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہوں۔

شام کو جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہوں تو دفعتاً "لینے لینے میرے اندر کوئی کتا ہے۔" تم خود

سے بھاگ رہے ہو۔" میں چونکا ہوا جاتا ہوں۔ یہ کیا ہوا؟ کیا میری "میں" کا ایک حصہ باقی ہو گیا ہے؟ ضرور اس لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں خود کو اس کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔

نہیں۔ میں خود سے نہیں بھاگ رہا۔ یہ جھوٹ ہے۔ غصے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میری بیوی یہ سن کر گھبرا گئی ہے۔ پوچھتی ہے: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" "اے کیا جواب دوں؟"

اگلے روز صبح ہاتھ روم میں میری نگاہ آئینے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں۔ ارے یہ کیا؟ آئینے میں عفریت مجھے گھور رہا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ میں نہیں۔ میں تو روز آئینہ دیکھتا ہوں۔

ہنسی کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں۔

آئینے میں عفریت کے پیچھے ہاتھ میں برش پکڑے وہ ہنس رہی ہے۔ کتنی ہے: "تم روز آئینے میں وہ دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ وہ نہیں جو تم ہو۔ وہ جو تم سمجھتے ہو کہ ہو۔" میں آئینے پر قہر مارتا ہوں۔ تزاخ کی آواز آتی ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہوں۔

شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی ایک بڑا سا پیکٹ میرے ہاتھوں میں تھا دیتی ہے۔ کتنی ہے۔ "ایک خاتون دے گئی ہے۔" پیکٹ کلفڈ میں لپیٹا ہوا ہے۔

میں کلفڈ پھاڑتا ہوں۔ ارے۔ وہی پورٹریٹ۔ پورٹریٹ کے کونے میں "یعنی" لکھا ہوا ہے۔

تصویر کو دیکھ میری بیوی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے۔ "ہے یہ تو کوئی بھوت ہے۔"

میں اس کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ تصویر کو الٹا کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔

کچھ دیر کے بعد اچانک جو میں ادھر دیکھتا ہوں تو سن ہو کر رہ جاتا ہوں۔ تصویر کینوس کی پشت پر ابھر آتی ہے۔

دیوانہ وار لپک کر میں تصویر کو اٹھا لیتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں۔ میں اسے ایسی جگہ پھینک آؤں گا جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔

سڑک پر اکا دکا موٹریں چل رہی ہیں۔ ایک ویگن آکر رک گئی ہے۔ میری نگاہ اس کی پشت پر پڑتی ہے۔ ارے۔۔۔! یہ کیا۔۔۔؟ ویگن کی پشت پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے۔ گھبرا کر میں منہ موڑ لیتا ہوں۔ سامنے دیوار پر بھی وہی تصویر۔۔۔ ارے۔۔۔؟ میں بھاگ لیتا ہوں۔

جگہ جگہ ٹریفک سائز پر وہی عفریت مجھے گھور رہا ہے۔

میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔

ڈرائنگ روم میں میرا دوست راجا شفیع میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں تصویر کو کمرے کی دیوار سے لگا کر راجا سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے۔

ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

راجا بوڑھے ساتھی سے کہتا ہے۔ "حاجی صاحب میرا دوست آج کل بہت پریشان رہتا ہے۔ اس کے لئے دعا کریں۔"

"کیا پریشانی ہے؟" حاجی پوچھتا ہے۔

"میں ایک انجمن میں پھنسا ہوں۔" میں جواب دیتا ہوں۔ "وہ یہ کہ میں کون ہوں؟"

حاجی مسکرا دیتا ہے۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ کہتا ہوں۔ "میرا مطلب ہے۔ کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں۔ یا وہ ہوں جو لوگ سمجھتے ہیں؟"

حاجی پھر مسکراتا ہے۔ کہتا ہے۔ "چاہے آپ یہ ہیں یا وہ ہیں۔ آپ جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں کہ آپ کیا ہیں؟ اپنی "میں" کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں۔ خواہ مخواہ۔"

دفعۃً میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے کندھوں کا بوجھ گر گیا ہے۔ عین اس وقت شفیع چلا کر کہتا ہے۔ "ارے۔۔۔ یہ کیوں تو خالی ہے۔"

میں پورٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں۔ کینوس واقعی خالی ہے۔

[illegible]

نہیں۔ یہ مثل غلط ہے۔ مجھے یہ مثل نہیں دینی چاہئے تھی۔ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔ کیوں بولوں؟ جھوٹ وہ بولتے ہیں جنہیں ڈر ہوتا ہے کہ سننے والے کو بچ کر ڈال دے گا اور وہ حقو حقو کرے گا۔ میں تو ان لڑکیوں میں سے ہوں جن کے منہ سے کڑوا چمن کر بھی سننے والا بد مزہ نہیں ہوتا۔ پھر جھوٹ بولنے کا فائدہ؟ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے کوئی بانکا اچھا لگے تو ایسی پھلکی چھلکی بھر پور نگاہ ڈالتی ہوں کہ اس کا سارا کلف اتر جاتا ہے۔ ”گھوٹا“ ہو کر گر پڑتا ہے۔ پھر میرے اندر سے آواز آتی ہے۔ ”تنت تـ“ بے چارہ۔ اپنے آپ سے بھی گیا۔“

مجھے پتہ ہے کہ میں بڑی طاقت ور نگاہ رکھتی ہوں۔ اتنی سادگی سے خنجر کرتی ہوں کہ کوئی اسے خنجر مان ہی نہیں سکتا۔ سمجھتا ہے انوس ہی انوس ہوں۔ میک اپ کرتی ہوں لیکن کیا مجال کوئی سمجھے کہ میڈ اپ ہے۔ سمجھتے ہیں، میک اپ سے بے نیاز ہوں۔ لو۔ وہ میک اپ ہی کیا جو میک اپ نظر آئے۔ چٹے منہ ایسے میک اپ کا۔

بس میری طرح ایک ہی مشکل ہے۔ مصرے اندر کچھ ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ پر ہے۔
جس طرح مدفون خزانے پر سانپ ہوتا ہے۔ جس طرح اہرام مصر کے اندر جادو ٹوٹا کیلا ہوا ہے۔
ویسا ہی کچھ ہے۔

ادمنہ۔ غلط کہہ گئی۔ میرے اندر ایک نہیں، دو ہیں۔ دو رو میں ہیں۔ کبھی ایک کنٹرول پر بیٹھ جاتی ہے کبھی دوسری۔ میں دو مومنہ سانپ کی طرح ہوں۔ کبھی دو مومنہ دیکھی ہے؟ اس کے دو سر ہوتے ہیں۔ ایک سر کی جانب، دو سر آدم کی جانب۔ سر اٹھایا، چل پڑی۔ پھر رک گئی۔ سر زمین پر رکھ دیا۔ پھر دم والا سر اٹھایا اور اس جانب چلنے لگی۔ اس جانب، کبھی اس جانب۔ پتہ نہیں چلتا کہ کب کسی جانب چلنے لگوں گی۔ پیش خبری سے عاری ہوں۔ مطلب کہ Unpredictable ہوں۔ بس یہی میری میری مشکل ہے۔ یہی میری بیماری ہے۔

دومونی

سوچتی ہوں کہ میں تیاگ کلینک میں گئی ہی کیوں؟ کیا فائدہ ہوا ایسا؟ اپنی بیماری دور کرانے کے لئے گئی تھی، ساری مخلوق کو بیمار کر کے آگئی۔ وہی بات ہوئی نا۔ بڑھیا بڑھیا تیرا کبڑ دور ہو جائے یا ساری دنیا کھڑی ہو جائے۔

لیکن تیاگ جی ستانے سے پہلے میں اپنا تصرف و کرا لوں۔ میں سانوری ہوں۔ میں سال کی۔ سلمان سے میرج ہوئے دو سال ہوئے ہیں۔ لو میرج تھی۔ میرے خدوخال عام سے ہیں یعنی ایورج سے کچھ بہتر۔ ہاں ذہن کی حیکمی ہوں۔ کاٹھی مضبوط ہے جسم تانتا..... لیکن نہیں۔ میں غلط بیانی کر رہی ہوں۔ کسر نفسی سے کام لے رہی ہوں۔ میرے خدوخال ایورج سی لیکن مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے سر اٹھا اٹھا کر گردن موڑ موڑ کر دیکھتے ہیں تو یوں دکتے ہیں جیسے سر سے پاؤں تک الو کے پٹھے بن گئے ہوں۔ بس میں نہیں رہتے۔ کنزولر ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ڈولتے ہیں۔ چھوڑ چھوٹ جاتے تو کشتی ڈولتی ہے نا۔

میں لڑکی پن سے نکل آئی ہوں۔ لیکن ابھی لڑکی ہی ہوں۔ عورت نہیں بنی۔ اللہ نہ کرے کہ بنوں۔

عجیب سا عالم ہے۔ جیسے شام کو ڈسک ہوتی ہے، رات نہیں پڑی۔ دن بھی نہیں رہا لیکن دن دن سا لگتا ہے۔

اور ایک بات تو میں بھول ہی گئی۔ مجھ میں ایک عجیب سی بات ہے۔ جیتی ہوں۔ بھرپور جیتی ہوں۔ تھری ڈا مشنل زندگی سے عشق ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو جیتے ہوئے دیکھتی بھی ہوں۔ پرکھتی رہتی ہوں۔ سیانے کہتے ہیں، دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوتیں۔ نہیں ہو سکتیں۔ یا تو جیو یا خود کو جیتے رکھو۔ وہی ایٹ دی کیک اینڈ ہیو اٹ والی بات ہے۔ پتا نہیں میری بات کیوں الگ ہے۔ کیک کھاتی بھی ہوں، پاس بھی رکھے رہتا ہے۔

نہ تھی۔ میرے اندر کی دوسری میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔ ہٹاؤ سلمان کو۔ کوئی اور سہی جو تیرے دو مومنہ پن پر مسحور ہو جائے۔ اپنے گرد کوئی اور چھن پھلا دیکھو۔ دنیا میں نوجوان بھی اولیٰ بدلتیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ یہ سرزمین پر رکھ دو۔ دوسرا اٹھاؤ۔

دوسرا سر اٹھا کر سلمان کی طرف دیکھتی تو وہ سپاٹ نظر آتا۔ روکھا پھیک ہے۔ کیا میں اس پر جان دیتی رہی؟

پھر وہ واقعہ پیش آگیا اور میں لرز کر رہ گئی۔

ایک روز سلمان کا ایک نیا دوست گھر آگیا۔ اس وقت سلمان موجود نہ تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہی۔۔۔ وہی دو سال پہلے کا سلمان جسے دیکھ کر خود کو میں نے اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہی رنگ، وہی روپ، وہی شوخی، وہی تازگی۔ میں نے انجانے میں ایک بھرپور چھیننے والی نگاہ ڈال دی۔ اس نے چھن پھیلایا۔ اور عین کے ہیرے پھیرے لینے لگا۔ عین اس وقت سلمان آگیا۔ میں جاگ پڑی۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میری ”میں“ اتنے ہلستے ہو رہی ہے۔ ڈر گئی۔ بری طرح سے ڈر گئی۔ اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

چھ مہینے پہلے تیاگ کلینک کے متعلق میری ایک سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ خود ذہنی بیماری میں مبتلا تھی۔ ایک مہینہ تیاگ کلینک میں زیر علاج رہی۔ صحت مند ہو کر لوٹی۔

دو ہاڑیوں میں تیاگ ایک قصبہ تھا۔ وہاں ڈاکٹر داؤد نے ذہنی بیماروں کے لئے ایک ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ڈاکٹر داؤد ایک زمیندار ہے۔ ولایت سے ایم ڈی کر کے آیا ہے۔ مقصد پر یکیش کرنا نہیں بلکہ علاقے کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ عمر بھر کے تجربے اور تحقیق کے بعد اس نے اپنا طریق علاج ڈسکور کیا ہے۔ جزی بوٹیوں اور مش رومز سے علاج کرتا ہے۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لئے ڈاکٹر نے ایک ہوٹل تعمیر کیا ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن میری سہیلی نے بتایا ہے کہ علاج شروع کرنے سے پہلے وہ مریضوں سے زبانی اور تحریری حلف لیتا ہے کہ علاج کے دوران میں بغیر چون و چرا ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ اس دوران میں ذاتی سوچ و بچار کو عمل میں نہیں لاؤں گا۔ میں سچے دل سے اپنی دل سرتر کرتا ہوں۔ یہ سن کر میں ڈر گئی۔ نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں بھی کچھ تیاگ سکتی ہوں اپنی دل نہیں تیاگ سکتی۔ میرے پاس لے دے کر اک ”میں“ ہی تو ہے۔ اسے میں کیسے تیاگ دوں؟ کیسے کسی دوسرے شخص کے تابع کر دوں؟ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو

لیکن ٹھہریے۔ شروع شروع میں مجھے پتہ نہ تھا کہ Unpredictability بری چیز ہے۔ النام میں تو سمجھتی تھی کہ یہ بڑی پیاری خصوصیت ہے۔ آپ کو کیا پتا؟ جوان لڑکی ہو۔ چھین دینے والی نگاہ ہو۔ بے نیازی سے محسوس ہو۔ اوپر سے برتاؤ Unpredictable ہو۔ پھر تو وہ کموار بن جاتی ہے۔

بچپن سے ہی دو دلی تھی۔ کبھی تو اپنی مس اتنی اچھی لگتی۔ اتنی اچھی لگتی کہ میں اس کے دارے نیارے جاتی۔ کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھتی تو ایسے دکھتی جیسے آکٹائی تھکی ہاری بے جان عورت ہو۔ کبھی ماں باپ بڑے پیارے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے قصائی ہوں۔ دو ایک محبتیں بھی ہوئیں۔ کبھی محبت کے جذبات سے چھلکتی، چھلکے جاتی۔ کبھی سوکھی کاٹھ ہو کر رہ جاتی۔

یہ دو دھاری پن بچپن ہی سے موجود تھا۔ دو سواوی تھی۔ کھٹ میٹھی۔ گنگا جمنی۔ گرم ٹھنڈی۔ الٹی سیدھی۔ کبھی کچھ تھی لیکن ان دنوں میں اس بات کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ جوان ہوئی تو دو مومنہ ابھرتی آئی۔ ابھرتی آئی۔۔۔ چھا گئی۔ پھر دفعتاً مجھے احساس ہوا۔ ڈر گئی۔ بری طرح سے ڈر گئی۔

ان دنوں میں سلمان کی محبت میں چور تھی۔ اتنی لت پت تھی کہ دوسرا سر اٹھانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس دیوانگی میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ پھر ایک روز میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سلمان نہ تھا۔ پتا نہیں کون تھا۔ نہ وہ رنگ۔ نہ وہ روپ۔ بے جان۔ جس سے ملک کافور کی بو آتی تھی۔ میں ڈر گئی۔ اپنی دنیا تباہ ہونے کے خوف سے ڈر گئی۔ خود کو بچانے کے لئے میں نے جھٹ پٹ سلمان سے شادی کر لی۔ شادی کی ماہی میں بات پھر چل نکلی۔

بہر حال مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ایک بیماری ہے۔ میں میسل ہوں۔ میں نے اس احساس کو بہت دبایا۔ جتنا دباؤ اتنا ابھرتا۔ میں نے بڑے جتن کئے۔ ڈاکٹروں سے ملی۔ ہسپتالوں میں اس قدر گھومی پھری کہ لوگ مجھے ہاسپٹل واکر سمجھنے لگے۔ پشیشٹ کیا دوا دیجئے انہوں نے میری بیماری کو سمجھا ہی نہیں۔ میں نے بہت سمجھایا لیکن سمجھنا آسان ہوتا ہے، سمجھنا بہت مشکل۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو گئی۔

شادی سے پہلے تو سلمان میری Unpredictable پر اس قدر مسحور کن ہوتا تھا جیسے سانپ بین پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد بھی یوں ہی چھن پھلا کر میرے ہیرے پھیرے لیتا رہے گا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کا پیش خبری کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ اسے میرے دو مومنہ پن پر غصہ آنے لگا۔ میں گھبرا گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہ۔ ادھر میں بھی تو ایک

سکتا۔ میری سہیلی نے مجھے بہت سمجھایا کہ ذہنی بیماری کے علاج میں سب سے بڑی رکاوٹ ”میں“ ہی تو ہوتی ہے۔ اس نے بڑی دلیلیں دیں۔ لیکن میں نہ مانی۔

اس سے کچھ دیر پہلے میرے چچا نے مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ انہوں نے کہا کہ سالواری بیٹی ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔

بزرگ کی خدمت میں پہنچی۔ انہیں تفصیل سے اپنی ذہنی کیفیت سنائی۔ سن کر بولے۔ ”بیٹی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری بیعت کر لو۔“

”بیعت کیا ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بولے۔ ”بیعت کا مطلب ہے۔ حوالگی، سپردگی۔ خود کو ہمارے سپرد کر دو۔“

”کیسے سپرد کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”بولے۔ ”اپنی میں تیاگ دو۔ سارا شر تمہاری میں کا ہے۔ وہ خود سر ہو گئی ہے۔ بٹ کر دو ہو گئی ہے۔ جیسے سانپ کی زبان بٹ کر دو ہو جاتی ہے۔“

غمے میں ”میں“ کو ہلنے لگی اور جواب دیے بغیر بھاگ آئی۔

ہاں تو اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلیتہً جاؤں گی۔ لیکن حلف نہیں اٹھاؤں گی۔

اس رات میں نے سلمان سے کہا۔ ”سلمان میں ایک مینے کے لئے ہل شیٹن جانا چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے اکیلی رہوں۔ کسی ایسے پہاڑی مقام پر جہاں بھیڑ بھڑ کا نہ ہو۔ کراؤ نہ ہو۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر بولا کہ دیکھو اگر واقعی تم تنہا رہنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

تیاگ کا سفر خاصا دشوار تھا۔ پہلے تو گلیات کی طرف جانا پڑا۔ رات وہاں ٹھہری۔ پھر پھول گلی سے تیاگ جانے والی سوز کی مل گئی۔ سڑک بہت تنگ اور نیم پختہ تھی۔ ساٹھ میل کا سفر سات گھنٹوں میں طے ہوا۔ شکر ہے کلینک سے ملحقہ ہو شل میں جگہ مل گئی۔ رات گویا گھوڑے بچ کر سوئی۔ اگلے دن نو بجے کے قریب کلینک پہنچی۔ ایک گھنٹہ ریسپشن میں انتظار کرنا پڑا۔ پھر ڈاکٹر نے اندر بلا لیا۔

اپنے روبرو ایک نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ کر میں حیران ہوئی۔ سہیلی کی باتیں سن کر میں سمجھی تھی کہ ڈاکٹر داؤد معمر آدمی ہو گا۔

”آپ ڈاکٹر داؤد ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ان کا بیٹا ڈاکٹر خالد ہوں۔“ وہ بولا۔ ”والد صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ اب میں ان کی جگہ کام کر رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے خالد نے ایک لمبا سا کانڈ اٹھالیا۔ بولا۔ ”سب سے پہلے اپنی کیس ہسٹری لکھو اور دیجئے۔ ہر وہ تفصیل بتائیے جسے آپ اہم سمجھتی ہیں۔“

پتا نہیں اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ یہ بتائیے مجھے کہ اس گاؤں کا نام تیاگ کیوں ہے؟

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”بس نام ہے۔ جس طرح آپ کا نام سالواری ہے حالانکہ آپ گوری ہیں۔“ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر سے بات شروع کی۔ کہنے لگا۔ ”والد صاحب کا اس کے متعلق ایک نظریہ تھا۔ مفروضہ کہہ لیجئے۔“

میں پھر سے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر خالد میں مجھے ایک بے نام سی کش محسوس ہونے لگی تھی۔

”بتائیے نا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مفروضہ کیا تھا؟“ لیکن پہلے تو یہ بتائیے کہ تیاگ کا مطلب کیا ہے؟“

کہنے لگا۔ ”تیاگ ہندی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے، چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ یہ قصبہ ہندوؤں نے آباد کیا۔ اوپر نیلے پر ایک مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے ساتھ ایک عمارت ہے۔ غالباً اس عمارت کا نام تیاگ بھون تھا۔“ وہ رک گیا۔

”والد صاحب کا نظریہ بھی تو بتائیے نا۔“ میں نے پوچھا۔

مسکرا کر بولا۔ ”والد صاحب کا کہنا تھا کہ پہاڑوں کی بلندی کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ جوں جوں نیچے اترو۔ جذبات کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ گاڑھے ہو جاتے ہیں۔ بوجھل۔ بھاری۔ جوں جوں اوپر جاؤ۔ جذبات میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ محسوس پیدا ہوتی ہے۔ نیچے لاگ لگاؤ بڑھتے ہیں۔ اوپر بے نیازی کا سماں پیدا ہوتی ہے۔“

والد صاحب کا کہنا کرتے تھے ”دس ہزار کی بلندی پر بھور سے کا عالم ہوتا ہے۔“

”جس طرح صبح سویرے ڈان کے وقت سپیدی سی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سا سکون، اطمینان، نروان۔ دس ہزار کی بلندی پر جذبات کی ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ نیچے کے لوگ تالاب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اوپر خواہش تو ہوتی ہے۔ پر اس میں ڈنگ نہیں ہوتا۔ نیچے انسان کی ”میں“ میں اتنا ملتا ہوتا ہے کہ وہ پتھر بن جاتی ہے۔ اوپر روئی کے گالے جیسی ہلکی پھلکی رہتی ہے۔ نیچے محبت و نفرت دونوں میں دھار ہوتی ہے۔ اوپر نفرت بھی ہوتی ہے، محبت بھی۔ لیکن دھار نہیں ہوتی۔“

”اوپر سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آٹھ دس ہزار کی بلندی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ کو حیرت ہو گی کہ یہاں تیاگ میں کوئی ذہنی بیماری نہیں ہوتی۔ ذہنی بیماریاں نیچے جنم لیتی ہیں۔ وادیوں میں، میدانوں میں۔ ایک بات یقینی ہے ذہنی بیماری ”میں“ سے پھوٹی ہے۔ ”میں“ میں گرہیں لگ جاتی ہیں۔ آپ ایک سال یہاں قیام کریں۔ ساری گرہیں کھل جائیں گی۔ آپ ہی آپ ڈنک نکل جائیں گے۔ وھاریں کند ہو جائیں گی۔“

میں خالد کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس میں سے ایک عجیب سا اطمینان چھن چھن کر کمرے کی فضا کو منور کئے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے لئے بہت انوکھی تھیں۔ میری ”میں“ پٹیلی ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ایک شدید کوشش کی۔ اٹھ بیٹھی۔ ”تھینک یو۔“ اس رات میں اپنے کمرے کی میز پر بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کب تک بیٹھی رہی۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے میرا وزن کم ہوتا جا رہا ہو۔ میرا تعلق دھرتی سے کٹتا جا رہا ہو۔ اگلے روز ڈاکٹر خالد نے کہا۔ ”میں نے آپ کا کیس سٹڈی کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ آج سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔ علاج شروع کرنے سے پہلے آپ کو ایک فارمیٹی ادا کرنی ہو گی۔ یہ ایک حلف ہے۔“ اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک تو ہاتھ اٹھا کر یہ حلف پڑھئے اور دوسرے اس فارم پر دستخط کر دیجئے۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنی ”میں“ کسی کے حوالے نہیں کر سکتی۔“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس حیرت میں ستائش بھی شامل تھی۔ میں نے جواب میں ایک بھرپور نگاہ چھلکائی لیکن خالد پر کلف تھا ہی نہیں جو ٹوٹا۔ ہاں ذرا سا لڑکھڑایا ضرور تھا۔

کہنے لگا۔ ”مسز سلمان۔ تمام ذہنی بیماریاں ”میں“ سے پھوٹی ہیں۔ یا تو ”میں“ میں گرہیں لگ جاتی ہیں یا درازیں پڑ جاتی ہیں۔ یا کانٹے اگ آتے ہیں۔ اس لئے ”میں“ کو تیاگے بغیر شفا نہیں ہوتی۔“

”نہ ہو شفا۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے سمجھانے لگا۔ بولا۔ ”سائیکس ایڈی میں بھی ڈاکٹر مریض کی توجہ ذات کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مریض لڑکیوں کو ڈاکٹر سے محبت ہو جاتی ہے۔“

مجھے اس پر غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر خالد۔ میں اتنی دور چل کر آپ سے محبت رکھنے نہیں آئی۔“ پھر میں نے ایک ایسی نظر اس پر ڈالی جس کا مطلب تھا۔ ”آپ بے شک مجھ سے محبت رکھائیں۔“

وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔ ”اچھا آپ یوں کریں کہ آٹھ دس روز یہاں قیام کریں اور اس مسئلہ پر سوچیں۔ شاید.....“ وہ رک گیا۔

”کیا آپ حلف لئے بغیر علاج شروع نہیں کر سکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”حلف علاج کا ایک حصہ ہے۔ اہم ترین حصہ۔“ وہ چ کر بولا۔

”خدا حافظ۔“ میں اٹھ بیٹھی۔

شام کے وقت جب میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی تو دروازہ بجا۔ میں نے بن سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ”کم لن۔“ میرے سامنے ڈاکٹر خالد کھڑا تھا۔

”بیٹھے۔“ میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پوچھے گا کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے آتے ہی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ بولا۔ ”وہ سامنے ٹیلے پر جو جنگل ہے، اس جنگل میں عجیب و غریب قسم کے مشروم اگتے ہیں۔ مثلاً ”ایک مشروم ہے جو ٹھٹھا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک فٹ کے دائرے میں ٹھٹھا ہے۔ صبح یہاں ہے۔ دوپہر کو آدھ فٹ سر کا ہوا۔ شام کو پورا ایک فٹ۔“

میں ہنسی۔ ”اب مجھے الف لیلوی کہانیاں نہ سنائیے۔“

وہ مسکرایا۔ بولا۔ ”حقیقت، ریٹیٹی آدمی سے زیادہ الف لیلوی ہے۔ آپ خود الف لیلوی برتاؤ بیت رہی ہیں۔“

”دو رخی برتاؤ۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ مجھے عجیب و غریب قسم کے مشروم کے متعلق بتاتا رہا۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ مشروم سے علاج کرتے ہیں؟“

کہنے لگا۔ ”ہاں۔ بیشتر۔“

میں نے پوچھا۔ ”مشروم کیسا اثر رکھتا ہے؟“

کہنے لگا۔ ”سب سے پہلے مریض کو ہم وہ مشروم دیتے ہیں جو مریض کی ”میں“ سے پھونک نکل دے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسی رات خانماں کھانا لے آیا تو کہنے لگا۔ ”بیکم صاحبہ ڈاکٹر خالد کبھی ہو شل میں نہیں

آئے تھے۔ آج پہلی مرتبہ انہیں ہوشل میں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا۔“ خانمیں کی بات سن کر میری ”میں“ میں پھونک اور بندھ گئی۔

اگلے روز شام کو وہ پھر آگیا۔

میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر آپ شادی شدہ ہیں کیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگا۔ ”میں لیڈی ڈاکٹر سے شادی کروں گا۔ ہمارے طریق علاج کو اپنالے۔“

میں نے اسے چھیڑا۔ ”اور اپنی ”میں“ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر آپ کو بھینٹ کر دے۔“

”نہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں اپنی ”میں“ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر اسے پیش کروں۔ وہ اسے قبول کر لے مجھ سے۔“ وہ بولا۔ ”محبت کیا ہے؟ اپنی دل سرنڈر کر دینا۔ اپنی ”میں“ دوسرے کے تابع کر دینا۔“

”ساری دنیا محبت کرتی ہے۔“ میں نے طعنا ”کہا۔“ لیکن.....“

”وہ محبت نہیں ہوتی۔ خواہش ہوتی ہے۔ حرص ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر محبوب سے نہیں بلکہ اپنی انا سے محبت ہوتی ہے۔ محبوب تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایک پردہ ہوتا ہے۔ ایک ڈیلوژن۔ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ نے سلمان سے محبت کی ہے۔ اگر آپ بچے دل سے سلمان سے محبت کرتیں تو دو رخی مدت سے ختم ہو چکی ہوتی۔ آپ کو تیاگ میں آنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔“

پھر دفعتاً اس نے موضوع بدلا۔ کہنے لگا۔ ”صبح کے وقت آپ کیا کرتی ہیں؟“ کلینک میں آجایا کیجئے۔ مریضوں کی کیس، سسٹریاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ دلچسپ اور بصیرت افروز۔“ اگلے روز میں کلینک میں جا بیٹھی۔ ڈاکٹر خالد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن اس نے اظہار نہ کیا۔ کہنے لگا۔ ”آج ایک ہی مریض ہے۔ بہت دور سے آیا ہے۔ بہت بڑا عابد ہے۔“

”کیا تکلیف ہے اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔“ بولا۔ ”ابھی آکر آپ کے سامنے بیان کرے گا۔“

عین اسی وقت ایک پارلش فورلانی شخص کمرے میں داخل ہوا۔ ”اسلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”تشریف رکھئے۔ فرمائیے آپ کس طرح تشریف

لائے ہیں؟“

بوڑھے نے باطنی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

”یہ میری اسٹنٹ ہیں۔“ ڈاکٹر خالد نے کہا۔

یہ سن کر بوڑھا مطمئن ہو گیا۔

”فرمائیے؟“ ڈاکٹر نے کہا۔

بوڑھے نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ ”میری آپ جتنی بہت مختصر ہے۔“

”جی فرمائیے۔“ خالد بولا۔

”میں نے گزشتہ بیس سال تھلے میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کی ہے۔ بیس سال۔“ اس کی

آواز جذبات کی شدت سے کانپی۔ وہ رک گیا۔ کمرے میں گہری بو جھل خاموشی چھا گئی۔

صدیاں گزر گئیں..... لیکن..... اس کی آواز پھر گونجی۔

”لیکن..... میں آج تک اللہ کو نہیں مان پایا۔ کوشش کے باوجود نہیں مان پایا۔ میں

اس کے وجود کو دل سے قبول نہیں کر سکا۔“ کمرے میں پھر سے بو جھل خاموشی چھا گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پتھر دے مارا ہو۔ میری آنکھوں میں تارے ناپے

اور پھر گھپ اندھرا چھا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ بوڑھا جا چکا تھا اور خالد سر جھکائے بیٹھا

ہے۔

”ڈاکٹر خالد۔“ میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ بولا۔ ”فرمائیے۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ بولا۔

”میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔“

”میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔“ ڈاکٹر خالد نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم حلف لئے بغیر آپ کا علاج کریں گے۔“

میں اٹھ بیٹھی۔ ”شکریہ۔ ڈاکٹر۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”تو کیا آپ علاج نہیں کرائیں گی؟“

”نہیں۔“ میں دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی ہوئی۔ ”اگر اپنی دل ہی سرنڈر کرنا ہے تو

میں اس کی بھینٹ کیوں نہ کروں جس کے پردے میں میں نے دو سال ٹوٹ کر اپنی انا سے محبت

کی ہے۔ خدا حافظ ڈاکٹر۔“

کہانی کی تلاش

تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا تو میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔
 سڑک کنارے ایک تھڑے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔
 مجھے اس کا ساتھ پسند نہیں۔ بڑا کتہ چین ہے۔ بات بات پر ٹوکتا ہے۔ لیکن وہ میری
 مجبوری ہے۔ میں اس سے چچھا چھڑا نہیں سکتا۔
 میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ پاکستان کا حسین ترین شہر اسلام آباد میرے ارد گرد
 پھیلا ہوا تھا۔ کیوں نا اسلام آباد پر ایک کہانی لکھوں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔
 ”اونہوں۔“ وہ بولا۔ ”یہ ہمارا شہر نہیں ہے۔“
 ”کیوں؟“ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔
 ”اس میں اینوں کا رنگ نہیں ہے۔ بیگانہ ہے۔“
 ”اسلامی مملکت کا دار الخلافہ ہے بھی۔“
 ”صرف نام کا اسلامی ہے۔ مساوات کا پیری ہے۔“
 ”ذلت پات کا شوقین ہے۔ اونچ نیچ کا مارا ہوا۔“
 ”کون سی ذلت پات؟“ میں نے پوچھا۔
 ”عبدال کی۔ گریڈوں کی۔ تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکتے۔“
 ”کہانی تو انہوں کی ہوتی ہے۔ بے گانوں کی نہیں۔“
 میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔
 دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔
 میری مشکل یہ ہے کہ جب تک مرکزی خیال نہ ہو، میں کہانی نہیں لکھ سکتا اگر

کہانی کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تو کیا فائدہ۔ گوئی کہانی کو کوئی کیا کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ
 کہانی جیج کر نہ بولے۔ لب نہ کھولے۔ آنکھ سے بولے۔ آنکھ نال گل کر گئی۔
 کئی ایک دن سے میں کہانی کی تلاش میں تھا۔ کیا لکھوں۔ کس موضوع پر لکھوں۔
 ایسی بین بجاؤں کہ سانپ نکل آئے۔
 وہ ہنسا بولا۔ ”بغل میں کٹورہ۔“
 ”کہاں ہے کٹورہ؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم اس موضوع پر کیوں نہیں لکھتے؟ سارے لکھاڑ
 اس پر لکھتے ہیں۔ آج کا دور کامن بھاتا، روضہ ہے۔ آج کے بولنے پر لگا ہوا پھل ہے۔“
 میں نے سڑک دیکھا۔ درختوں کے پیچھے کچی آبادی تھی۔ انتظامیہ نے اسے درختوں
 اور دیواروں کے پیچھے چھپا رکھا تھا تاکہ دودھ میں کمی کوئی دیکھ نہ لے۔
 میں سڑک کے نیچے اتر گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے دیکھا۔ وہاں میں تیس جھونپڑے
 تھے۔ دو رویہ مکانوں کے درمیان میں کھلا میدان تھا۔ میدان میں یہاں وہاں چارپائیاں بچھی
 ہوئی تھیں۔ تو لوگ بیٹھے تھے۔ حقے چل رہے تھے۔ بچے چارپائیوں کے ارد گرد دوڑ رہے
 تھے، جیج رہے تھے، چلا رہے تھے۔ عورتیں اوپن ایئر پلورچی خانوں میں چولہوں پر ہانڈیاں
 چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ چل رہے تھے۔ چوڑیاں جھنک رہی تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں۔
 ”ارے پلو جی۔“ قریب ہی سے آواز آئی۔ دیکھا تو پاس ہی ایک بڑھا بیٹھا جوتے
 گانٹھ رہا تھا۔

”کس سے ملتا ہے؟“ مجھے اس نے پوچھا۔

”کسی سے بھی نہیں۔“

”پھر کیا دیکھ رہا ہے تو؟“

”دیکھ رہا ہوں، کتنی غربت ہے۔ کتنا دکھ ہے۔“

”کہاں ہے دکھ؟“ وہ بولا۔ ”یہاں تو میلہ لگا ہوا ہے۔ پلو جا۔ سارے اسلام آباد کا
 چکر لگا۔ گھوم پھر کے دیکھ۔ کہیں بھی ایسا میلہ نہیں لگا ہو گا۔ سب کمروں میں بند ہیں۔ نہ
 بول نہ ہلارہ۔ بوسے بند۔ ہونٹ بند۔ دل بند۔“

اور پلو یہ کچی آبادی جو تو دیکھ رہا ہے۔ یہ آبادی نہیں ہے۔ یہ تو ایک کتبہ ہے۔
 ایک کو بیڑا ہوئے ہے تو دوجا درد سے ہائے ہائے کرے ہے۔ ایک کا چولہا نہیں جلتے ہے تو
 دوجا ہانڈی میں ایک منہ اور دال ڈال لے ہے۔ تو غربت کو کیا سمجھے ہے پلو۔ غربت میں

لوگ اک دوپے کے بیڑے آجائیں ہیں۔ امارت میں دور مٹ جاویں ہیں۔
اور تجھے پتہ ہے یاہو۔ پاکستان پر کیا چٹا پڑی ہوئی ہے۔ ہمیں جسے کی ضرورت تھی۔
اس سے زیادہ مل گیا ہے۔ زیادہ مل جائے تو شر جاگ اٹھتے ہیں۔ فساد کے بلبلے پیدا ہو جاویں
ہیں۔

”تو مسلمان ہے کیا؟“ بڑھے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پھر تو اس کو جانتا ہے؟“

”کس کو؟“

”وہ جو سب سے بڑا بندہ تھا۔ جو اللہ کا پیارا تھا۔ اللہ نے کہا میرے پیارے بندے۔
بول تو کیا چاہتا ہے۔ تو جو مانگے گا ملے گا۔ جو چاہے گا ہو گا۔ بتا امارت میں رہنا چاہے گا یا
غربت میں۔ اس نے غربت مانگ لی۔ غربت میں کوئی صفت ہوگی تو اس نے غربت مانگی۔“

باپس ہو کر میں پھر چل پڑا۔

کمانی ڈھونڈ میرے سر پر جنون بن کر سوار تھی۔

چلتے چلتے میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔

میرے سامنے وہ کھڑی تھی۔

گلاب کا ایک بوٹا اوپر ایک ڈوڈی۔ ادھ کھلی، ادھ بند۔ ادھ گلابی، ادھ ہری۔

ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔

انگلیوں سے سیگنٹیک لہریں نکل رہی تھیں۔

”آؤ۔“ وہ بولی۔ ”میں ہوں وہ کمانی جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔“

”لو نموں۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔“ میرے ساتھی زیر لبی میں بولا۔ ”اس کی کمانی تو تم

سالہا سال سے لکھ رہے ہو۔“

”میری کمانی۔“ وہ بولی۔ ”بھئی لکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کب سے لکھ رہے ہیں

لیکن کوئی لکھ نہیں پایا۔“

اگر میری کمانی لکھی جاتی تو آج میں صرف آرائش و زیبائش نہ سمجھی جاتی۔ میری

مثبتیت دیکھن تک محدود نہ ہوتی۔ تیرے بھائی بند مجھے خوش وقتی نہ سمجھتے۔“

اس نے ایک سرو آہ بھری۔ مجھے سب باہر سے دیکھتے ہیں۔ کسی نے میرے اندر

جھانک کر نہیں دیکھا۔ کسی نے مجھے نہیں جانا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک خاموشی چھائی

رہی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”میں تجھے جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”تو ایلی ہے نا۔ میں ایلی ہوں۔ سنا تو نے۔ میں
ایلی ہوں۔“

اس نے ایک پوز بنایا اور یوں کھڑی ہو گئی جیسے مٹھاس کی اک پھوار ہو۔

مجھے ایسا لگا جیسے ورق میں لپٹی ہوئی مصری کی ڈال ہو۔ جی میں آیا کہ منہ میں ڈال کر

چوس جاؤں۔

دفعتاً میرا ساتھی بولا۔ ”ہوش کر۔ میرا تو منہ ہی نہیں۔ جب تھا، تب جرات نہ

تھی۔ اب خالی جرات کا جھنجھٹا بجانے سے فائدہ؟“

”دیکھا۔“ وہ بولی۔ ”مجھ میں دونوں روپ ہیں۔ دیوی بھی ہوں، ناری بھی ہوں۔

انگوروں سے جسم بھی کر سکتی ہوں۔ سوکھے کو ہرا بھرا بھی کر سکتی ہوں۔ میں تیری کمانی
ہوں۔“

میرے ہوتے ہوئے تو کسی اور پر کمانی نہیں لکھ سکتا۔

بل لکھوں گا تجھ پر کمانی۔“ میں نے کہا۔

”رک جا۔“ میرا ساتھی بولا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔

”بے شک۔ یہ رنگ رس بھری کمانی ہے لیکن یہ ایسی کمانی ہے جسے صرف جیتا جا

سکتا ہے، لکھا نہیں جا سکتا۔ تو بیٹنے میں کھو جائے گا، لکھنے کا ہوش نہیں رہے گا۔“

شام پڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ مدھم اداسی، مٹھی اداسی۔

ایسے لگتا ہے جیسے شام نے بل بکھیر رکھے ہوں۔ چراستا ہوا ہو۔ انتظار۔ باپوسی بھرا انتظار۔

راگ و دھیا والوں نے شام کے راگ میں آگ لگا رکھی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ تو

بڑے سیانے ہیں۔ پر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شام آگ نہیں، سلگن ہے۔ مدھم سلگن جیسے

دیئے میں تیل نہ رہا۔ سوکھی جی سلگ رہی ہو۔“

دکن میں اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک جی سلگ رہی تھی۔ وہ تجوری کھولے بیٹھا

گن رہا تھا۔

میرا ساتھی بولا۔ ”رک جاؤ۔ اس سیٹھ کو دیکھ رہے ہو نا۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اس پر کبھی کمانی نہیں لکھی۔“

”اس کی کوئی کمانی ہو تو لکھوں۔“

”بھی لکھتے ہیں۔“

”ہاں لکھتے ہیں پر وہ کہانی نہیں ہوتی۔ غم و غصے کا اظہار کہانی نہیں ہوتی۔ کہانی نعرے نہیں لگاتی۔ اودھم نہیں مچاتی۔ اشتعال پر نہیں ابھارتی۔ مزاحمت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی۔ کہانی تو اک چھوٹا سا چشمہ ہوتی ہے۔ جو دھرتی سے ابلتا نہیں۔ رستا ہے۔ بوند بوند رستا ہے۔ ہمدردی کا چشمہ۔ دکھ بھرے لگاؤ کا چشمہ۔ بھگ، ہی بھگ۔“

”جھوٹ بولتے ہو۔“ اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”تمہاری کسی کہانی میں بھگ نہیں ہوتی۔ سوکھی کاٹھ۔“

”سچ کہتے ہو۔ میں اپنی کسی کہانی میں بھگ پیدا نہ کر سکا۔ قاری کو بھگو نہ سکا۔ لاکھ کوششیں کیں پر بات نہ بنی۔ بیسیوں لکھیں پر کہانی نہ لکھ سکا۔“

”جھک مارتے رہے۔“ وہ بولا۔

”میں جھک نہیں مارا۔“

”تو پھر.....“

”چٹکیلی باتیں کرتا رہا۔ دکھلوے کی باتیں۔ توجہ طلبی کی باتیں۔ پھلجھڑیاں چلاتا رہا۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔“

”اپنی ڈگڈگی بجاتا رہا نہ کہانی اپنی بات نہیں ہوتی۔“ وہ بولا۔ ”دوجوں کی بات ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی بات کرنے سے کبھی نہیں آگئے؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”اب بھی تو کہانی کے پردے میں تم اپنی بات کر رہے ہو۔ سیٹھ کی بات کیوں نہیں کرتے۔“

”کیوں کہتے ہو کہ اس میں کوئی کہانی نہیں ہے۔“

”یہ تو دولت کا قیدی ہے۔ دولت نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اس بے چارے میں تو میں بھی نہیں رہی۔ دل کی جگہ پیسہ ٹک ٹک کر رہا ہے۔ دنیا سے بھی گید۔ خود سے بھی گید۔ بے چارہ مظلوم۔“

”اس کی مظلومیت پر کہانی لکھو۔“

”نہ نہ نہ نہ۔“

”کیوں۔ کیا لکھ نہیں سکتے؟“

”لکھ سکتا ہوں۔“

”پھر لکھتے کیوں نہیں؟“

”کس سے ڈرتے ہو؟“

”ان سے ڈرتا ہوں جو اسے ظالم سمجھے ہیں۔“

”کھڑاک سے دکان کا دروازہ بند ہو گیا۔“

”وہ دیکھ۔ وہ.....“ وہ چلایا۔ ”تیرا موضوع۔“

میں نے سراٹھایا۔ سامنے دربار جھل جھل کر رہا تھا۔

”نہیں۔“ میں نے زیر لب کہا۔ ”یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ یہ داتا لوگ ہیں۔“

”بزرگ ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ یہ چوتھی سمت میں جیتے ہیں۔ زیادہ دیکھتے ہیں۔ زیادہ سنتے ہیں۔ زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ زباں اور منہ سے بے نیاز ہیں۔ ان کا میں احترام کرتا ہوں لیکن میں ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں میں منہ کھولوں نہ نہ نہ بھائی۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔“

”تم داتا کو کیوں دیکھتے ہو؟ بزرگ کو کیوں دیکھتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”کرامتوں کو کیوں دیکھتے ہو؟ مجھوں کو کیوں دیکھتے ہو؟“

تم اس بندے کو کیوں نہیں دیکھتے جو داتا کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ جو اتنا عظیم تھا کہ اس نے داتا کا مرتبہ پایا۔“

”سب داتاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ سرکار قبلوں کی باتیں کرتے ہیں۔ باباؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ کرامتوں کے چھنکتے چھنکاتے ہیں۔ اس عظیم بندے کی بات تو کوئی نہیں کرتا۔ جس نے انہیں پایا بنا دیا۔ سرکار قبلہ بنا دیا۔ سلطان الہند بنا دیا۔ داتا بنا دیا۔ تو اس بندے کی بات کیوں نہیں کرتا؟“ اس کی آواز میں غصہ کھول رہا تھا۔

ہم دونوں درگاہ میں داخل ہو چکے تھے۔

ہمیں دیکھ کر درگاہ کا متولی بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”وہ بندہ تو ایک ہی ہے۔ ایک ہی ہے جسے دو جہانوں کا مالک بنا دیا گیا۔ پر وہ بندہ بن کر جیا۔ صرف بندہ بنکر نہ پایا بنا نہ سرکار قبلہ بنا۔ نہ داتا بنا نہ کرامتہ بنا نہ معجزاتی بنا۔ صرف بندہ۔“ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ ”گنبد چلایا۔“

”صرف بندہ۔ صرف بندہ۔“ باہر سے یوں آواز آئی جیسے آسمانوں میں گنبد کی آواز کی گونج تھر تھرا رہی ہو۔

ساری کائنات اس گونج سے بھری ہوئی تھی۔ ”صرف بندہ۔ صرف بندہ۔“

جگن جو تٹی کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس گاہک سے کیسے بننا جائے۔ اس نے سوچا کہ کنفیوژڈ آدمی ہے۔ اسے مزید کنفیوژڈ کر دوں تو شاید بات بن جائے۔ بولا۔ ”پہلے یہ بتا کہ تیرے دیکھن میں خرابی ہے یا اس کے دیکھن میں۔“

”نہ نہ۔“ بنواری نے کہا۔ ”میرے دیکھن میں تو خرابی نہیں۔ میں عینک لگا کر نہیں دیکھتا۔ سارا جھگڑا زبانی کے دیکھن کا ہے۔“

جگن بولا۔ ”بھائی میرے دیکھن اور دیکھن کچھڑی سان نہیں ہوتے کہ دال الگ کر لو اور چاول الگ۔ وہ تو شرمٹ سان ہوتے ہیں۔ مینھا اور پانی یوں گھل مل جاتے ہیں کہ الگ نہیں ہو سکتے۔“ جگن نے اسے کنفیوژڈ تو کیا مگر ساتھ بھلایا بھی۔ جسے ہر جو تٹی پر گاہک کو بھلاتا لازم ہوتا ہے۔ آخر میں جگن بولا۔ ”تجھے ایسی عورت ضرور ملے گی جو دیکسی ہی ہوگی جیسے دیکھے گی اور تم دونوں ہنسی خوشی دن گزارو گے۔“

”کب ملے گی؟“ وہ بولا۔ ”میں تو پانچ سال سے گلیوں اور محلوں میں دوہرہ ہو رہا ہوں لیکن آج تک نہیں ملی۔“

”مل جائے گی۔ جلدی مل جائے گی۔“ جگن بولا۔ ”پر تو دوہرہ کیوں ہوتا ہے؟ یہاں آ بیٹھا کہ یہاں عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔“

”اچھا۔“ بنواری بولا۔ ”پر یہاں بیٹھ کر کروں گا کیا؟“

”گھرنا کیا ہے۔ دوہرہ ہو کر نہیں بیٹھ کر ڈھونڈ۔ میرا بالکا بن جا۔ جو عورت آئے اس کا انڈیو کر۔ اسے پوچھ کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ پھر اس کی پرچی بنا دے اور میں صرف اسے طوں گا جس کے ہاتھ میں تیری دی ہوئی پرچی ہوگی۔“

بنواری کی باچیس کھل گئیں۔

جگن نے بات پکی کرنے کے لئے کہا۔ ”اور جس روز تجھے وہ مل جائے، بے شک لے جانا۔“

”بول۔ تیری فیس کیا ہے؟“ بنواری نے پوچھا۔

”اونوں۔“ جگن بولا۔ ”بھئی بالکے سے بھی فیس لیا کرتے ہیں؟“

عجیب آدمی ہے۔ بنواری۔ جگن نے سوچا۔ پر یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جگن بنواری کے قریب جا بیٹھا۔ بولا۔ ”کس سوچ میں پڑا ہے تو؟“ بنواری نے ٹھنڈی آہ بھری۔

بولا۔ ”اپنے نصیب میں تو سوچیں ہیں۔“

”کیوں؟ کیا پیسے کی تنگی ہے؟“

دیکھن دیکھن

لڑکیوں کا آخری ٹولہ کنیا سے نکلا۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے کتر کتر کر باتیں کر رہی تھیں۔ شوخیان کر رہی تھیں۔ فضا ان کے قدموں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھیں۔ لگتا تھا جیسے دکھ درد سے قطعی طور پر بلا توف ہوں۔ لیکن جب وہ باری باری ہاتھ دکھانے کے لئے اکیلے میں جگن جو تٹی سے ملتی تھیں، تو دکھ سے بھیگی ہو تھیں۔

ایک آہ بھر کر کہتی۔ ”جو تٹی جی۔ دیکھو تو میرا بیاہ ہو گیا زندگی یونی اکیلے میں بسر ہو گی۔“ دوسری کہتی۔ ”کیا وہ مجھے مل جائے گا جسے میں چاہتی ہوں۔“ کوئی اپنے مجازی خدا کی بے وفائی کی کٹھنا سنا۔ کوئی ظالم سبز کا رونا روتی۔ کوئی سخت ماں باپ کا۔

جگن جو تٹی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مل بیٹھنے میں تو زندگی شوخی سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے۔ سوچتے سوچتے وہ کنیا سے باہر نکل آیا۔

سامنے پنج پر بنواری بیٹھا تھا۔ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے، گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔ اسے یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ تو جذبے کا غلام ہے۔ اسے سوچ سے کیا واسطہ۔

پندرہ بیس دنوں کی بات ہے کہ بنواری اپنی قسمت کا حل جاننے کے لئے جگن جو تٹی کی کنیا میں آیا تھا۔ اس نے ایک انوکھا سوال پوچھا تھا۔ کہنے لگا۔ ”جو تٹی جی۔ میرا ہاتھ دیکھ کر یہ بتاؤ کہ مجھے کوئی ایسی زبانی ملے گی جو جیسی دکھتی ہو، ویسی ہی ہو۔ میں اس زبانی کی ڈھونڈ میں ہوں۔“ اس سوال پر جگن حیران ہوا۔ ایسی بات تو کسی نے کبھی پوچھی نہ تھی۔ جگن نے غور سے بنواری کا جائزہ لیا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ لیکن اس کا حسن پوری طرح سے دکھتا نہ تھا۔ بن ٹھن سے بے نیاز، منہ ہن دھلا، بل بکھرے ہوئے۔ موٹا لباس۔

”ارے یہی تو ہوا۔“ بنواری نے جواب دیا۔ ”وہ زلف نائک میں جیتی تھی۔ جب جب نائک چلاتا۔ وہ اٹھتی بیٹھتی۔ چلتی پھرتی۔ بولتی چلتی تھی۔ نائک ختم ہو جاتا تو ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو جاتی۔ پر جو تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں سمجھا کہ جو لڑکی نائک میں کماری بنتی ہے، وہی کماری ہے۔ بس جی اس کے مکان کے پھیرے لیتا رہا۔ بڑا کچل ہوا۔“ بنواری چپ ہو گیا۔ دیر تک وہ بیٹی ہوئی باتوں کو پھر سے بتاتا رہا۔

جگن سمجھ گیا کہ بنواری پھوڑا بنا بیٹھا ہے۔ اسے چھیڑنا اچھا نہیں۔ جگن خود زخم خوردہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جوانی کی بھول کا زخم زندگی بھر رستا رہتا ہے۔ اس لئے وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔

پھر بنواری نے سر اٹھایا۔ آہ بھر کر بولا۔

”اگر وہ مجھے نہ ملتی تو اچھا ہوتا۔ ملی تو ایک ہی نظر میں پتہ چل گیا کہ وہ تو رنڈی ہے، کماری نہیں، اور رنڈی بھی دو ٹکے والی۔ مردار جس کے پنڈے پر گدھوں کی چونچوں کے نشان تھے۔ بس سمجھ میں آیا کہ کماری وار ہے روزی اور ہے اور کماری تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ اسے کیسے ڈھونڈوں؟“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

نیلے کے ارد گرد کی بٹیاں بھگ گئی تھیں۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ رات نے اپنا کالا تہو تان لیا تھا۔ مل روڈ کی فیشن پر پتہ ختم ہو چکی تھی۔

صدیاں بیت گئیں۔ وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر بنواری نے سر اٹھایا اور اپنی ہی لگن میں گنگنائے لگا۔ پھر آہ بھر کر بولا۔ ”نائک میں کماری اک گیت گایا کرتی تھی۔“

”کاکھ لے گھر جاؤں“

وہ اپنی بھدی مگر بھٹی آواز میں کھڑے کو گنگنائتا رہا۔ بس یہ گیت جب وہ گاتی تو سمجھو میں مر جاتا تھا۔ روز نائک دیکھتا۔ روز مرتا۔ پھر اک دن نائک یہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے مجھے یہ بول دے گیا۔ دو سال میں یہ بول گنگنائتا پھرا۔ پاگلوں کی طرح گلیوں میں۔ ایک دن جب میں تھک کر بنگلے کی ایک کھڑکی کے نیچے سستا رہا تھا تو کیا سنتا ہوں کہ بنگلے میں کوئی یہی بول گنگنائتا رہی ہے۔ سن کر میں تو پاگل ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کماری میں جان پڑ گئی ہو۔

بنگلے کے چوکیدار سے ملا۔ پتہ چلا کہ بنگلے میں کوئی وڈیرا اور اس کی بیگم رہتے ہیں۔ میں نے چوکیدار کی منتیں کی کہ ایک بار مجھے بیگم سے ملا دے۔ وہ نہ مانا۔ پھر میں نے اس کی مٹی گرم کی اور وہ مان گیا۔

”نہیں جو تھی پیشہ تو بنواری کے ہاتھ کا میل ہے۔ جتنا چاہوں کمالوں۔ کل رات تین سو کمیا تھا۔“

”کیا کام کرتا ہے تو؟“

”چھاڑی لگاتا ہوں۔ دو گھنٹے میں سارا مال بک جاتا ہے۔ چاہے جتنا بتاؤں۔ اللہ کا کچھ ایسا کرم ہے۔ کہ گاہک انتظار کرتے ہیں کہ کب بنواری چھاڑی لگائے۔“

”کیا بتاتا ہے تو؟“ جگن نے پوچھا۔

”پہلے کلفی بتاتا تھا۔ پھر ایک رات خواب میں ایک بابا کو دیکھا۔ بابا نے کہا۔ دیکھ بنواری۔ وہ چیز نہ بنا جس کی ٹانگ گھٹ رہی ہے۔ وہ بنا جو فیشن میں ہے۔ میں نے کہا۔ کیا بتاؤں؟ بابا بولا۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا۔“

”پھر پتہ لگا کیا؟“ جگن نے پوچھا۔

بنواری بولا۔ ”اگلے دن جی اواس تھا۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ مل ٹپ کا ہوٹل کا دیرا ادھر سے گزرا تو میں نے کہا۔ یار کچھ کھانے کو بھیج لڑکے کے ہاتھ۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہے۔ آج۔ تو اس نے برگر بھیج دی۔ اسے کھانے لگا تو بابا کی بات یاد آگئی۔ فٹ سے اسے کھول کر دیکھا کہ کیا کیا مصالحہ پڑا ہے اس میں۔ پھر ایک ہفتہ برگر بتاتا رہا آزمائے کے لئے۔ پہلے روز چھاڑی لگائی تو گوروں کے بچوں نے بھیج لگا دی۔ ہوٹل والے 20 روپے لیتے تھے۔ میں نے دس لگا دیا۔ جو تھی۔ پیسے کے معاملے میں اللہ نے مجھے دین دے رکھی ہے کہ جتنا چاہے کمالے۔ پر کمائی کا فیہ۔ جب گھر ہی نہ بنا تو کمائی کس کام کی؟“

”پر تو اتنا مایوس کیوں ہے؟“ جگن نے پوچھا۔

”تجھے نہیں پتہ جو تھی کہ میں وہ بوٹ ہوں جو آبلے سے گر پڑا ہے۔ اور جو آبلے سے گرا، وہ سدا رلے گا۔“

”یہ پسلیاں کیوں بھجوا رہا ہے مجھ سے؟ مجھے بتا کہ تیرے ساتھ کیا بیٹی؟“

”کیا بتاؤں جو تھی۔ پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ یوں سمجھ لے کہ پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی۔ اب جو اس پر بیٹا رہا تو وہ ٹیڑھا ہی ہو گا۔“

”تجھے محبت ہو گئی کیا؟“ جو تھی نے پوچھا۔

”ہاں۔ بری طرح گھائل ہوا۔ پر میری بد قسمتی۔ کسی جیتی جاگتی زلفی سے گھائل ہوتا نوپٹ لیتا، کسی ناکسی طرح پر وہ زلفی تو وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔“

”ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ جگن بولا۔

بیگم باہر دروازہ پر آگئی۔ غصے میں بولی۔ کون ہے تو اور کیا چاہتا ہے؟ میں نے کہا۔ بیگم صاحبہ۔ غصہ نہ کھائیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ابھی ابھی جو گیت آپ گنگنا رہی تھیں، میں اس گیت کا دیوانہ ہوں۔
”پھر میں کیا کروں؟“ وہ غصے سے بولی۔

جو تو کبھی کبھی یہ بول گنگنا دیا کرے تو میرا جیون سچل ہو جائے۔ غصے میں لوٹ جانے کے لئے مڑی تو میں نے منت کی۔ میں نے کہا۔ دیکھ میں بچنے میں نہیں آؤں گا۔ باہر کھڑی تیلے بیٹھ کر سن لیا کروں گا۔ تیری مہربانی ہوگی۔ تو صرف اک بار گنگنا دیا کر روز کے روز۔ حسہ نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ اس کا نام حسہ تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں نے اس کی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر گزار دیا۔ لیکن اس نے مجھے گھاس نہ ڈالی۔
”بنواری نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولا۔ ”پھر اسے مجھ پر ترس آگیا۔ ایک روز وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور ”کا کھ لے گھر جاؤں“ گنگنانے لگی۔ اتنا بیگ کر گیا کہ میرا دل ڈوب گیا۔

پھر یوں ہوا کہ جب بھی میں وہاں پہنچتا کھڑکی بجا دیتا اور وہ گیت سنا دیتی۔ پھر وہ کھڑکی کھول کر مجھ سے باتیں کرنے لگی اور ایک دن جب وڈیرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا، اس نے مجھے اندر بلایا۔ باتیں کرتی رہی۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ وہ بیگم نہیں ہے۔ وڈیرے نے اسے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ مجھے اس پر برا ترس آیا۔ جی چاہا کہ اسے کچھ بولوں۔ دو دن شہر میں گھوم پھر کر میں نے اس کے لئے ایک ہار خرید لیا۔

ہار کو دیکھ کر حسہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولی۔ ”نہ بنواری۔ تو تو ایسے نہ کر جیسے دوسرے مرد کرتے ہیں۔ تو پہلا مرد ہے جس نے مجھے دیکھا نہیں، محسوس کیا ہے۔ جانا ہے۔ تو نے اس حسہ کو جانا ہے جسے کسی مرد نے بھی نہیں جانا تھا۔ تو نے تو مجھے یہ بات بھلا دی ہے کہ میں بکاؤ مال ہوں۔ تو مجھے تجھے دیتا اچھا نہیں لگتا۔“

”جو تھی۔“ بنواری بولا۔ ”دو مہینے ہم ملتے رہے۔ روز کے روز۔ وہ بھی کیا دن تھے۔“ آہ بھر کر پھر خاموش ہو گیا۔

ایک دن وہ بڑے پیار سے کہنے لگی۔ ”بنواری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ تجھے مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ نظر آتا ہی ہے تو ٹار ہو رہا ہوں۔“

بولی۔ ”دیکھ بنواری۔ میں وہ نہیں ہوں جو تجھے دکھتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں ہے وہ تو بولی۔“ ”صرف میں ہی نہیں، کوئی عورت بھی وہ نہیں ہے جو دکھتی ہے۔“
”پر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ کیوں۔ عورت دکھن پر مجبور ہے۔ کوئی اس کے اندر لٹھ لئے بیٹھا ہے۔ کتا ہے دکھ۔ اکتائی ہوئی بیٹھی خود کو نہ دکھانا چاہئے۔ پھر بھی دکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے اور اکیلی بیٹھی ہو تو بھی ذہن دہشتی ہونٹوں پر مسکن آ جاتی ہے۔“
پھر جب وہ آخری بار مجھ سے ملی تو کہنے لگی۔ ”بنواری۔ تو واحد مرد ہے جو مرد میں کر مجھ سے نہیں ملا۔ مجھے دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں ڈالا۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھ حسہ۔“ میں نے اس روز پہلی بار اسے حسہ کہہ کر بلایا تھا۔ ”حسہ میں نے کبھی تجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تیرے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے جیسے میرے قریب کوئی ہے۔ کوئی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ گھر پر بھی جب میں بیٹھتا ہوں تو تو ساتھ ہوتی ہے۔ میں تو کبھی اکیلا نہیں ہوا ان دنوں۔“ جواب میں وہ بولی۔ ”بنواری تو تو میری ہڈیوں میں بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں میں تیرے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر تو دیکھن دکھن کا چکر چلا دیتا تو میری ہڈیوں میں نہ بیٹھتا۔“

مجھے نہیں پتہ تھا کہ حسہ آخری بار مجھ سے مل رہی ہے۔ ”بنواری نے آہ بھر کر کہا۔ ”اگلے روز میں بچنے پر گیا تو بنگلہ خالی پڑا تھا۔ پھر آوارہ پھرتے پھرتے میں تیرے پاس آیا۔ میں نے سوچا۔ چلو جو نشی سے پوچھ دیکھو۔ تو نے میرا حوصلہ بندھایا کہ وہ ضرور ملے گی۔ تو میں اس کی دھونی راکر یہاں بیٹھ گیا۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

دفعۃً ”جگن چلایا۔“ ”نہیں نہیں۔ نہیں نہیں۔“ جیسے اسے کسی نے ذہن دہشتی بولنے پر مجبور کر دیا ہو۔ بنواری چونکا۔ ”کیا نہیں؟“

”میں بھی وہ نہیں۔“ جگن بولا۔ ”جو تجھے دکھتا ہوں۔ میں جو تھی نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ میں نے جو تھی کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ میں تو لوگوں کو وہ کچھ بتاتا ہوں جو وہ سننا چاہتے ہیں۔ تیرا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ تجھے ضرور ملے گی۔“ یہ سن کر بنواری کو دھچکا لگا۔
”جو یہ بات ہے تو میں یہاں کس آس پر بیٹھا ہوں۔“

نہ تو۔ نہ دکھ نہ سکھ۔ نہ روشنی نہ اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں رہتا۔ صرف وہ رہ جاتا ہے صرف وہ۔“ جگن کی بات سن کر بنواری کی گردن لٹک گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ کچھ بھی نہیں۔

عین اس وقت روشنی کی ایک کرن چمکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نارنج تھی۔

بچکے کا چوکیدار بنواری کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بولا۔ ”یہ تجھے شام سے ڈھونڈ رہی ہے۔“

حسنہ بنواری کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بولی۔ ”بنواری میں آگئی۔ آئے بغیر رہا نہ گیا۔ مجبور ہو گئی۔ اب تو جان نہ جان۔“ وہ بچ پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ نہ چل۔“

”کیوں؟“ بنواری نے پوچھا۔

حسنہ نے اپنا سر بنواری کے کندھے پر رکھ دیا اور گتھلنے لگی۔

”کاکھ لے گھر جاؤں“

اس کی آواز میں اتنی بھینگ تھی کہ یوں لگا جیسے نیلے پر بوندیاں برس رہی ہوں۔

”میں بھی خود سے یہی سوال پوچھا کرتا ہوں کہ جگن جی تم یہاں کس آس پر بیٹھے ہو؟“ جگن نے کہا۔ ”مجھے اس سوال کا بھی جواب نہیں ملا۔ لگتا ہے ہم سب آس کی دھونی روائے بیٹھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس دھونیں سے کچھ برآمد نہیں ہو گا۔ پھر بھی بیٹھے ہیں۔“ جگن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی کہانی سناتے لگا۔ بولا ”بنواری میں بھی دکھن د۔ لیکن کا مارا ہوا ہوں۔“

اسے دیکھتے ہی تن من دھن سے اس کا ہو گیا۔ وہ بھی میری ہو گئی۔ ہم روز ملتے تھے۔ ایک سال بعد اس نے میری بات مان لی۔ وہ میری ہو گئی۔ ہم نے بیاہ کر لیا۔ ایک سال ہم اکٹھے رہے یوں جیسے دو بچے مل کر کھیلتے ہیں۔ پھر ایک دن وہ مجھے چھوڑ کر دو بجے کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے ایک رقعہ چھوڑ گئی۔ لکھا تھا:

اب میں نے جانتا ہے کہ تو ”وہ“ نہیں ہے جو دکھتا ہے۔ میں نے د۔ لیکن میں بھول کی۔ میں جا رہی ہوں۔ میرا پیچھا نہ کرنا۔ ”جگن خاموش ہو گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر جگن نے بات شروع کی۔ بولا۔ ”ماں نے کہا۔ بیٹے میں تیرا دو جا بیاہن کر دیتی ہوں۔ گھر بسا کر بیٹھ جا۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں ماں۔ میرا دل ٹھکانے پر نہیں رہا۔ مجھے جانے دو۔ آوارہ پھروں کا تو شاید دل ٹھکانے لگ جائے۔ پھر گاؤں کا بلا فقیرا آگیا۔ ماں نے اسے ساری بات سنائی۔ کہنے لگی۔ ”بببا! اسے سمجھا کہ یہ بیاہ کرے۔ گھر بسا لے دبدب نہ پھرے۔“ بلا فقیرا نے ساری بات سن کر سر جھکا لیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ ”نہ بی بی اسے نہ رک۔ اسے جانے دو۔ شاید باہر جا کر د۔ لیکن دکھن کے چکر میں پھنس جائے۔ جب تک یہ د۔ لیکن دکھن کے چکر میں نہیں پھنسے گا۔ آپو نہیں ہو گا۔“

”بببا۔“ میں نے پوچھا۔ ”یہ د۔ لیکن دکھن کا چکر ہے؟“

”بولا۔“ ”پتر یہ د۔ لیکن دکھن کا چکر اک پر وہ ہے۔“

”پر وہ۔ کس کا پر وہ؟“

بولا۔ ”پتر وہ جو ڈال ڈال پات پات میں دکھتا ہے۔ جو ذرے ذرے میں دکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں۔ اس لئے اس نے ہمیں د۔ لیکن دکھن کے چکر میں ڈال رکھا ہے کہ ہمارا دھیان اوھر لگا رہے۔ اوھر نہ جائے۔“

”اور جس کا دھیان د۔ لیکن دکھن کے چکر سے نکل جائے اسے کیا ہوتا ہے بببا؟“

”جو د۔ لیکن دکھن کے چکر سے نکل جاؤ تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ میں رہتا ہے۔“

یوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ لیکن ایک دوسرے سے دور گاؤں کی حویلی میں بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

میرے پاس اسے کہنے کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی روانہ نہ تھی۔ دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ آلو چھیلے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی۔ ”آلو میں بیٹنگن ڈال لوں۔“ میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا۔ ”ڈال۔“ اکثر بولنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ بات اشاروں کی مدد سے ہو جاتی۔ وہ بن بولے سمجھا دیتی۔ میں بن کسے سمجھا دیتا۔

اب جب سے ہم دونوں کراچی اپنے بیٹے سکندر کے گھر آئے ہیں، ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کو گھورتی رہتی ہے۔ میں کرسی میں بیٹھ کر نیچے سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کتنا سکون ہے۔ کتنا اطمینان ہے۔ کسے رابا کسے کارے نہ باشند۔

پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ تھی تو حویلی لیکن سال ہا سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ نوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سکندر سے کئی بار مرمت کے لئے کہا۔ اس نے پروا نہ کی۔ بات ٹال دی۔ سکندر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ گاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ پہلے شہر میں پڑھنے کے لئے بورڈنگ میں رہا۔ پھر بڑا افسر بن گیا۔ بیوی بھی شہر کی ملی۔ اس نے ہم سے پوچھے بنا خود ڈھونڈ لی جیسے میں نے ڈھونڈ لی تھی۔ اور اب اس کی محبت میں لت پت ہو رہا تھا۔ جس طرح میں ہوا تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی دونوں کراچی میں صاحبوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بال بچہ ہے نہیں۔ بس ایک دوسرے میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔

گاؤں کی حویلی کے مغربی حصے کے تین کمرے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہاں ہم دونوں رہتے تھے۔ گاؤں سے ذرا فاصلے پر، شور شرابے سے دور حویلی سے سو پچاس قدم پر سائیں دروٹ کا مزار تھا۔ ہماری کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا۔ انہیں سائیں چپ شلا بھی کہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی سے بات نہیں کی تھی۔ بس اشاروں سے ہی بات کہہ دیتے تھے۔ میں بیروں فقیروں کی نہیں مانتا لیکن دو ایک بار میں اتنا پتا لگانے کے لئے مزار پر گیا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ سائیں جی کا اصل نام دڑ-وٹ تھا۔ جو غلطی عام ہو کر دروٹ بن گیا۔ سائیں جی نے عمر بھر دڑ-وٹی رکھی تھی۔ یہ جان کر مجھے سائیں جی سے دلچسپی ہو گئی۔ اس لیے کہ ہم بھی سائیں جی کی طرح دڑ-وٹی زندگی بسر کر رہے تھے۔

مزار پر ایک شخص باقاعدہ حاضری دیتا تھا۔ اور جھاڑ پونچھ میں لگا رہتا تھا۔ اس کا نام

چوہا

اس بنے بچے آرام وہ کمرے میں ہم دو تھے۔ لیکن دونوں ہی اکیلے، تنہا۔ اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً ”اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور۔ وہ مجھ سے ہزار تھی۔ میں اس سے ہزار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

چالیس سال پہلے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی، عشق تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا تھا۔ مجھے فکر دامن گیر تھی۔ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کیا کروں گا۔ اسے ایک غم تھا۔ اگر ٹاپ نہ ہوا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خوش قسمتی سے بات بن گئی۔ ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ پھر کئی ایک سال ہم محبت میں لت پت رہے۔ لت پت۔ وہ میرے لئے جیتی تھی۔ میں اس کے لئے جیتا تھا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ آہستہ آہستہ اسے پتہ چلا گیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی تھی کہ ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوتا رہا کہ اس کی کچھ باتیں ناقابل برداشت ہیں۔ پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ کئی ایک سال ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہ صورت حال اس قدر بڑھ گئی کہ لڑنے جھگڑنے کے سوا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔

اور اب۔ اب ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑاؤ، جھگڑا جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ اب اتنا تعلق بھی نہیں رہا کہ ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں۔ اب ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ مجبوراً وہ کہتی ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ سمجھے گا۔ میں کہتا ہوں۔ اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش مٹ ہے۔

فضلاً تھا۔ فضلاً شہر میں رہتا تھا مگر جب بھی چھٹی ملتی، مزار کی طرف چل پڑتا۔ مجھے فضلے پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چارہ! حق خواہ، خواہ سائیں کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔

پھر ہم دونوں۔ میں اور میری بیوی میں چوہے کی بات چل نکل۔ ایسی چلی۔ ایسی چلی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ پتہ نہیں۔ نہ وہ وہ رہی، نہ میں میں رہا۔ چوہے کی بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ سکندر آگیا۔ اور ہمیں زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں تین چار ہفتے تو ہم جگہیں دیکھنے میں مصروف رہے۔ ہوا بندر، منگھو پیر، کیمڈی اور پتہ نہیں کیا کیا۔ لیکن آخر جگہیں ختم ہو گئیں۔ اور ہم اس بنی تھی انڈے کی طرح چمکتی ہوئی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

سکندر اور اس کی بیگم صبح اپنے اپنے دفتر چلے جاتے۔ شام کو کوئی پارٹی یا ڈنر ہوتا۔ گھر میں صرف ہم ہوتے یا نوکر ہوتے۔

پھر وہ بنی تھی تنہائی کھلنے لگی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ، وہ آرام زدہ صبح و شام، وہ کلف، وہ رکھ رکھاؤ۔ وہ سب کچھ اک بوجھ بن جاتا۔ دم گھٹنے لگتا۔ گاؤں میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں تنہائی تو تھی پر دم نہیں گھٹتا تھا۔ وہاں ہم دونوں اس قدر اکیلے نہ تھے بے زاری اتنی گاڑھی نہ تھی۔

گاؤں میں وہ میرے لئے چائے بناتی تھی۔ کھانا پکاتی تھی۔ میں کبھی کبھار بازار سے سودا لے آتا۔ کراچی میں نہ کھانا پکانے کی بات تھی نہ سودا لانے کی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ میں سارا دن برآمدے میں بیٹھ کر نیچے چلتی ہوئی شاہراہ کا نظارہ کرتا رہتا۔ وہ پتہ نہیں، اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی۔

ایک دن جب میں سڑک کا نظارہ کر رہا تھا۔ تو اس کی آواز سنائی دی۔ بولی۔ ”شہروں میں چوہے نہیں ہوتے کیا؟“ میں نے حیرت سے سڑک دیکھا۔ وہ ٹائیلوں کے فرش پر نگاہیں گاڑھے بیٹھی تھی جیسے مجھ سے نہیں بلکہ ان سے پوچھ رہی ہو۔

چوہے کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ ”لو یہاں بھی چوہا آ پہنچا۔ کتنی مشکل سے گاؤں میں اس سے جان چھڑائی تھی۔“

”ہوتے ہوں گے۔“ میں نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ”یہاں تو چوہا نہیں آیا کوئی۔“

”یہاں نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ یہ میرا قصور ہے؟“ مجھے غصہ آگیا۔ سڑک دیکھا۔ عابدہ کیلے پر جھکی ہوئی تھی۔ یوں جیسے یہ سوال اس نے کیلے سے کیا ہو۔

میں نے اپنے سلیپر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”چوہا یہاں ٹائیلوں میں بل کیسے ہٹائے۔“ کمرے میں دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر وہ چھت سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بے شک بل نہ ہٹائے پر آئے تو سی۔“ اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس عورت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب گاؤں میں تھی تو کہتی تھی۔ ”چوہا کیوں آتا ہے؟ اب کہہ رہی ہے چوہا کیوں نہیں آتا؟“

گاؤں میں چوہے کی بات اچانک چل پڑی تھی۔ ہوا یوں کہ گاؤں میں ایک رات میں جاگا تو دیکھا کہ عابدہ چارپائی پر گھڑی بن کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا چلو بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

خوف زدہ آواز میں بولی۔ ”چوہا ہے۔“

اس پر مجھے غصہ آگیا۔ ”چوہا ہے تو پڑا ہو۔ گاؤں میں چوہا تو ہو گا۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رضائی لی اور پھر سے سو گیا۔

”سوئی کیوں نہیں؟“ میں نے کہا۔

”نیند نہیں آتی۔“

”کیوں نہیں آتی؟“

”ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کیسا؟“

”چوہا جو ہے۔“

”کیا کمرے گا؟“

”کٹ لے گا۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ یہ محترمہ سمجھتی ہے کہ اس کا گوشت اس قدر لذیذ ہے کہ چوہا اسے کاٹنے کے لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔“

اگلے روز اس نے مجھے ایک سوراخ دکھایا۔ کہنے لگی۔ ”چوہا یہاں سے آتا ہے۔“ میں نے اس سوراخ کے مطابق ایک پتھر تلاش کیا اور ہتھوڑے سے پتھر کو اس سوراخ میں ٹھونک دیا۔ ”لو۔“ میں نے اسے مخاطب کئے بغیر کہا۔ ”اب چوہا نہیں آئے گا۔“

رات کو اس نے مجھے جگا دیا۔ بولی۔ ”چوہا تو آیا ہوا ہے۔ ذرا سنو تو۔“

میں نے سنا۔ واقعی تک تک کی آواز آرہی تھی۔

اگلے دن اس نے ایک سوراخ ڈھونڈ لیا۔ بولی۔ ”یہاں سے آتا ہے۔“ آٹھ دس دن ہم سوراخ ڈھونڈتے اور بند کرتے رہے۔ اس کے باوجود چوہا آتا رہا۔ پھر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے کہا۔ ”دیکھ چوہا تجھے کلٹے کے لئے نہیں آتا بلکہ کھانے کے لئے آتا ہے۔ اگر ڈیوڑھی میں کھانے کے لئے کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ نہ تو باورچی خانے میں جائے گا نہ ہمارے کمرے میں آئے گا۔“

اس نے میری بات مان لی۔ دو تین دن وہ سارے گھر میں بڑبڑ کرتی پھری۔ چوہا کون سی چیز خوشی سے کھاتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ چوہا کیا کھاتا ہے۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ تیسرے دن پتہ نہیں وہ کہاں سے من آئی کہ چوہا پتھر بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ روز وہ رومل میں وہی باندھ کر لٹکا دیتی تاکہ شام تک پتھر تیار ہو جائے۔

اگلے روز صبح سویرے وہ دوڑی دوڑی آئی۔ بولی۔ ”چوہے نے سارا پتھر کھالیا ہے۔“ اس کے بعد جب بھی میں باہر نکلتا تو ڈیوڑھی میں چوہے کی تھالی غور سے دیکھتا کہ چوہے نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو آنکھ کھلتی تو کان لگا کر آواز سنتا رہتا کہ چوہا تک تک کر رہا ہے یا نہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد عابدہ منہ لٹکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی۔ ”چوہا نہیں آیا۔“

”چوہا نہیں آیا؟“ میرے منہ سے نکل گیا۔ ”کیوں نہیں آیا؟“

”دیکھ تو۔“ وہ بولی۔ ”روٹی اور پتھر ویسے ہی پڑے ہیں تھالی میں۔“

میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں گیا۔ دیکھا تو چوہے کی تھالی پر ایک چڑیا بیٹھی ٹھونگے مار رہی ہے۔ میں نے عابدہ کو آواز دی۔ ”یہ دیکھو چوہے کا پتھر چڑیا کھا رہی ہے۔“

وہ دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ بولی۔ ”کھانے دو۔ بے چاری بھوکی ہے۔“

اس کے بعد روز صبح عابدہ مجھے آواز دیتی۔ ”چوہا آج بھی نہیں آیا۔“ انہی دنوں سکندر آگیا اور ذہردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں آنے کے بعد میں چوہے کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس روز اچانک اس نے چوہے کی بات چھیڑ کر مجھے پریشان کر دیا۔ دراصل میں اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں میں اس نے چوہے کی بات چلا کر مجھے اسحق بنایا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چوہے کی بات کا جواب نہیں دوں گا۔

دو روز وہ کسی نہ کسی بہانے چوہے کی بات کرتی رہی مگر میں نے جواب نہ دیا۔

تیسرے دن وہ واپس گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی کوشش کی کہ وہ رک جائے۔ لیکن وہ نہ مانی۔ اگلے روز ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

راستے میں وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی رہی۔ ”چوہا ہماری راہ دیکھ رہا ہو گا۔“ لیکن میں نے جواب نہ دیا۔

اگلے روز ہم ریل گاڑی سے شیشن پر اترے جہاں سے آٹھ پر بیٹھ کر گاؤں جانا تھا تو وہاں فضا مل گیا۔

میں نے کہا۔ ”فضلے تو کہاں سے آ رہا ہے؟“

وہ بولا۔ ”شہر سے آیا ہوں۔ سائیں جی کی حاضری دینے گاؤں جا رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”فضلے تو سائیں دروٹ کو مانتا ہے کیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔ ”میں نے سائیں کو دیکھا ہی نہیں تو مانتا کیا؟“

”تو پھر مزار پر حاضری کیوں دیتا ہے باقاعدہ؟“ میں نے پوچھا۔

”اس میں ایک بھید ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا بھید ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس اتنا سا بھید ہے۔“ فضلے کو کہا۔ ”کہ دھیان خود سے ہٹا کر دوجے پر لگا دو۔“

چاہے وہ پیر ہو، فقیر ہو یا چوہا ہو۔“

”چوہا ہو۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”چاہے چوہا ہو۔“ اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

بولا۔ ”آپ چلیں چودھری جی۔ میں نذر نیاز لے کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔“

تاکہ چلنے لگا تو میں نے صوبہ تاکا والے سے کہا۔ ”ذرا رک جا۔“ اور پھر بے سوچے

کچھ بولا۔ ”عابدہ۔“

عابدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد میں نے نام لے کر

اسے بلایا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عابدہ۔ اس کے لئے کچھ لے جائیں یہاں سے۔“

اس کی آنکھوں میں جسم کی ایک لہر جھلکی۔ بولی۔ ”میں لے آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر

اس نے تھیلے سے ولایتی پتھر کا ایک ڈبہ نکالا۔ اور فکر مند آواز سے بولی۔ ”سکندر کے ابا وہ

ولایتی پتھر کھالے گا کیا؟“

دیکھ کر میں بوند بوند بھر جاتی ہوں۔ پھر جی چاہتا ہے کوئی ہو جسے میں دکھاؤں اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھے دیکھتے رہیں۔ دیکھتے رہیں۔

وہ دیکھ انو۔ پھول انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھے۔ سہمی سہمی ہوئی پتیوں نے سبز چٹیاں اوڑھ لیں۔ آنے والے سے کے سواگت کے لیے دیکھ انو۔ کھلونے بونے کھول دینے لکھنا نکل آئیں پھولوں نے سفید لباس اوڑھ لئے کہ کھلیں دیکھ لیں۔ کھلیوں کا پریم سندیس بن کر اپنی سوتا بھری کٹوریوں کے سرپوش اتار دیئے۔

لو ہوا جھولنے اٹھائے آگئی کہ بھور سے گو جھولن سے بنا دیا۔ انو ایک ایسا ہی بھور سے میرے اندر چھلایا ہوا ہے۔ دل کے انگ انگ میں رچا بسا ہوا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کوئی اندر جھانکے۔ دیکھے۔ جانے۔ اس آرزو نے مجھے اکیلے کر دیا ہے انو۔ اکیلے۔ تنہا۔ اک میں ہی نہیں، انو۔ تو بھی اکیلے ہے۔ ہم سب اکیلیاں ہیں۔ کوئی جان لیتی ہے کہ اکیلے ہوں۔ کوئی نہیں جانتی۔ کوئی سمجھ لیتی ہے کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔ کوئی نہیں سمجھتی۔ کیوں سمجھے۔ کیوں خود کو دکھی کرے۔ پر سمجھنے نہ سمجھنے سے مقدر نہیں بدلتے۔ انو۔!

پتا نہیں یہ بھور سے دیکھن کب دبے پاؤں میرے اندر آبد۔ جیسے دریا نیچے ہی نیچے سے آتا ہے اور پھر ”سیما“ بن کر باہر نکل آتا ہے۔ اس ”سیما“ نے مجھے بھگو دیا ہے۔ ڈبو دیا۔ اب میں نے جانا ہے انو کہ یہ دیکھن باہر سے نہیں آیا۔ اندر سے پھوٹا ہے۔ اب میں نے جانا ہے کہ یہ دیکھن عورت کا نمبر ہے۔ پہلے دیا دیا بیٹھ رہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے نکلتا ہے۔ چھا جاتا ہے۔

جب میں جوان ہوئی تھی تو ایک دم مجھ پر دکھن کا جنون طاری ہوا تھا۔ میں دکھوں، روشنیوں میں دکھوں، اندھیروں میں دکھوں، بیٹھی ہوئی دکھوں، چلوں تو دکھوں، بولوں تو دکھوں، جھرمٹ میں دکھوں، اکیلے میں دکھوں۔ ایسی دکھوں کہ دو جا چوک جائے۔ انو میں دیکھنے کی اتنی دیوانی ہوئی کہ بار بار دیکھتی، کیسی دکھتی ہوں۔

میں سمجھی۔ عورت کے جیون کا مقصد صرف دکھنا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ دیکھنا تو پہلے جوانی کا ایک پڑاؤ ہے، منزل نہیں۔ چار سال میں دکھتی رہی۔

تو یہ ایسی جوانی آئی کہ جو سامنے آتا، جو توں میں کھڑا حیرت سے دیکھتا۔ جو گزر جاتا، مڑ مڑ کر دیکھتا۔ جو بات کرنے کے لئے آتا، بات بھول بھول جاتا۔ انو تو تو جانتی ہے کہ نگاہوں کی گود میں ایک جھولن ہوتا ہے۔ میں اس جھولنے پر ایسی چڑھی کہ سدھ بدھ کھو بیٹھی۔

بھور سے

پیاری انو۔۔۔

دیکھ تو بھور سے آ رہا ہے۔ دبے پاؤں۔ پگ پگ، مدھم مدھم۔ پتہ نہیں کون گوری پائل کی جھنکار کے بغیر، کس پیٹم سے ملنے آ رہی ہے۔ دیکھو تو کیا مدھ بھری چال ہے۔ کیا چھب ہے۔

یہ بھور سے بھی کیا ہے انو۔ مک میں رچا بسا ہوا۔ تازگی شگفتگی کی پھوار اڑاتا ہوا۔ مدھم دھڑکنوں سے بھرپور۔ بے نام سکون، بکھیرتا ہوا دودھیا سویرا جیسے ماں کی گود کھل کھل کر دھرتی پر چھائے جا رہی ہو۔ جیسے اجابت دعا کے لئے اپنے مندر کے دوار کھول رہی ہو۔ جیسے اللہ میاں آکاش سے نیچے اتر آئے ہوں۔ زیر لبی میں کہہ رہے ہوں۔ ”بندے! آ مجھ سے باتیں کر۔“

کاش کہ تو یہاں ہوتی انو اور میرے پاس بیٹھ کر دیکھتی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھے دیکھتیں۔

صبح کے چار بجے ہیں انو۔ اور میں گھر کے باہر باغیچے میں بیٹھی تھی خط لکھ رہی ہوں۔

گھر والے گرمی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ رفق پہل پہریئے ہیں۔ رات دیر تک جاگتے ہیں۔ جوں جوں رات بھگتی ہے، ان کی حیات جاگتی ہیں۔ پھر دو بجے کے قریب گویا غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ صبح دیر تک بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھور سے نہیں دیکھا۔

میں پچھلی پہری ہوں۔ جب پوچھتی ہے تو مجھے جگا دیتی ہے اٹھ صبر اٹھ۔ دیکھو۔ میں کیا کیا دیکھوں انو۔ ہر طرف سے زیر لبی اٹھتی ہے۔ اوھر دیکھ اوھر دیکھ۔ دیکھ

چار سال ہلاڑوں میں جیتی رہی۔

پھر رفیق آگئے۔ رفیق میرے کزن تھے۔ ولایت پڑھنے گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بھو جھکے رہ گئے۔ کئی ایک دن بے پتوار کی ناؤ کی طرح ڈولتے رہے۔ ڈمکاتے رہے۔ پھر انہوں نے نگاہوں کا ایسا تار باندھ دیا کہ میں ان جانے میں پروٹی گئی۔ جھولن میں ایسی لے آگئی کہ رنگ پیدا ہو گیا۔ اس کی بوندیوں کی پھوار پڑنے لگی۔ مجھے بھگو دیا۔ میں سمجھی یہی محبت ہے۔

پھر شادی ہو گئی۔۔۔۔۔

شادی ہو گئی تو پتا نہیں کیا ہوا۔ کچھ ہو گیا۔ آنا "فانا" ہو گیا جیسے بھڑ پروانہ بن جائے۔ ساری دنیا ہی بدل گئی۔ دکھن و -کمن میں بدل گیا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر جینے لگی۔ انہیں بت بنا لیا۔ خود ہیمنٹ چڑھ گئی۔ ہر وقت آدنی اٹھائے رکھتی۔ پھول برساتی رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بت پھیل کر گرد و پیش پر چھا گیا۔ ہر چیز میں انہیں دکھن لگی۔ پھولوں میں، پتیوں میں، بادلوں میں، ہوا کے جھونکوں میں، ہر جگہ۔ اور انو وہ میرے بند بند میں سما گئے اور میرے اندر بھور سے پیدا ہو گیا۔

میری ساری سیلیاں کھتی ہیں۔ صبو تو بڑی خوش نصیب ہے۔ تجھے ان کی محبت حاصل ہے۔ دو سال میں بھی یہی سمجھتی رہی۔ پھر جیسے میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ نہیں یہ تو محبت نہیں۔

ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ اب ان کی نگاہوں کا تارا نوٹ چکا ہے۔ میں انہیں وقفوں سے دکھتی ہوں۔ لیکن جب دیکھتے ہیں آنکھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ پھر ایک شرارہ اڑتا ہے۔ بھس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اک بھانیز ابھرتا ہے۔ جولا کھی جاگتا ہے۔ ان کی آغوش میں میرے اندر پھلجھڑیاں چلتی ہیں۔ گھنٹیاں بجتی ہیں۔ رنگ رس پچکاریاں چھوٹی ہیں۔ پھر ایک ہوائی شوں کر کے چل جاتی ہے۔ وہ دھم سے زمین پر آگرتے ہیں۔ یوں آنکھ کھل جاتی ہے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہیں۔ پھر میں انہیں دکھتی۔ ان کی وہ نگاہ سوچ آف ہو جاتی ہے۔ میں پیش منظر سے پس منظر میں چلی جاتی ہوں لیکن میری نگاہ میں وہ کبھی پس منظر میں نہیں جاتے۔ سدا پیش منظر میں رہتے ہیں۔

اب میں نے جانا ہے انو۔ یہ آگ آگن تو محبت نہیں۔ یہ تو لگن کی شدت کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ خود کو دو بجے سے آگ کرنے، محفوظ کر لینے کی اک چال ہے۔ مرد کے دل میں محبت بھور سے پیدا نہیں ہوتی۔ انو وہ تو جلا دیتا ہے۔ محبت تو بتاتی

ہے، بگاڑتی نہیں۔ یہ تو کپا لٹھا دینے والی بات ہے۔ محبت تو پلی پلی جوڑن کا نام ہے۔ انگ انگ میں دھپ جلائے رکھنے کا نام ہے۔ ایسے دھپ جو ان بچھ ہوں۔ ہلکی ہلکی لہروں کا نام ہے جو بند بند میں رواں دواں رہیں۔ جوار بھائے کا نام نہیں۔

اب مجھے یاد آتا ہے انو۔ بائی کہا کرتی تھی۔ صبو عورت سے دھوکہ ہوا ہے۔ مرد کا پریم تو جیون پیالی رکھنے کے لیے قدرت کی ایک چال ہے۔

اب میں نے جانا انو بائی سچ کہتی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ محبت کی دین تو صرف عورت کو ملی ہے۔ مرد تو خالی جوار بھاتا ہے۔ سکندر ہے۔ آتا ہے۔ فتح کرتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ مرد تو انو مداری کا طوطا ہے۔ توپ چلاتا ہے اور پھر آرام سے بے تعلق جھولنے پر جا بیٹھتا ہے اور عورت اپنے بند بند میں ممتا کے دھپ جلائے بیٹھی رہتی ہے۔ بیٹھی رہتی ہے۔ نہیں انو۔ میں قدرت کی چال کے جال میں پھنسنے والا پنچھی نہیں بنوں گی۔ مجھے تو اک ساتھی چاہئے جس کے انگ انگ میں محبت کی بھگ رچی بسی ہو۔ تار بندھا رہے۔ مدھم لہرس رواں دواں رہیں۔ بند بند میں دھپ جلتے رہیں۔ محبت بھرے دھپ جیسے بھور سے میں جلتے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے انو جیسے یہ بھور سے چاروں اور چھایا ہوا بھور سے، سے بنانے والے کا، اپنے بندوں کے نام محبت بھرا پیغام ہے۔ اسے سو کے مت گنوا۔ اٹھ۔ اٹھ کر میرے ساتھ باتیں کر۔ محبت بھری باتیں۔

انو میرا جی چاہتا ہے۔ کوئی ہو۔ جو میرے ساتھ بھور سے کو دیکھے۔ اس کے پیغام کو سنے۔ اسے بیتے اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے دیکھتے رہیں۔ دیکھتے رہیں۔

آدھے چہرے

”میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں سب سے اہم مسئلہ ایموٹل سٹریس اور سٹریس کا ہے۔“ اسلم نے کہا۔ ”اگر ہم ایموٹل سٹریس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت سی کنبلی کیشنز سے نجات مل سکتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے ٹراکولائزر قسم کی چیز۔“ رشید نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”ٹراکولائزر نے مزید پیچیدگیوں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایلو پیٹھی نے جو مرض کو دبا دینے کی رسم پیدا کی ہے، اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں، اس سپریشن کی وجہ سے مرض نے کیموفلاج کرنا سیکھ لیا ہے۔ لہذا مرض بھی بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ اسلم نے پوچھا۔

”میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔“ طاؤس بولا۔ ”ہمارا طریق علاج یعنی ہومیو پیٹھی یقیناً روحانی طریقہ علاج ہے۔ ہماری ادویات مادے کی نہیں بلکہ انرجی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جتنی دوا کم ہو، اس میں اتنی ہی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ عظیم نے کہا۔ ”یقیناً“ یہ طریق علاج اپنی نوعیت میں روحانی ہے لیکن ہمارے پریکٹنگ ہومیو پیٹھس کا نقطہ نظر ابھی مادیت سے نکل نہیں سکا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔“

”ڈاکٹر صاحبان۔“ رشید ہنس کر بولا۔ ”آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلو پیٹھی کو ریلیس نہیں کر سکتے۔“

”وہ کیوں؟“ حامد نے پوچھا۔

”سیدھی بات ہے۔“ رشید نے جواب دیا۔ ”آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لئے صبر چاہئے۔ استقلال چاہئے۔ آج کل لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔ بس ایک گولی ہو، ایک ٹیکہ لگے اور شام کو انٹرکان کی محفل میں شو آف کا موقعہ ہاتھ سے نہ جائے۔“

”سچ کتے ہو بھائی۔“ حامد نے آہ بھری۔

”اسلم صاحب۔“ طاؤس نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ فکری کھوپکے ہیں۔ ماڈرن ایج کی یہ ایک ڈیزیز ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ حامد بولا۔

”میرا مطلب ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں۔ پتہ نہیں، وہ چاہتے کیا ہیں۔ مودمنٹ کے دیوانے تو ہیں۔ چلتے رہنے کا بھوت سوار ہے۔ لیکن انہیں پتہ نہیں کہ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ ہمارے نوجوان میڈ کراؤڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دبا رکھا ہے۔ بالکل ایسے جیسے اینٹی بائیوٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں۔“ طاؤس نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا۔ ”کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا جو اندر کے فرد کو ریلیز کر سکتی۔ میڈ کراؤڈ کی نفی کر سکتی۔“

”ہوں۔ دلچسپ بات ہے۔“ عظیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟“ حامد نے طاؤس سے پوچھا۔

”دو سال ہوئے۔“ طاؤس کہنے لگا۔ ”جب میں نے پریکٹس شروع کی تو پہلا مریض جو میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا، ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ میں کون ہوں؟“

”عجیب بات ہے۔“ رشید ذریعہ لب بولا۔

”اور وہ مریض مکمل ہوش و حواس میں تھا کیا؟“ اسلم نے پوچھا۔

”بالکل۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”شاید ڈس۔ یلنڈ ہو۔“ عظیم نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔

”بظاہر تو نہیں لگتا تھا۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”حیرت کی بات ہے۔“ رشید نے دہرایا۔ اس وقت یہ سب لوگ رشید کے مکان سے ملحقہ لان میں بیٹھے تھے۔

دراصل رشید ہومیو پیتھی کا بہت دلدادہ تھا۔ ہومیو پیتھ ڈاکٹروں سے اس کے بڑے مراسم تھے۔

اس روز اس نے چار ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کو اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا۔ غالباً کوئی تقریب تھی یا ویسے ہی۔

رشید خود ہومیو پیتھ نہیں تھا لیکن اسے ہومیو پیتھی کے کبیر کا بڑا شوق تھا۔ ہر حال کھانا کھانے کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے سبز چائے پی رہے تھے کہ دور حاضرہ کی بات چل نکلی تھی۔

طاؤس کے اس کیس پر ڈاکٹر تو نہیں البتہ رشید بہت متاثر ہوا۔ اس کے اصرار پر طاؤس نے انہیں اس نوجوان کا واقعہ سنایا۔ طاؤس نے بات شروع کی۔

”ان دنوں میں نے نیا نیا عمل کھواا تھا۔ اور عمل بھی کیا۔ میں نے گھر کے ایک کمرے پر بورڈ لگایا تھا اور وہاں چند ایک ضروری کتابیں اور دوائیں رکھ لی تھیں۔

شام کا وقت تھا۔ میں اپنے عمل میں بیٹھا ایک رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر ٹک ٹک کی آواز آئی۔ دیکھا تو دروازے پر ایک خوش پوش نوجوان کھڑا ہے۔ ”میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”تشریف لائیے۔ میں نے رسالہ ایک طرف رکھا۔“ بیٹھے۔

”آپ ہومیو پیتھ ہیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل و شہادت ایک پریکٹیکل نوجوان جیسی تھی۔ سمارٹ، ذہین، مضطرب، شوخ، لالچالی، چمکتی آنکھیں، چوڑا منہ، لنگتی مونچھیں اور سر پر بالوں کا ٹوکرا۔

”دراصل میں آپ سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔

”پوچھئے۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ غالباً اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات شروع کرے۔ پھر وہ ایک دم کہنے لگا۔ ”میری ایک پرابلم ہے۔ جناب میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آیا میں حمید ہوں یا اختر ہوں۔“

طاؤس رک گیا۔ حاضرین حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہاں ہاں۔“ یہ کیا بات ہوئی۔ رشید بے صبرا ہو رہا تھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی بھلا میں حمید ہوں یا اختر۔“

طاؤس نے بات شروع کی۔ بولا۔ ”نوجوان کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ سمجھا۔ شاید اس کا ذہن گڈمڈ ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ پھر نوجوان خود ہی بولا۔ ”آئی ایم ناٹ اے مثل کیس سر۔ میرا ذہن بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر دراصل مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بات کروں۔“

”یہ بتائیے کہ حمید کون ہے، اختر کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں ہوں۔ میں حمید بھی ہوں، اختر بھی۔ میرا نام حمید اختر ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا حمید اختر ایک ہی فرد کا نام ہے؟ میں نے پوچھا۔

”جی۔ ایک ہی فرد کا۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر آپ نے یہ کیوں پوچھا کہ میں حمید ہوں یا اختر؟“

”میں نے بالکل ٹھیک پوچھا۔ ڈاکٹر سی میری پرابلم ہے۔ لیکن میں اپنی پرابلم کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔ میں اس امید پر یہاں آیا تھا کہ شاید ہومیو پیتھی میں کوئی ایسی دوا ہو جو میری پرابلم کو حل کر سکے۔ لیکن اس نوبوے۔“ وہ جانے کے لئے مڑا۔ ”معاف کیجئے۔ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔“

”ذرا ٹھہریے تو۔ میں نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”فائدہ؟“ وہ بولا۔

”جب میں اپنی پرابلم پیش ہی نہیں کر سکتا تو.....“

”گولی ماریے پرابلم کو۔“ میں نے کہا۔ ”آئیے اکٹھے بیٹھ کر چائے کا پالہ پیئیں۔ دنیا میں سب سے عمدہ دوا اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرنا ہے۔“

”لیکن آپ کا وقت۔“ اس نے کہا۔

”بے فکر رہئے۔ میں بالکل فارغ ہوں۔ احمد دین۔۔۔“ میں نے با آواز بلند اپنے ملازم کو پکارا۔ ”بھئی چائے لے آؤ۔“ اس پر وہ نوجوان رک گیا۔

”بیٹھے نا۔“ میں نے نوجوان کو صوفے پر بٹھا دیا۔ ”دیکھئے موسم کتنا خوشگوار ہے اور یہاں سے پہاڑوں کا منظر کتنا اچھا لگتا ہے۔“ میں نے اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ دیر تک بیٹھے ہم دونوں چائے پیتے رہے۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ اس نے اپنی پرابلم کی بات شروع کرنے کی پھر سے کوشش کی۔ آخر میں نے اس سے کہا۔ ”حمید صاحب۔ آپ اپنی پرابلم پیش نہ کریں بلکہ اپنی آپ جتنی سنائیں۔ آپ کی پرابلم آپ ہی آپ ہی باہر نکل آئے گی۔“

بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی شروع کر دی۔

کئے لگا۔ ”ڈاکٹر صاحب۔ میرا نام حمید اختر ہے لیکن گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں۔ ہم شہر کے پرانے حصے کوچہ قاضیاں میں رہتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد نہ جانے کب سے اس محلے میں رہتے ہیں۔ یہ محلہ ایک کوچہ بند محلہ ہے۔ میرا مطلب ہے چاروں طرف سے بند ہے۔ اندر جانے کے لئے ایک بہت بڑی ڈیوڑھی بنی ہوئی ہے۔ جانے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ محلے میں صرف قاضی آباد ہیں جو ایک دوسرے کے عزیز یا رشتہ دار ہیں۔“ وہ رک گیا اور کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔

”آپ چونکہ شہر کے جدید حصے میں رہتے ہیں، آپ نہیں سمجھ سکیں گے کہ محلے میں رہنے کا مطلب کیا ہے۔ محلے میں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو جانتا ہے۔ جو نئی آپ محلے میں داخل ہوتے ہیں، لوگوں کی نظریں آپ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ بولتا کس طرح ہے۔ سر اٹھا کر یا نیوا کے لڑکیوں کی طرف کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

ہم لوگ جو پشتوں سے محلے میں رہتے آئے ہیں، محلہ ہماری ہڈیوں میں رچ بس گیا ہے۔ جو نئی ہم محلے میں داخل ہوتے ہیں، اپنے آپ آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ گفتگو میں شوخی ختم ہو جاتی ہے۔ اندر کا غنڈہ پن دھل جاتا ہے۔ لڑکیاں نگاہ میں لڑکیاں نہیں رہتیں۔ بڑوں کے لئے ادب و احترام کا ایک خول چڑھ جاتا ہے۔

اگرچہ اب محلے میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ برقعے اتر گئے ہیں۔ لباس بدل نئے ہیں۔ کاریں آگئی ہیں۔ ڈرائنگ روم جگ گئے ہیں۔ لیکن محلے والوں کا رخ نہیں بدلا۔ اگر بدلا بھی ہے تو یہ تبدیلی باہر تک محدود ہے۔ محلے میں داخل ہوتے ہی کیا پلٹ جاتی ہے۔ کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں، ویسے ہی بے اختیاری طور پر۔

ہاں میں اس محلے میں پلا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب۔ سمجھے آپ اور مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں۔ عشق ہے عشق۔ میری ماں نے جتنی محبت مجھے دی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ میں اپنی ماں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں ڈاکٹر۔“

ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔ طاؤس ایک ساعت کے لئے رک گیا۔ پھر بولا۔

”آپ کا باپ؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اب تو میرا باپ ایک اچھی خاصی نوکری پر ہے۔ پہلے وہ ایک معمولی عہدے پر کام کرتے تھے۔ آج کل تو ہمارا گھر ایک اچھا حاصل مل کلاس گھرانا ہے۔ اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ بات نہ تھی۔ بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا۔

پھر ہم پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ ابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ایک عجیب سی بیماری تھی۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔ ہم نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال والوں نے انہیں درد سے بچانے کے لئے نشے والے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے۔ دو سال بعد وہ صحت مند ہو کر گھر آئے تو ان ٹیکوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایڈکٹ ہونے کی وجہ سے ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ بد مزاجی حد سے بڑھ گئی۔ جیسے کہ ہر اس ڈرگ ایڈکٹ کی ہوتی ہے جس کے پاس نشہ پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔

انس۔ وہ چار سال ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہماری ہڈیاں توڑ دیں۔ امی، چھوٹی بہن اور میں پس کر رہ گئے۔ ہم تینوں نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ریڈی میڈ کپڑے پیئے۔ پیچھے۔ دسکی ٹائیوں کی سپلائی کرنے کے لئے فیس کریمیں بنائیں۔ تھیلے پیئے۔ سیلوفین کے لفافے بنائے۔ ان دنوں ہمیں کئی کئی روز فاقے آئے لیکن امی نے ابا کے علاج اور ہماری تعلیم کو ہر قیمت پر جاری رکھا۔ اگر امی نہ ہوتیں تو گھر کے پرچے اڑ جاتے۔ امی ایک بہت بڑی عورت تھیں۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔ اس نے ہم سب کا حوصلہ بندھا رکھا۔ ہم میں مصیبتیں سننے کی بہت پیداک۔ ابا کی دیوانگی برداشت کی۔ خیر وہ دن بیت گئے۔ ابا کی وہ عادت چھوٹ گئی اور پھر انہیں پہلے سے بہتر ملازمت مل گئی۔ ایسی کہ ہم خاصے خوش حال ہو گئے ہیں۔

گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ کبھی کسی نے اختر کہہ کر نہیں بلایا۔ محلے میں سب حمید کے نام سے بلاتے ہیں۔ جب کوئی حمید کے نام سے بلاتا ہے تو آواز میرے کانوں میں داخل ہو کر سیدھی دل میں پہنچ جاتی ہے اور میرے دل میں گھر اور محلے کی یادیں یوں جھن جھن کرنے لگتی ہیں جیسے ساز کی تاریں۔ گھر سے وابستہ جذبات ابھرتے ہیں۔ ادب، احترام، خدمت، برداشت، ایک مٹھاس سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری گردن جھک جاتی ہے۔ نگاہیں ہینگ جاتی ہیں۔ منہ سے جی ہاں جی ہاں نکلتا ہے۔ ایک عجیب سا سرور، عجیب سا سکون، میں بیان نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب۔“ نوجوان نے جھرجھری لے کر کہا۔

”میں سمجھتا ہوں آپ کی بات کو۔“ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”اے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو پشت در پشت سے محلے میں رہتا آیا ہو۔ ڈاکٹر۔“ نوجوان نے پھر بات شروع کی۔ ”جب میں کالج میں داخل ہوا۔ ان دنوں ہماری گھریلو مصیبت نئی ختم ہوئی تھی۔ محنت و مشقت اور غربت کا دور دور ہوا تھا۔ کالج میں میرا جی چاہتا تھا کہ انہی چھلانگیں لگاؤں۔ ہنسوں، کھیلوں، قہقہے لگاؤں اس کو چھیڑوں اس سے الجھوں۔ پھر وہاں محلے کی بندشیں بھی تو نہ تھیں۔ ایک عجیب سی آزادی کا احساس ہوا مجھے۔ ماور پدر آزاد پھر یہ بھی تھا کہ

بچ پر بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ سخت کشش میں مبتلا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ اس کے ذہنی کرب کو محسوس کر کے میں سخت گھبرا گیا اور اسے چھوڑ کر چلا

”پشتر اس کے کہ اظہار کرتا۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ ”ایک مشکل پڑ گئی۔ ویسے اظہار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے سب پتہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میری کیا کیفیت ہے۔ اور یہ

”ہاں۔“ اسلم بولا۔ ”ذہنی کرب متعدی ہوتا ہے۔“

”اس کے بعد وہ نوجوان آپ سے ملا کیا؟“ حامد نے پوچھا۔

”ہاں۔ چھ مہینے بعد۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”تو کیا اس نے آپ کو بتایا.....؟“ رشید نے بے تکی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ طاؤس نے پھر سے بات شروع کی۔ ”اس روز میں سینما کا سیشن شو دیکھنے گیا تھا۔ بڑی آؤٹ سٹینڈنگ پکچر لگی تھی۔

ہال میں خالصتہ پنجپل سیٹ پر بیٹھ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حمید اختر مجھ سے اگلی رو میں بیٹھا ہے۔ اس سے کچھ ایک لڑکی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نئی بیاہی ہوئی دلہن ہے۔ یعنی اس کی شادی ہو چکی تھی۔ میرے دل میں کھڑپہ ہونے لگی کہ وہ لڑکی کون ہے۔ سنبل یا صفیہ۔ سچی بات یہ ہے کہ فلم پر میری توجہ نہ جمی۔ بس یہی سوچتا رہا۔ پھر جب انٹرول ہوا اور حمید باہر نکلا تو میں بھی پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس نے جلد ہی مجھے دیکھ لیا۔ ”ہیلو ڈاکٹر۔“ وہ چلایا۔

”کسے۔“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟“

”میری تو شادی بھی ہو گئی ڈاکٹر صاحب۔“ وہ چلایا۔

”سنبل سے یا صفیہ سے؟“ میں نے پوچھا۔ ”مجھے ساری بات سنائیے۔“

اس نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا۔ ”ڈاکٹر صاحب امی کی خواہش کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور امی سے کہہ دیا۔ امی میں وہاں بیاہ کروں گا جہاں آپ چاہتی ہیں۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے۔“

”پھر کیا تھا ڈاکٹر۔ امی نے جھٹ مٹکی پٹ بیاہ کرنے والی بات کی۔ اور اس طرح صفیہ سے میری شادی ہو گئی۔ پھر سہاگ کی رات جب میں نے صفیہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے سنبل بیٹھی ہوئی ہے۔“

”ارے۔“ میرے منہ سے چیخ سی نکلی۔ طاؤس رک گیا۔

”بہن لوگ حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”صفیہ۔۔۔ سنبل نکلی۔ مطلب کیا ہوا؟“ رشید چلایا۔

”مجھے تو ساری بات ہی گپ نظر آتی ہے۔“ اسلم نے کہا۔

”آپ نے حمید اختر سے نہیں پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟“ عظیم بولا۔

”ہاں پوچھا تھا۔“ طاؤس نے کہا۔

”تو پھر کیا بتایا اس نے؟“ رشید نے پوچھا۔

پوچھا تو حمید اختر نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب وہ بھی میری طرح حمید اختر تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ صفیہ سنبل تھی۔“

اس کے قریب ہی شمد کی مٹیوں کے بارہ ڈبے تھے جہاں کھیاں شمد بنا رہی تھیں۔ وسط میں رہائشی مکان تھا جس کے ارد گرد تیس قسم کے گلاب لگے ہوئے تھے جو دنیا کے مختلف ممالک سے منگوائے گئے تھے۔ گھر سے ہٹ کر ایک طرف ایچی کا باغ تھا۔ دوسری جانب مالے، کینو اور گریپ فروٹ تھے۔ ایک کونے میں گھاس پھوس کی چھت تلے پان کی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے کونے میں جمبو کے پڑھتے۔

رفیق علی کے سر پر یہ دھن سوار تھی کہ ایسے پودے لگائے جو پاکستان میں نہیں ہوتے اور ان کے پھل دساور سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے فارم میں لگائے مثلاً پیاری، کالی مرچ، اٹی۔ اس کے لیے ایک باٹ باؤس بنوانے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا یہ خواب بڑی دیر تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال وہ فارم خود کفیل تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ دودھ کے لیے گائیاں، بھیئیں اور بکریاں تھیں۔ کھانے کے لیے پھل تھے، سبزیاں تھیں، مرغیاں تھیں، مچھلی تھی، شمد تھا۔ شروع شروع میں دو ایک سال تو رفیق فارم کو تشکیل دینے میں شدت سے مصروف رہا۔ پھر جب فارم کی شکل نکل آئی تو وہ بیٹھ کر اپنی جنت کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے دل میں پودوں کی روئیدگی کی حس جالی۔ سبز پتے پھول اور پھل اپنی خاموش زبان میں اس سے باتیں کرنے لگے۔

پتے نہیں ایسا کیوں ہوتا۔ ٹر ایسا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو آسمان کے نیچے بیٹھ کر پودوں کی روئیدگی کو دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ذنصل سے کونپلیں پھوٹی ہیں۔ کونپلیں کھل کر پتیاں بنتی ہیں۔ پتیاں بڑھ کر پتے بن جاتے ہیں۔ بوٹے پھیل کر درخت بن جاتے ہیں۔ ان کے روبرو کائنات کا خالق آکھڑا ہوتا ہے۔

بھر وہ فرہ انبساط سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اپنی مخلوق کی محبت کے جذبے سے پکھل کر سارے کھیت میں گھل مل جاتے ہیں۔ پتوں میں ہریاں مل جاتا ہے۔ پھولوں میں رنگ بن جاتا ہے۔ پھلوں میں شیرینی۔

خالق اور مخلوق یوں گھل مل جاتے ہیں کہ وحدت کا احساس ابھرتا ہے۔ پتے نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسے ہوتا ہے۔

لیکن شرمیں ایسا نہیں ہوتا۔ شرمیں خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اس لیے شرمیں گردنیں تنی رہتی ہیں۔ چھاتیاں اکڑی رہتی ہیں۔ مونچھیں مروڑی رہتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ شرمیں انسان خود کو خالق سمجھتا ہے۔

سبزیتا

سیانے کہتے ہیں بڑے بڑے واقعات چھوٹی چھوٹی باتوں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ جج نمکتے ہیں۔ کتنی چھوٹی سی چیز تھی سبزیتا۔ سبز پتے نے ایک رستے بستے خاندان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

سبزیتا ایک کتاب کا عنوان تھا جو علم النبات کے ایک مشاہیر نے لکھی تھی۔ اتفاق سے یہ کتاب رفیق کے ہاتھ لگ گئی۔ جوں جوں وہ سبز پتے میں قدرت کے حیرت انگیز نظام کے بارے میں پڑھتا گیا، توں توں اس کے دل میں شعور پیدا ہوتا گیا کہ جج ایک جن ہے جسے قدرت نے بوتل میں بند کر رکھا ہے۔ گویا روئیدگی کی طاقت کو سربمہر کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں وہ سبز پتے کے اسرار و رموز سے واقف ہوتا گیا، توں توں اس کے دل میں کونپلیں پھوٹی گئیں۔ پھول کھلتے گئے۔ ایک ایسا سبزہ زار ابھرتا گیا جہاں روئیدگی تھی، تازگی تھی، امن تھا، سکون تھا۔ ایسا سکون جو بھور سے دنیا کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا ہے اور اللہ میاں اتنے قریب آجاتے ہیں۔ اتنے قریب کہ سب کچھ ان کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

رفیق کے دل میں سبز پتے کا ایسا عشق جاگا کہ اسے شرکی شورا شوری، افراطی اور روپیہ کمانے کی اندھی دوڑ سے نفرت ہو گئی۔

اس پر دونوں بھائیوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔

بڑا بھائی اعظم علی شرمیں جا کر کارخانہ دار بن گیا۔ اس کا گھر مغربی رنگ میں رنگا گیا اور اس کی زندگی پر حصول زر کے جنون کا تہو تن گیا اور چھوٹے بھائی رفیق علی نے اپنے آبائی گاؤں سے بہت دور ایک فارم قائم کر لیا۔

یہ فارم ایک انوکھا فارم تھا۔ ایک طرف مرغی خانہ تھا جس میں دو ہزار مرغیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک تالاب تھا جس میں تلابیہ مچھلیاں افزائش نسل کے لیے ڈال دی گئی تھیں۔

بہر حال رفیق اور اس کی بیوی آصفہ دونوں فارم میں سبزپتوں کی روئیدگی کو دیکھتے رہے۔

پھر شفیق کی پیدائش کے بعد تینوں تخلیق کے حیران کن عمل کو دیکھنے لگے۔ یوں آہستہ آہستہ شفیق جوان ہو گیا اور سبزپتے کے سحر میں رنگا گیا۔ اس پر باپ نے اسے ایگریکلچر یونیورسٹی میں بھیج دیا جہاں سے وہ ڈگری حاصل کر کے واپس فارم میں آ گیا۔

تخلیق تعلیم سے واپس آیا تو شفیق ایک مفید حیات ساتھ لے آیا۔ اس مقصد میں بے شک سبزپتے کی بہت اہمیت تھی لیکن وہ فارم جس میں وہ چل کر جوان ہوا تھا، جس کی رفیق کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی، غیر اہم ہو چکا تھا۔

چار ایک ہفتے فارم میں بسر کرنے کے بعد بیٹے نے باپ سے کہا۔ ”اباجان! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا کام شروع کروں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! تم اپنا کام فارم میں شروع کیوں نہیں کرتے۔“

شفیق نے کہا۔ ”اباجان! میرا کام یہاں نہیں ہو سکتا۔ یہ فارم تو ایک مرغزار ہے۔ میرا کام تو وہاں ہو گا جہاں میلوں سبزپتے کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے علاقے میں لاکھوں ایکڑ زمین غیر آباد پڑی ہے۔ کٹاؤ کا یہ علاقہ جو چھوٹے چھوٹے نیلوں پر مشتمل ہے، بے آب و کبہ ویران پڑا ہے۔ وہاں کی بھر بھری مٹی مردہ ہو چکی ہے۔ اس میں زندگی نہیں رہی۔ قوت نمو نہیں رہی۔ میں چاہتا ہوں کہ تحقیق کروں۔ کوئی ایسا سبزپتا تلاش کروں جو ہلکی بارش میں اپنی جڑیں زمین میں گاڑ دے اور پھر چاروں طرف پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے حتیٰ کہ کٹاؤ کے تمام نیلے اور نچان اس کی روئیدگی سے بھر جائیں اور خشک سالی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

اگر مجھے ایسا سبزپتہ مل جائے، چاہے وہ بوٹا ہو، بھاڑی ہو یا زمین کے ساتھ ساتھ ریگینے والی تیل ہو تو میلوں علاقہ ہر ابھرا ہو جائے۔ اس علاقے کی تقدیر بدل جائے۔“

باپ نے بیٹے کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”بیٹے! ہاں تمہاری ماں اور میں تمہاری اس قابل قدر جستجو میں حائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں لیکن بیٹے تمہاری ماں کی یہ خواہش ہے کہ وہ تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔“

شفیق ہنس کر بولا۔ ”اباجان! یہ کام شادی کے بعد نہیں ہو سکتا۔“

”تمہاری ماں کی خواہش ہے بیٹے!“

”اباجان!“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے شادی سے انکار نہیں لیکن مجھے ایسی جیون ساتھی

کہاں سے ملے گی جو اس کام میں میرے ساتھ ویرانوں میں کھل ہونے کے لیے تیار ہو۔“

عین اس وقت ڈاکہ تار ہاتھ میں پکڑے داخل ہوا۔ بولا۔ ”چودھری جی! آپ کا تار آیا ہے۔“

تار کا سن کر شفیق کی ماں آصفہ دوڑی دوڑی آگئی۔ ”اللہ خیر کرے۔ کس کا تار ہے؟“

”بچے بھائی آ رہے ہیں۔“ رفیق نے تار پڑھتے ہوئے کہا۔

”یہاں آ رہے ہیں کیا؟“ آصفہ حیرت سے چلائی۔ ”فارم پر؟“

”وہ تو یہاں کبھی نہیں آئے۔“

”بہر حال وہ آ رہے ہیں۔ ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا جائے۔ انہیں کھانے میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کی جائے جس سے شرکی خوشبو آتی ہو۔ خالص، یہاتی چیزیں کھلائی جائیں۔ رس کی کھیر، کڑھی، گھنا ہوا ساگ، دودھ میں پکا ہوا گوشت، لسی، مکھن، شدر۔“

آصفہ بولی۔ ”ان باتوں کو چھوڑیے۔ سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آ رہے ہیں۔ وہ تو فارم پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ہمیں پینڈو سمجھتے تھے۔“

اس پر رفیق نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ ”مجھے پینڈو ہونے پر فخر ہے۔ اچھا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔ میں انہیں اپنی حیثیت دکھاؤں گا۔ اگر کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں تو شاید سبزپتے کا سحر ان پر اثر انداز ہو جائے۔“

اعظم علی کی آمد پر فارم قہقہوں سے گونج اٹھا۔

رفیق نے انہیں فارم کی ایک ایک چیز دکھائی۔

اعظم علی کی بیوی بانو تو رسمی طور پر واہ واہ کرتی رہی لیکن ان کی اکلوتی بیٹی اسمارہ حیرت سے ایک ایک چیز دیکھتی۔ ٹالیاں بجاتی اور قہقہے لگاتی رہی۔

اسمارہ شفیق سے کافی بے تکلف رہتی تھی جیسے کزن ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ کبھی فارم پر نہیں آتی تھی لیکن شفیق جب بھی شہر جاتا، ان کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اسمارہ ہمیشہ اس کے سبزپتے کا مذاق اڑاتا کرتی تھی۔ کہتی۔ ”تمہارا بھی جواب نہیں۔ فیقو گوگ پھول تلاش کرتے ہیں اور تم سبزپتے کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔“ وہ شفیق کو فیقو کہہ کر بلایا کرتی تھی۔

اسمارہ ایک ماڈرن لڑکی تھی جیسے کلج والیاں ہوتی ہیں۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے بات کہہ دینا آتا تھا۔ بات میں ایسا رنگ بھر دیتی کہ وہ رنگ پچکاری بن جاتی اور محفل کو شرابور کر دیتی۔ وہ جھپٹنے یا جھجکنے سے قطعی طور پر ناواقف تھی اور اس کی گفتگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بر ملا سچی بات کہہ دیتی۔ چاہے بات خود اس کے خلاف جاتی۔

لاڈلن لڑکی کی طرح اس کے خدوخال جاذب تھے مگر انہیں حسین نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس کی حرکات اور انداز بہت جاذب نظر تھے۔ آج کل خدوخال کا حسن نہیں چلتا۔ انداز کا حسن چلتا ہے۔ اسارہ کے انداز میں بڑی گرل تھی۔ حرکت میں روہم تھا اور بات میں رنگ۔ شفیق اسارہ کو بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کمپنرٹس میں پلی ہے اور یوں زندگی بتانے کی آرزو مند ہے جیسے جھیل میں اگا ہوا کنول ہو۔ اس میں جدوجہد کی آرزو نہیں۔ زندگی مقصد سے خالی ہے۔ بیگانہ ہے۔

اس روز اسارہ کو فارم دکھاتے ہوئے اس نے بڑی کوشش کی کہ اسارہ کے دل میں سبز پتے کی جوت جگا دے۔ مقصد کا دیا جاوے لیکن جھیل میں اگا ہوا کنول گرد و پیش سے متاثر نہ ہوا۔ اپنے ہی عکس کو دیکھنے میں کھویا رہا۔

رات پڑی تو بڑے بھائی نے رفیق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کہنے لگے۔ ”دیکھو رفیق! تم نے اپنی زندگی تو سبز پتے کے لیے تباہ کر دی۔ اب کم از کم شفیق کی زندگی کو تو بچ لو۔“

رفیق نے کہا۔ ”بھائی جان! میری زندگی تباہ تو نہیں۔ میں تو جنت میں رہتا ہوں۔“

اعظم علی نے۔ ”اب احمقوں کی جنت سے باہر نکلو رفیق! حقائق کی دنیا کو اپناؤ۔ تمہارا شر کو چھوڑ کر یہاں فارم میں آجینہنا زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ خیر تم نے جو چاہا کر گزرا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اچھا چھوڑو۔ اب شفیق کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر وہ بھی اسی فارم میں بیٹھا رہا تو زندگی سے ایڈ جسٹ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا۔“

رفیق نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اعظم علی نے اسے چپ کرا دیا۔ ”میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم شفیق کو ہمارے ساتھ شہر بھیج دو۔ ہم اسے بزنس کی ٹریننگ دیں گے اور اپنا حصہ دار بنالیں گے۔“

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ اسارہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ اگر شفیق بزنس میں چل نکلا تو شاید ان دونوں کی شادی ہو جائے لیکن اسے وعدہ مت سمجھنا۔ شاید۔۔۔ بہر حال ہماری خواہش ہے کہ شفیق ہمارے ہاں رہے۔ یہاں فارم میں رہ کر اپنی زندگی تباہ نہ کرے اور ہاں کل رات تک ہم اس کا جواب چاہتے ہیں۔ ہاں یا نہ۔ چونکہ برسوں صبح ہم واپس چلے جائیں گے۔“

رفیق بڑے بھائی سے مل کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو آصف سے بحث چھڑ گئی۔ آصف اس صورت حال پر بہت خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شفیق چچا کی خواہش کے مطابق شہر چلا جائے۔ کاروبار میں حصہ دار بن جائے اور اسارہ سے اس کی شادی ہو جائے۔

رفیق آصف کا ہم خیال نہ تھا۔ وہ بولا۔ ”شفیق نہیں مانے گا۔ وہ کسی صورت اپنا مقصد حیات نہیں چھوڑے گا۔ اسے روپیہ کمانے کا شوق نہیں۔ کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔“

آصف بولی۔ ”آپ اسے شہ دیتے ہیں نا!“

”نہیں نہیں۔“ رفیق نے جواب دیا۔ ”اگر شفیق کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو مجھے قطعی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اس معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔“

آصف کہنے لگی۔ ”ہاں۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ میں اکیلی شفیق سے بات کروں گی۔ آپ جائیں اور اسے یہاں بھیج دیں۔“

شفیق کمرے میں داخل ہوا تو ماں نے چھونٹے ہی اس پر بھرپور جذباتی وار کر دیا۔ کہنے لگی۔ ”شفیق! اب اس گھر کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ چاہے بنا دے یا بگاڑ دے تو ہاں کر دے تو دونوں بھائی پھر سے مل بیٹھیں گے اور جو تو نے نہ کر دی تو خاندان میں ہمیشہ کے لیے پھوٹ پڑ جائے گی اور حیرا ابا اکیلا رہ جائے گا۔ تمنا۔“

شفیق نے کہا۔ ”اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بات کیا ہے؟“ ماں نے اسے ساری بات سنائی۔ ساتھ ہی کہنے لگی۔ ”دیکھو شفیق! تجھے اسارہ سے اچھی بیوی نہیں ملے گی۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔ بس اب ہماری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔“

ماں کی جذباتی اپیل سن کر شفیق نکلتی میں پڑ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کا بی چاہتا تھا کہ وہی کرے جو ماں باپ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد حیات کو ان کی خاطر قربان کر دے لیکن کچھ دیر کے بعد اس کے سامنے ایک خوف ناک مستقبل کا نقشہ کھینچ جاتا۔ ایک بے حس سرمایہ دار ابھرتا جس کا مقصد حیات صرف دولت اکٹھی کرنا تھا۔ وہ لرز جاتا اور اس کا فیصلہ پھر سے ڈگمگا جاتا۔

گھبرا کر وہ اپنے کمرے سے باہر لان میں نکل گیا۔ لان چاندنی سے بھرا ہوا تھا۔ مطلع صاف تھا لیکن اس رات وہ منظر کے حسن سے بے خبر تھا۔ رات دیر تک وہ لان میں بے تابانہ ٹھٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعاً وہ چونکا۔ رک گیا۔

اس کے سامنے وہ چادر میں لپی ہوئی کھڑی تھی۔

”تم تو کہتے تھے یہ فارم تمہاری جنت ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔ جنت ہی تو ہے۔“

”کیا جنت میں لوگ یونہی بے قرار رہتے ہیں جیسے کہ تم ہو؟“ وہ ہنسی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ایک گھنٹے سے اپنی کھڑکی سے تمہاری بے چین شکل کو دیکھ رہی تھی۔“ اسارہ نے کہا۔
پھر میں نے سوچا چلو پوچھوں تو۔“

”دیکھو اسارہ!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اس وقت میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔“
وہ ہنسی بولی۔ ”ہاں ایک طرف سبز پتا ہے۔ دوسری طرف پھول ہے۔ کتنی مشکل میں گرفتار ہو تم۔ ت ت ت۔“

”بات مذاق میں نہ ٹالو اسارہ۔“ وہ بولا۔ ”میری مدد کرو۔“
”بو بو۔ کیسے؟“

”کیا تم میرا جیون ساتھی بنو گی اسارہ؟“ اس نے پوچھا۔

اسارہ کی ہنسیاں تن گئیں۔ آنکھ میں پھلجھڑی چل گئی۔ زبان گال میں ٹھونس کر بولی۔
”اچھا تو پروپوز کر رہے ہو۔ اونٹوں۔ ہوں یوں نہیں دونوں پاؤں ملاؤں۔ گھنٹے زمین پر نیش دو۔۔۔ پھر ہاتھ اٹھاؤ اور کہو۔ ڈرانگ! کیا تم میرا جیون ساتھی بننا قبول کرو گی؟“ اس کا قہقہہ لالان میں گونجا۔

وہ پتھر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”یو آو امپاسی بل۔“

”ہاں۔“ وہ اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ ”یہی چیخ تو ہے امپاسی بل کو پاسی بل بننا ہے۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ذرا سی محنت درکار ہے۔ گھبرا نہیں فیکو۔ پھول تو زو گے تو کانٹا تو چبے گا۔“

وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ ٹھنلے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہتی رہی پھر قریب آ کر رک گئی۔ بولی۔ ”رفیقو! پتا اور پھول ایک ہی نہیں پر لگتے ہیں۔ مگر دونوں آپس میں کبھی نہیں ملتے۔ پھول کو پانا ہو تو پتا نہیں، بھنورا بنو۔“ یہ کہہ کر وہ خراباں خراباں ٹھنلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ کر اس کو روک لے لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔

اگلی صبح ان کا ملازم گھبرایا ہوا رفیق کے کمرے میں داخل ہوا۔ بولا۔ ”جی چھوٹے چودھری اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رات کو بستر میں نہیں سوئے۔“

رفیق یہ سن کر گھبرا گیا۔ بھاگا بھاگا شفیق کے کمرے میں گیا۔ وہاں کتابوں کے شلف پر ایک خط پڑا تھا۔ لکھا تھا۔

”پیارے اباجان!“

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا مقصد نیاٹ نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ چچا اور آپ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا باعث بنوں۔ اس لیے میں جا رہا ہوں۔ آپ چچا جان کو بتا دیجئے کہ مجھے آپ کی بات منظور نہ تھی۔ لہذا میں گھر چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔“

اعظم علی کو اس حادثہ کا پتہ چلا تو وہ ناراض ہو کر اسی روز شرواپس چلے گئے۔

رفیق نے بیٹے کو ڈھونڈنے کی دیوانہ وار کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہیں۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا اور اس جنت میں یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے جنت سے نکالے ہوئے ہوں۔

ایک سال گزر گیا۔

ایک روز جب رفیق چپ چاپ حسب دستور باہر دھوپ میں بیٹھا تھا تو ایک اجنبی داخل ہوا۔ چودھری کے قریب آ کر اس نے سلام کیا اور بولا۔ ”آپ رفیق علی چودھری ہیں کیا؟“
رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

نوار د بولا۔ ”میں کانڈیاں کے رکھ سے آیا ہوں۔ ہمارے صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔“

”مجھے بلایا ہے۔“ رفیق نے حیرت سے کہا۔

”جی۔“ وہ بولا۔ ”صاحب نے کہا تھا کہ چودھری صاحب کو ساتھ لے آئے۔ ان سے کہنا کہ آپ کا بیٹا بہت بیمار ہے۔“

”شفیق بیمار ہے۔“ چودھری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”وہ شفیق نہیں۔“ نوار د نے کہا۔ ”وہ تو ہمارا گارڈ اکبرا ہے۔ وہیں رکھ میں کام کرتا ہے۔“

رفیق اڑ سر نو گھبرا گیا۔ ”اکبرا۔“ وہ بولا۔

نوار د نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور چودھری کو تھمادی۔ بولا۔ ”صاحب نے کہا تھا۔ یہ تصویر دکھا دینا۔“

تصویر میں ایک پینڈو وردی پننے کھڑا تھا۔ منہ پر گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور سر کے بال یوں کھڑے تھے جیسے کانٹے ہوں۔

کانڈیاں کے رکھ میں پہنچ کر وہ شخص چودھری کو سیدھا صاحب کے پاس لے گیا۔

”آپ رفیق علی چودھری ہیں؟“ صاحب نے پوچھا۔

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شاہ کوٹ کے فارم سے آئے ہیں کیا؟“

”جی صاحب!“ وہ بولا۔

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ بیمار پڑا ہے۔ دس دن سے بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال

ہے کہ آپ کو ابھی اس سے نہیں ملنا چاہیے۔ آپ دو چار دن میرے پاس رہیں۔ پھر وہ صحت مند ہو جائے گا تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔“

”آپ کو میرا پتہ کیسے ملا؟“ چودھری نے پوچھا۔

”اس کے کمرے سے ایک پرانا لفافہ ملا تھا۔ اس پر آپ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ دراصل شروع

سے ہی ہم اکبر کے کوٹنگ و شب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب وہ گاڑی بھرتی ہونے کے لیے آیا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لیکن اس نے اپنے کوائف چھپائے رکھے۔ ہم نے تو اسے کلرک بنانے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ نہ مانا۔

”یہاں ہمارا گاڑی قادرا ہے۔ اس کی ایک نوجوان لڑکی ہے موی۔ وہ یہاں رکھ میں موی کے ساتھ صبح و شام گھوما کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے قادرا سے کہا کہ موی کو اپنے گاؤں میں بھیج دے ورنہ تیری بدنامی ہو جائے گی۔ بس جب سے وہ لڑکی گئی ہے اس روز سے یہ دنواڈول پھرتا رہا ہے۔ میں نے موی کو گاؤں سے بلوایا ہے تاکہ آپ اس کی زبانی ساری بات سن لیں۔“ وہ رک گیا۔

پھر بولا۔ ”ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کریں کہ آپ اس کے باپ ہیں بلکہ یہ کہیں انکواری کرنے کے لیے ہیڈ آفس سے آئے ہیں۔“

”میں اس وقت قادرا اپنی بیٹی موی کے ساتھ داخل ہوا۔“ بیٹھ جاؤ لڑکی۔“ صاحب بولا۔

قادرا تم چلو۔“ قادرا باہر نکل گیا لیکن موی جوں کی توں کھڑی رہی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ تلی دہلی لیکن بڑی شوخ۔ طبیعت میں جھجک نام کو نہ تھی۔

”بیٹھ جا۔“ صاحب نے کہا۔

”نہ۔“ وہ بولی۔ ”میں نہیں بیٹھتی۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

صاحب نے کہا۔ ”دیکھ یہ جو صاحب بیٹھے ہیں۔“ اس نے رفیق کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بڑے دفتر سے آئے ہیں۔ اکبرا گاڑی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے۔ تجھے اکبر کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، سچ بتا دے۔ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے سب کچھ۔“

پر موی بولی۔ ”صاحب جی! مجھے کیا پتہ کہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ بارہ چودہ مہینے ہوئے۔ وہ ادھر رکھ میں بیٹھا تھا۔ ماں جو ادھر سے گجری تو بولا۔ ادھر نیڑے نیڑے کوئی گاؤں ہے کہ۔

میں نے کہا۔ ادھر کوئی گاؤں نہیں۔ جنگل کے صاحب کا دیکھ رہے۔ بس وہ بولا۔ مجھے رات جاتی ہے۔ اس پر مجھے ترس آگیا۔ ماں دسے باپو کے پاس لے آئی۔ باپو نے کہا۔ اسے توڑی وائے جھونپڑے میں ڈال دے۔

اگلے روز باپو نے پچھارے تیرا آگے پیچھے کوئی ہے۔ وہ بولا۔ نہیں کوئی نہیں۔ پھر باپو نے پچھارے تو نوخیزی کرے گا۔ وہ بولا۔ کروں گا۔ اس پر باپو دسے آپ کے پاس لے آیا۔ ادھر ایک گاڑی کی جگہوں کھالی تھی۔ آپ نے دسے گاڑی رکھ لیا۔ چلو بات کھتم ہوئی۔ رہنے کو کوٹھی مل گئی۔

پر صاحب جی وہ اکبرا تو پاگل نکلا۔ ایک دم پاگل۔ دسے سچ پتے کپاگل پنا لگا تھا۔ مجھ سے بولا۔ موی مجھے ایسا پتا ڈھونڈ دے جو نہیں ماں جزیں گاڑ دے۔ ایسی جزیں گاڑ دے کہ وہ سوکھیں نہیں۔ سدا ہری رہیں چاہے برکھا ہو نہ ہو۔ پانی ملے نہ ملے اور یہی نہیں صاحب جی وہ چاہے تھا کہ ایسا سبز پتا جو تین پر پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے، جزیں گاڑا جائے، گاڑا جائے۔

لو صاحب جی یہ کوئی ڈھونڈ تھی کیا۔ یو تو شیدائی پنا تھا اور صاحب جی آپ سے جھوٹ کیوں بولیں۔ مجھے دن کے پاگل پن پر ترس آگیا۔ ماں رکھ کی دیوانی تو پہلے سے ہی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ مل کر پتا ڈھونڈن لگ گئی۔ آٹھ مہینے ہم دونوں صبح شام اندھیرے سویرے ہر وقت رکھ ماں دو پتا ڈھونڈتے پھرتے۔

جی بات یو ہے صاحب جی کہ پاگل پنا جو س کا تھا، وہ مجھے بھی لگ گیا۔ بس دن رات۔ رات دن ہر وقت ایک دھن سوار تھی۔

ویسے صاحب جی یو بات تو پہلے روح سے ہی جان گئی تھی کہ اکبرا ہم ماں سے نہیں۔ وہ دکھرا دکھرا دکھے تھا۔ دسکی باتیں دکھری دکھری تھیں۔ دسکی رہت بہت دکھری تھی۔ دس نے یہاں آکر منہ دھونا چھوڑ دیا۔ داڑھی بڑھائی۔ سر کے وال یوں کھڑے کر لے جیسے کانٹے ہوں۔ دس نے ہم سا بننے کے سارے جتن کیے پر وہ ہم سا نہ بن سکا۔ پر ایک بات ہے صاحب جی۔ وہ مجھ سے اتنا کھل مل گیا جیسے میرے ساتھ کھیل کھیل کر بڑا ہوا ہو۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے وہ میرا بچپن کا ساتھی ہو۔ جرا دکھرا نہ لگے تھا مجھے۔

صاحب جی ہم نے جھاڑیوں تلے گھس گھس کر وہ پتا ڈھونڈا۔ کانٹوں والی بیلوں میں

ڈھونڈا رکھ کے درختوں پر چڑھ کر ڈھونڈا۔
”پھر وہ تمہیں ملا بھی؟“ صاحب نے پوچھا۔

”مل گیا۔ صاحب جی مل گیا۔ پر وہ بوٹا نہ تھا۔ پتا نہ تھا۔ وہ اک ویل تھی جو ہمیں کے ساتھ ساتھ سنبولے کی طرحیوں ریگنے تھی اور پوٹے پوٹے پر ہمیں میں جڑھیں گاڑ دے تھی۔ وہ ویل ہم نے چار پانچ جگہوں پر لگا دی۔ چار جگہوں پر رکھ ماں اور پانچوں جگہ اکبرے کی کوٹھڑی سے باہر اور ماں نے دسے بتا دیا کہ جد توڑی اس ویل کی ڈنڈی پر اک پتی بھی نکلے رہے گی، ویل مرے گی نہیں۔

پھر صاحب جی میری ادوارہ گردی پر غصے ہو گیا۔ بولا۔ تو اس گاڑ کے ساتھ ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ گاؤں میں برادری والے باتیں کرنے لگے ہیں۔ یا تو تو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چھوڑ دے۔ نہیں تو ماں تجھے گاؤں بھیج دوں گا۔

میں نے باپو سے کہا۔ نہ باپو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا نہیں چھوڑوں گی۔ بے شک تو مجھے گاؤں بھیج دے۔

گھسے میں بلانے مجھے گاؤں بھیج دیا۔ پر جانے سے پہلے میں نے اکبرے سے کہہ دیا۔ میں نے کہا۔ اکبرے دیکھ پت جھڑ کے دن آرہے ہیں۔ گھبرا نہ جاؤ۔ بد توڑی اک پتی ویل پر لگی رہے گی، تہ تک جڑ نہیں سوکھے گی۔“

صاحب بولا۔ ”مومی! تجھے پتہ ہے اکبر تو اس دس روز سے چارپائی پر پڑا ہے۔ بیمار ہے۔ سوکھ کر کاٹنا ہو گیا ہے۔“

”ہے اللہ۔“ وہ چلائی۔ پھر بولی۔ ”نہیں نہیں۔ صاحب جی وے کوئی بیماری نہیں۔ بس دس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہو گا۔ ماں ابھی دیکھ کر آئی۔“ یہ کہہ کر وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی۔ ”میں نے کہا نہ تھا دس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہو گا اور وہ پتے کے غم میں سوکھ رہا ہو گا۔ میں نے جا کر دیکھا تو اکبرے کے کواٹر کی ویل سوکھی وی تھی۔ پھر ماں رکھ کو بھاگی۔ ادھر جا کر دیکھا تو چاروں جگہوں پر ویل ہری بھری تھی۔

پھر ماں اکبرے کے پاس گئی۔ میں نے کہا رے تو تو جیج پاگل ہے۔ غم لگانے سے پہلے رکھ ماں جا کر وہاں کی ویلیں تو دیکھ لی ہوتیں۔ وہ تو ہری بھری ہیں رے۔ ماں دیکھ آئی ہوں۔ چل تجھے دکھا دوں۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا بولا۔ سچی مچی ہری بھری ہیں۔

میں نے کہا ”اور کیا مان تجھے سے جھوٹ بولوں ہوں۔“ وہ تھکے مار کر ہنسی۔ پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ”رے تو کیوں آگیا میرے پیچھے پیچھے؟“

صاحب اور چودھری نے مڑ کر دیکھا۔

دروازے میں شفیق کھڑا تھا اس نے دیوار کا سارا لے رکھا تھا۔

”چل اب جا کر پڑ جا اپنی کھات پر۔“ مومی نے اسے ڈانٹا۔

لیکن وہ تو حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ان کسی“ میں شامل ان کی بیشتر کمائیاں لاشعور کے انسانی کردار پر اثرات کا مطالعہ کرتی ہیں۔ لاشعور کا مطالعہ صرف نفسیات کا ہی موضوع نہیں ہے بلکہ نفسیات سے قبل لاشعور کے انسانی کردار پر اثرات کا مطالعہ ادیب، شاعر اور فن کار کرتے آئے ہیں۔ خود فرائیڈ نے اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا تھا کہ لاشعور کی دریافت اس کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کی کارگزاریوں سے تخلیق کار صدیوں سے آگاہ رہے ہیں۔ اس نے تو بس لاشعور کے مظہر کو سائنسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ادب، لاشعور اور نفسیات کے روابط پر بات کرتے ہوئے ہمیں یہ ذہن نشین کرنا ہو گا کہ اگر کوئی لکھنے والا لفظ نفسیات کے دریافت شدہ حقائق کو ہی اپنی شاعری یا افسانے میں پیش کرتا ہے تو وہ چل سلا لکھنے والا ہے۔ ایک سچا لکھنے والا انسانی شخصیت اور کردار کے ان گوشوں کو نونے کی کوشش کرے گا جو ابھی تک نفسیات یا دیگر علوم کی دسترس سے باہر رہے ہیں۔ ان معنی میں سچا تخلیق کار سماجی و کرداری علوم کے ماہرین سے ایک قدم آگے ہی رہے گا۔ اس اصول پر پرکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی نے نفسیات کے نہ صرف دریافت شدہ حقائق کو افسانہ بنانے کی کوشش کی بلکہ اپنے طور پر کرداروں کی تحلیل سے انسانی نفسیات کے بارے میں نئی نگاہی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میں ذاتی طور پر ممتاز مفتی کے تقریباً تمام مطبوعہ افسانوں کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے ہاں صرف لاشعور کو جاننے کی سعی نہیں ہے بلکہ انہوں نے انسان پر ماحول کے اثرات کا مطالعہ بھی عرق ریزی سے کیا ہے اور اس معاملے میں وہ کسی سماجی حقیقت نگار سے کمزور نہیں پڑتے۔ ان کے افسانے ”غلط طوطا“ اور ”افسر“ اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں۔ اسی طرح انہوں نے بعض افسانوں میں مافوق الفطرت عناصر کو بھی استعمال کیا ہے جیسے ”نیل رگ“ ”الصدق“ اور ”کرن محل کا بھوت“ اور کم از کم ایک افسانے میں مزاحیہ اسلوب کو بے پناہ کامیابی سے برتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ”آپ بیتی“ میں برتے مزاحیہ اسلوب کو آگے بڑھاتے تو وہ اس سمت بھی بہت اچھے افسانے پیش کر سکتے تھے۔

ممتاز مفتی کی تخلیقی ذات بہت متحرک اور فعال رہی ہے۔ اس بات کا اندازہ ان کی متنوع تحریروں سے بھی لگایا جاسکتا ہے اور اس بات سے بھی کہ انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی فکر اور سوچ میں آنے والی تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ان کو بہت اچھے انداز میں اپنے افسانوں میں سمویا بھی ہے۔ اسلام آباد کی زندگی اور خاص طور پر جدید طرز زندگی کو موضوع بنانے والے ان کے افسانے اس سلسلے کی اچھی مثال ہیں۔ اس بات سے اختلاف کی گنجائش تو نہ ہونے کے برابر ہے کہ ان کا سب سے دلچسپ موضوع کرداروں کی تحلیل اور باطنی زندگی کا

ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری

افسانہ نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں ممتاز مفتی اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ 1936ء میں پہلی کمائی ”جھکی جھکی آنکھیں“ کی اشاعت سے ہی انہوں نے اس دور کی موجودہ افسانہ نگاری سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ترقی پسند تحریک جڑ پکڑ رہی تھی اور اس کے زیر اثر اردو ادب میں بھی مختلف سوالوں کو معاشی حوالے سے سمجھنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ افسانے میں پریم چند کی روایت پنپ رہی تھی اور سماجی حقیقت نگاری اپنے عروج کی طرف رواں دواں تھی۔ ایسے میں ایک ایسی آواز جو فرد کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کرے، اجنبی سی محسوس ہوتی ہے۔ جدید اردو نظم میں میراجی اور افسانے میں ممتاز مفتی نے فرائیڈ کے زیر اثر فرد کے باطن میں اترنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے ہاں فرائیڈ کے نظریات کو عموماً جنس کے آزاد اظہار کے مبلغ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو یقیناً فرائیڈ کی یک رخ تشریح ہے۔ فرائیڈ کا اصل مسئلہ انسانی ذہن کے اس حصے کا مطالعہ تھا جس پر انسان کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ اسے لاشعور کا نام دیا گیا۔ اب اس لاشعور میں بہت کچھ موجود ہے۔ یونگ نے تو اس سے انسانی تمدن کے صدیوں پر پھیلے اثرات بھی ڈھونڈ لیے۔ ابتدا میں یہی لاشعور ممتاز مفتی کو بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ خود انہوں نے اپنی پہلی کتاب ”ان کسی“ (مطبوعہ 1940ء) میں واضح انداز میں لکھا تھا۔

”اس مجموعے کی بیشتر کمائیوں میں نفس لاشعور کی کسی نہ کسی پہلو کے اظہار کی کوشش کی گئی ہے اور نفس لاشعور کا اظہار ہی میرے مصنف بننے کا جواز یا بہانہ ہے۔ یہ موضوع ایک بہت الجھا ہوا نکمچھا ہے۔ بہر حال اگر میں نفس لاشعور کے ابوالہول کے پراسرار تبسم کی جھلک نہیں دکھا سکا تو مجھے بھی تسکین ہے کہ میں نے اہم اور دقیق موضوع پر لکھنے کی جرات اور کوشش کی۔“

مطالعہ ہے اور اس کے لیے وہ سیدھے سادے بنیادی اسلوب کو اختیار کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے پہلے مجموعے میں ہی تشبیہی آہنگ کے افسانے جیسے ”اندھرا“ بھی موجود ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں ہندی دیومالا، ہندی ماحول اور ہندی آہنگ کو بھی اچھی طرح استعمال کیا ہے اور اپنے آخری مجموعے میں تو ان کا افسانہ ”چوہا“ بھی شامل ہے جو علامت نگاری کے اسلوب کی بہت اچھی مثال ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کی بنیاد کردار پر رکھی ہے۔ ان کے تمام افسانے کسی نہ کسی کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ بلکہ زیادہ درست تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عموماً تین اہم کردار ملتے ہیں اور سارا افسانہ ان کرداروں کے آپس کے تعلقات اور ان کرداروں کے ایک دوسرے پر اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ”جھکی جھکی آنکھیں“ عذرا، سلیم اور نذر کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے اس میں ماس پاپ اور طوطا ضمنی کردار ہیں۔ شادی کے بعد عذرا کے تصوراتی مرد اور حقیقی شوہر کے تضاد کا سامنا کر رہی ہے۔ حقیقت اور تصور کا ٹکراؤ افسانے میں اس کشمکش کو سامنے لاتا ہے جس پر اس افسانے کی بنیادیں استوار ہیں۔

”آپا“ ان کا بے مثال افسانہ ہے اور خود اپنے اس افسانے کے سحر میں ممتاز مفتی ایک عمر گرفتار رہے ہیں۔ ”آپا“ کے کردار کے بارے میں پہلا جملہ ہی قاری کو بہت کچھ بتاتا ہے لیکن جب رفتہ رفتہ آپا کے کردار کی گہرائیں کھلتی ہیں تو اردو فکشن کا ایک اہم کردار جنم لیتا ہے۔ افسانہ کا پہلا جملہ ہے:

”جب کبھی بیٹھے بیٹھے آپا کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے

چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔“

اسی طرح ایک اور جملے میں اپنے ایک کردار کو یوں پیش کیا گیا ہے کہ جملے ہوئے اہلوں میں آگ دہی ہوتی ہے، اوپر سے نہیں دھکتی۔ اس افسانہ میں بھی محبت کی تثلیث ابھرتی ہے۔ آپا تصدق جانی اور بابی، چوتھا کردار آپا کی چھوٹی بہن کا ہے جو افسانے میں بطور راوی کے موجود ہے۔ تصدق آپا اور بابی دونوں کے لیے کشش محسوس کرتا ہے۔ آخر میں وہ بابی سے منہ موڑ کر ”آپا“ کے پاس آجاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ممتاز مفتی کے ہاں یہ تثلیث بار بار ابھرتی ہے۔ ”بابی“ وہ افسانہ ہے جس کے کردار، ماحول آپا کی ہی فوٹو کاپی ہیں لیکن انجام مختلف ہو گیا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کے مسلسل مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں بعض کردار اور واقعات بہت دفعہ دہرائے گئے ہیں۔ ”آپا“ کے تینوں کردار کئی بار دوسرے افسانوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یا ”جھکی جھکی آنکھیں“ میں بننے والی محبت کی تثلیث کئی بار ابھرتی

ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ماحول جس میں یہ کردار ایک دوسرے سے Interact کر رہے ہیں، یکساں رہتا ہے۔ قصہ کی صورت حال کے اعتبار سے بعض جملے بھی بار بار دہرائے گئے ہیں۔ کردار، واقعات، ماحول اور جملوں کی کثرت سے دہرانے کے باعث قاری یکسانیت سے اکتانے بھی لگتا ہے۔ مثلاً پانو، نوکرانی کا کردار ہے جو چار پانچ بار آیا ہے اور ہریار گھر کا مرد اس کو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سکول کی استانی جو بالکل میم کی طرح ہے، کاموئیت بار بار آیا ہے اور جہاں بھی یہ آتا ہے، اس کے ساتھ یہ جملہ ضرور جڑا ہوا ہے۔

”ایسی ہی ہوتی ہیں یہ سکول والیاں۔“

اسی طرح شادی شدہ عورت کا غیر شادی شدہ اور خود سے کم عمر مرد کے لیے کشش محسوس کرنے کا موئیت بھی متعدد بار دہرایا گیا ہے۔ ہر تخلیق کار کسی کردار، واقعہ یا صورت حال کے لیے کشش محسوس کرتا ہے اور ان کا ایک سے زیادہ بار افسانوں میں در آنا کوئی عیب نہیں لیکن جس کثرت سے یہ تکرار ممتاز مفتی کے ہاں ہے، وہ یقیناً ایک عیب ہے اور پھر ہر بار پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر اس موضوع اور کرداروں کا حامل افسانہ بہتر تھا، تخلیق کار کی یہ ایسی خالی ہے جس سے گریز لازمی ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں کرداروں کی تحلیل اور ان کے باطن میں جھانکنے اور ان پر لاشعور اور ماحول کے اثرات کا مطالعہ کے بارے میں بات ہو چکی ہے۔ اب ذرا دیکھیں کہ بذاتہ ممتاز مفتی کے کردار ہیں کیہ۔ نوخیز لڑکیاں، جوانی کی حدوں میں قدم رکھتے لڑکے، پختہ عمر کی عورتیں اور مرد۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ان کے کردار اپنی دیگر شناخت بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو ان کے ہاں کرداروں کا پروٹو ٹائپ ملتا ہے جو بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ مرد اور نسوانی کرداروں کے تحلیل میں ایک بات سامنے آتی ہے کہ ان کے نسوانی کردار جاندار اور فعال ہیں۔ ان کے مقابلے میں مردہ کردار دبے دبے محسوس ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں جو عورت ظاہر ہوتی ہے، وہ چلتی ہے۔ خولند کے دوستوں کو دیکھ کر اس کی آواز میں لوج پیدا ہو جاتا ہے۔ چال میں لچک آجاتی ہے۔ مرد حامد غنی اور تنگ نظر ہیں۔ آگ میں جلتے ممتاز مفتی کے کرداروں میں سوچتا ہوا ذہن نہیں بلکہ دھڑکتا ہوا دل نظر آتا ہے۔ ان کے کرداروں کی باطنی کائنات دل سے عبارت ہے۔ اس میں وہ منطقی اور خارجی معروضیت سے آزاد ہیں۔ مفتی کے کردار اپنے ماحول کو نظر انداز کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات اور افعال کی عقلی توجیہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس حوالے سے ممتاز مفتی ہمیں ایسا فن کار نظر آتا ہے جو انسانی زندگی پر عقل کی برتری کو رد کرتا ہے۔ انسانی افعال میں منطقی ربط تلاش کرنے کی

بجائے جذبے کی فسوں کاری کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔

نسوانی کردار تراشے ہوئے ممتاز مفتی عورت کے بارے میں سٹرو ٹائپ سے بہت کم جان چھڑ پاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی میں عورت کا منفی نقش ان کے ذہن میں کندہ ہوا ہے۔ عورت کی یہ تصویر کچھ ان کے افسانوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ ان کے ناول ”علی پور کا ایللی“ میں بھی ایک جاندار مگر اپنی ذات کی اسیر عورت بار بار مختلف ناموں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی ایسے فنکاروں میں شامل ہوتے ہیں جن کا نقش ان کے سوانح میں بری طرح پیوست ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں عموماً اور ناول میں خصوصاً آپ بیتی کا آہنگ جا بجا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اشارہ کیا تھا کہ ممتاز مفتی کے افسانوں میں عورت اور مرد کے رشتے کو دریافت کرنے کی سہی بار بار نظر آتی ہے۔ جہاں جہاں وہ خود کو دہرانے سے بچا سکے ہیں، وہاں انہوں نے اس تعلق کی نئی جہت دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

”سو پور کی کھڑکی“ میں میاں اور بیوی رات کو چھپ چھپ کر عاشق اور معشوق کی طرح ملتے ہیں اور انہیں دنیا کی پروا نہیں۔ ”شپ“ کی جیناں بھی ایسا ہی کردار ہے۔ لوگوں کی باتیں اس کے جذبیت کو بھی ابھارتی ہیں۔ وہ قاسم سے طلاق لینے اور مومن سے شادی کرنے کے بعد بھی اپنے گھر کی کھڑکی قاسم کے لیے کھلی رکھتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ قاسم ضرور آئے گا۔ ”پل“ میں شادی شدہ برجیس اور اقبال اپنے پڑوس میں نئے شادی شدہ جوڑے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میاں ”پل“ علامتی معنوں میں انسان کے لاشعور اور شعور کو جوڑنے کے حوالے سے بھی معنی خیز ہے۔ اس میں جسم اور روح کی کشمکش بھی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ ”جسم کا جال روح کو کیا پھنسائے گا“ یعنی ایک سطح پر جسم اور روح کے درمیان کسی پل کی ضرورت کی طرف اشارہ ہے۔ ”میاں کی مرضی“ میں عورت کی چال بازی ہے کہ وہ کیسے اپنے خاوند کو اپنے دھرے پر لاتی ہے۔ ”دودھیا سویرا“ ایک ایسی ہی دلچسپ کہانی ہے کہ اس میں چار افراد ایک عورت کی محبت میں گرفتار ہیں اور یہ عورت ان چاروں کے لیے الگ الگ معنویت کی حامل ہے۔ ”نفرت“ نسوانی کردار کی قلب مابیت کی روداد ہے جو ایک ”جنگلی مرد“ کو دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد ہوتی ہے۔ بظاہر ”نازی“ ”جانگی“ سے نفرت اور بے زاری کا اظہار کرتی ہے لیکن دراصل اس جانگی کی باتیں اس کی قلب مابیت کر دیتی ہے۔ شریف، نفاست پسند اور بااخلاق، خوش پوش مرد کی جگہ وحشی و بھقان لاشعوری خواہشات کے اعتبار سے ”بد معاش“ کی دل آرا پر حاوی ہے۔ اسی طرح اس کوسچے کی عورت ایذا دینے والے کو پسند کرتی ہے۔ ”گڑیا گھر“

میں ایک مضبوط اور بارعب مرد ڈرائیور کی شکل میں ملتا ہے۔ ”آراء اور اسرار میں“ میں باپ اپنی بیٹی کو مکمل روپ میں دیکھنا چاہتا ہے اور آخر میں عیسائی ہو جاتا ہے۔ ”سبز کھلے کا خاوند“ اور ”موقعہ“ کے کردار سوسائٹی کی عام اخلاقی روش سے بٹے ہوئے ہیں۔

عورت اور مرد کے مابین مختلف النوع کے تعلقات کو اپنا موضوع بنانے کے علاوہ ممتاز مفتی کے ہاں انسانی کرداروں کی دوسری جہات بھی موجود ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں دو افسانے ”بیگانگی“ اور ”خطوط“ بھی شامل ہیں جن کے مرکزی کردار بچے ہیں۔ ”بیگانگی“ میں رشید کے کردار کی نشوونما کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کسی بچے کو جب اس کے والدین بد صورتی کی بنا پر دھتکار رہے ہیں تو اس کا کردار کس طرح صخ ہوتا ہے، اس کا بہت اچھا مطالعہ رشید کے کردار میں کیا گیا ہے۔ نظر انداز کیا جانے والا بچہ اپنے اندر رقابت، حسد، جارحیت اور شرارت کے عناصر کو کیسے پروان چڑھاتا ہے؟ بچے کے کردار کے مطالعے کے ضمن میں یہ بہت اچھی کہانی ہے۔ ”خطوط“ میں بھی مرکزی کردار بچے کا ہے لیکن یہاں اہم بات یہ ہے کہ بیٹوں کی دنیا میں بچے کیسے سیکھتے ہیں اور اس سارے عمل سے دنیا کے بارے میں ان کے تصورات کیسے تغیر ہوتے ہیں، اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ یقیناً اردو کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ بچوں کے کردار اور ان کے جذباتی اور جسمانی احساسات کی تفہیم کو انتظار حسین اور بعض دیگر افسانہ نگاروں نے بھی اپنا موضوع بنایا ہے لیکن ان کا نمبر ممتاز مفتی کے بعد کا ہے۔

افسانوں میں ”تمثیلی آہنگ“ کے استعمال کے بارے میں اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا افسانہ ”اندھیرا“ ہے جس میں ”روغنی پتلے“ کے حوالے سے انسانی زندگی کے دو اہم پہلوؤں پر بات ہے۔ ایک یہ کہ ہمیں کس نے اور کیوں پیدا کیا ہے، دوسرا عورت کی موجودگی مرد کے کردار میں کیا تغیر پیدا کرتی ہے۔ مردانہ ٹوپیوں کی دکان میں رکھے ہوئے یہ پتلے اپنی شناخت سر پر رکھی ٹوپی سے کرواتے ہیں۔ ٹوپی کی مناسبت ہی سے پتلوں کے کردار متعین کیے گئے ہیں۔ یہ پتلے آپس میں فکری مسائل پر باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی یہ ان چند افسانوں میں سے ایک ہے جس میں افسانہ نگار نے جذبے کی بجائے عقل کے حوالے سے بات کی ہے لیکن ”روغنی پتلے“ کا فکری بحث کرنا کہیں اس طرف تو اشارہ نہیں کہ جذبہ ہی انسان کے ہونے کی دلیل ہے اور اگر انسان جذبے کی بجائے عقل کی آنکھ سے دنیا کو دیکھنے لگے تو وہ ”روغنی پتلے“ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یوں یہ افسانہ تمثیل کی سطح سے اٹھ کر علامت کی سطح کو چھونے لگتا ہے۔ رات کی تاریکی ان پتلوں کے لیے دن کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ آپس میں جتاولہ خیال کرتے ہیں۔ زندگی کے رموز و اسرار سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان میں ایک عورت کا پتلا شامل ہوتا ہے تو رد عمل کچھ یوں ہے:

”ناری۔ ناری کون ہے؟“ ٹائٹ کیپ والے نے پوچھا۔ پھر اس کی نگاہ عورت کے پتلے پر جا پڑی۔ ”ارے میرے اللہ۔ تم کون ہو؟“ وہ بھاگ کر آگے بڑھا۔ ”افو۔ میں سمجھا۔ اب میں سمجھا تم زندگی کا بھید ہو۔“ وہ عورت کے سامنے جھک گیا۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں بھی زندگی اور انسانی زندگی کی بات ہے، جذبہ اثر دکھاتا ہے اور ایسے ہر مقام پر ممتاز مفتی کے ہاں مرد کردار عورت کے آگے جھکا نظر آتا ہے۔ ”روغنی پتلے“ کے عنوان کے افسانے میں انہوں نے اس تمثیل کو ایک بار پھر سے استعمال کیا ہے۔ اب ٹیپوں کی دکان کی جگہ شہر کا ”ایٹ شاپنگ سنٹر“ لے لیتا ہے۔ یہاں وہ ہمیشہ جدید طرز زندگی اور اس میں عورت کے کردار پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آخر میں جب پورے ملک کے لوگ ”روغنی پتلے“ میں ڈھل جاتے ہیں تو اس افسانے کا افق پھیل جاتا ہے اور اس کی تشریح ہم ایک سے زیادہ سطحوں پر کر سکتے ہیں۔

”گلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طہراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی نیچے کو انگلی لگائے چادر میں لپی ہوئی خاتون نیچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس سے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استاد تھا۔“

”ساڑھی والی لمبا چنڈہ لٹکائے نگاہیں جھکائے جا رہی تھی۔“

”سی تھری چیٹ کا گھگھراپنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔“

”سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا لوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔“

اپنے پہلے افسانوی مجموعے ”ان کمی“ ہی سے ممتاز مفتی نے انسانی زندگی میں مافوق الفطرت واقعات کے وجود کا اقرار کرنا شروع کیا تھا۔ ”کرن محل کا بھوت“ میں ایک نوخیز نوجوان اپنے گاؤں کے پاس اجڑے محل کی کھڑکی میں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھتا ہے جو اسے آوازیں دے کر اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ آخر میں محل کا چوکیدار ”کرن“ کو محل کا بھوت قرار دیتا ہے اور کرن کو سارا محل خود پر ہنسا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ”الصدف“ میں یہ محل ایک بار پھر ظاہر ہوتا ہے۔ ”میں“ اپنے دوست اسد کے خط کے جواب میں جلد از جلد واپس گھر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اپنی بیوی ”بیگم“ کے بارے میں جان سکے کہ وہ اس سے سچی محبت کرتی ہے یا نہیں لیکن راستے میں رات پڑ جاتی ہے تو ایک بوڑھے کی رہنمائی میں وہ ایک قلعہ نما مکان میں چلا جاتا ہے۔ جہاں ایک تمثیل دکھائی گئی ہے جس میں ایک عورت اپنے خلود سے چھپ کر اپنے محبوب

سے ملتی ہے۔ تمثیل ختم ہوتی ہے تو وہی بوڑھا اسے محل سے باہر لے آتا ہے اور جب وہ بوڑھا بھوت کہہ کر غائب ہو جاتا ہے تو نہ وہاں محل ہے نہ کوئی شخص۔ بس ایک ویرانہ ہے۔ یہاں ہمیں داستانوں کی جھلک نظر آتی ہے جہاں طلسم کے ٹوٹنے کے بعد خوب صورت محل اور باغ کی جگہ بس ویرانہ رہ جاتا ہے اور آخر میں افسانہ ایک خوب صورت موڑ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قریبی قصبے کا ایک فرد چلتا ہے کہ مکان کا مالک نواب اور اس کا خاندان بجلی کو بند کرنے سے مر گئے۔ ”جہاں ہو گیا۔“ میں نے دہرایا۔

”ہاں۔ جب سے یہ محل نما مکان ویران پڑا ہے۔“

”صاحب ساری رات نہ جانے کیا کیا چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ کبھی کوئی آزاد آزاد چیختا ہے۔ کبھی بیگم اور کبھی قیدیوں کو آزاد کر دو۔“ میرا بولا۔

یہاں ”بیگم“ اور ”آزاد کر دو“ افسانے میں دو ہماری معنویت پیدا کر دیتے ہیں اور اس کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں ممتاز مفتی پر لاشعور کی چھاپ کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ”نیلی رگ“ میں ایک عورت کی زندگی پر بازو کی رگ کے ابھرنے اور مٹنے کے خیال کو افسانے میں ڈھالا گیا ہے جو اس عورت سے وابستہ مردوں کی قسمت کا فیصلہ وقت سے پہلے سناتی ہے۔

عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو ممتاز مفتی نے عمومی جذبے سے ہٹ کر بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ”لیڈی ڈاکٹر“ میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ ہاتھ نہ آنے والی چیز کی خواہش میں تڑپتا رہتا ہے۔ ”محلہ“ کی چابی اپنی حکمت عملی سے اپنی بیٹی کی شادی منظور سے کرواتی ہے۔ اگرچہ یہ منظور کی دوسری شادی ہے لیکن یوں وہ اپنی باری ہوئی جنگ جیت لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ”وہ ہاتھ“ میں ایک آرٹسٹ صرف ہاتھوں کے عشق میں گرفتار ہو کر سرگرداں پھرتا ہے۔ ”ماں“ وہ واحد افسانہ ہے جہاں ہمیں ممتاز مفتی کے ہاں عورت حیوانی سطح سے اٹھ کر ایک بلند سطح پر دکھائی دیتی ہے۔ مادہانہ جذبہ عورت کے کردار پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے، اس کا مطالعہ ”ماں“ میں کیا گیا ہے۔ ”ممتا کا بھید“ میں اس موضوع کو ذرا وسیع پس منظر میں بیان کیا گیا ہے کہ عورت ماں بن کر تمثیل پاتی ہے اور ناری کے درجے سے آگے نکل جاتی ہے۔

”سے کا بندھن“ میں ممتاز مفتی نے عورت کی بنیادی فطرت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے کہ اس کا کام دیکھنا ہے، دکھنا ہے اور اس کے لیے وہ طوائف کے کونٹے کو اسٹیج کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہی موضوع بعد میں ”دھن دھن“ میں تمثیلی آہنگ میں ظاہر ہوا ہے اپنی تقریباً ساٹھ سالہ افسانہ نگاری کی زندگی میں ممتاز مفتی نے عورت اور مرد کے

تعلقات کے علاوہ سماجی موضوعات پر بھی افسانے تحریر کیے ہیں۔ ”افسر“ میں انہوں نے عمدے میں تبدیلی کے مرد کی شخصیت پر اثرات کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ بہت جاندار افسانہ ہے۔ ”عسل آفتابی“ میں بے لبادہ دھوپ میں لینے کا عمل ”میں“ کے باطن میں بھی تبدیلی پیدا کرنے لگتا ہے۔ ”مورا“ میں مولوی صاحب اپنے ماحول کے زیر اثر اس راہ پر چل پڑتے ہیں جس سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ یہاں جذبہ انسان کے تصورات پر فتح پاتا ہے۔ ”دور اہا“ ایک تمثیلی کہانی ہے جس میں ”پریم نگر“ اور ”عقل پور“ جانے والے مسافر بار بار بھول کر اس نگر جا ٹکٹے ہیں جہاں کے لیے وہ گاڑی میں سوار نہیں ہوئے۔ ”لکھ پتی“ اس کھیل کا بیان ہے جو دولت انسان کے ساتھ کھیلتی ہے۔ ”چار گوٹ“ میں علامتی انداز میں دنیا کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ ”چٹ گاڑی“ ہوکتا موٹر اور موسم بیتی“ میں مزدور طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کہانی میں مزدوروں کی محرومیوں اور ان کی بے بسی کو اچھی طرح گرفت میں لیا گیا ہے۔ ”گھوڑ اندھیرا“ فسادات کے پس منظر میں رونما ہونے والے انسانی ایسے کا بیان ہے۔ جدید زندگی اور اس کے انسانوں پر اثرات کے بیان پر ”ایلیز“ ”بلیک پاٹ“ اور ”آدھے چرے“ بہت کامیاب کہانیاں ہیں۔

ہنت کے اعتبار سے مفتی کے افسانے زیادہ تر سیدھے خط پر سفر کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کی تخلیقی ذات پر سوانحی واقعات کا اثر ہے۔ زمان و مکان کے اعتبار سے ان کے ہاں حرکت بہت کم ہے۔ اکثر پورے افسانے میں مکان ساکن رہتا ہے اور زبان میں معمولی تغیر ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زبان موضوع کی مناسبت سے استعمال کی ہے۔ جہاں جدید زندگی کا بیان ہے وہاں انگریزی کے لفظ بلکہ پورے پورے جملے آئے ہیں۔ جو کہانی جس ثقافتی آہنگ میں ہے اس کی زبان بھی اسی مناسبت سے ہے۔ اپنے زیادہ تر افسانوں میں ایک دائرے میں رہنے کے باوجود ان کے ہاں بہت کامیاب اور بھرپور افسانے ملتے ہیں۔ افسانوی مجموعوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مجھے ان کا پہلا مجموعہ ”ان کسی“ سب سے زیادہ جاندار نظر آتا ہے۔ ان کے بعد کے مجموعوں میں کامیاب افسانوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ جو تنوع پہلے مجموعے میں ہے وہ تقریباً ان کی ساری تخلیقی زندگی کا احاطہ کرتا ہے لیکن ایک بات کا احساس ہمیں ان کے آخری مجموعے تک ہوتا ہے کہ وہ نئے اثرات قبول کرنے کے لیے زندگی کے آخری سانس تک تیار تھے اور اس معاملے میں اردو کا شاید ہی کوئی اور افسانہ نگار ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔